ISSN : 2394-5567
S.No. 21
جلد:۸، شمارہ : ۱-۴
جنوری-دسمبر : ۲۰۲۱ء

دبیر

مدیر
احمد نوید یاسر ازلان حیدر

DABEER
January-December 2021
S .No. 21

ISSN : 2394-5567
S.No. 21
Vol. : 8, Issue : 1 - 4
January - December : 2021

DABEER

Editor:-
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

ISSN:- 2394-5567 S.No. 21

بـخـوانـدم یکی مرد هندی دبیر سـخن گوی و گوینده و یادگیر (فردوسیؒ)

دبیر

(بین الاقوامی پیئر ریویوڈ ریفیر یڈ سہ ماہی ادبی و تحقیقی جریدہ)

جلد۔۸ شمارہ۔۱ - ۴

جنوری۔دسمبر ۲۰۲۱ء

☆ایـڈیـٹـر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی، دہلی

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی، علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی، لکھنؤ

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، بھوپال

پروفیسر مظہر آصف، نئی دہلی

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، صدر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر علیم اشرف خان، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر سید محمد اصغر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل، شعبہ فارسی، دانشگاہ ھندوی، بنارس

ڈاکٹر محمد احتشام الدین، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر افتخار احمد، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ

ڈاکٹر محمد قمر عالم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر انجمن بانو صدیقی، شعبہ فارسی، کرامت کالج، لکھنؤ

☆معاون مدیر☆

ڈاکٹر محمد توصیف خان کاکر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عاطفہ جمال

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
	اداریہ	ازلان حیدر	۵
۱	اقبال کے کلام میں ''دیدہ'' کی اشتراکیت وتراکیب	پروفیسر طاہرہ وحید عباسی	۶
۲	درگاہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری (احمد آباد) کے جرنل کا اشاریہ	پروفیسر وجیہ الدین	۱۳
۳	انیسویں صدی میں فارسی ادب: ایک اجمالی جائزہ	ڈاکٹر محمد احتشام الدین	۲۵
۴	عورت: فروغ زمان فرخزاد کی شاعری میں	ڈاکٹر واحد احمد شیخ	۳۷
۵	حسنات العارفین کا خصوصی مطالعہ	محمد سعد ظفر	۴۶
۶	میر غلام رسول نازکی بحیثیت فارسی شاعر	ڈاکٹر محمد یاسین کمبے	۷۰
۷	نعت محمدی ﷺ: (ضیاء الدین برنی)	ڈاکٹر احمد حسن ندوی	۷۷
۸	امام خمینی کے اشعار میں سیاسی پیشن گوئیاں	یاور عباس میر	۸۲
۹	غنی کشمیری کی رباعیات	شازیہ بانو	۸۸
۱۰	کشمیری تہذیب کے سیر وسلوک کی ارتقاء میں حبّی کا کردار	تنویر حسین ڈار	۹۵
	شخصیات		
	فارسی کے اساتذہ سیریز۔۵		
۱۲	پروفیسر عطا کاکوی: ۔اس چمن کی تھی آبروان سے	پروفیسر رضوان اللہ آروی	۱۰۵
۱۳	پروفیسر امیر حسین عابدی: ۔حیات وخدمات	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	۱۳۲
	دکنیات		
۱۴	تاریخ دکن کے چند منظوم مآخذ	احمد نوید یاسر ازلان حیدر	۱۴۹
۱۵	قطب شاہی سلطنت کا ایک تاریخ نویس: مرزا نظام الدین صاعدی	ڈاکٹر حنا اسحٰق	۱۵۲
	میراث خطی		
۱۶	مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ مصطفیٰ خان شیفتہ کی تصانیف کے خطی نسخہ	ڈاکٹر محمد قمر عالم	۱۵۸
	چشم بینش		
۱۷	مولانا اسلم جیراجپوری کی گرانمایہ تصنیف ''حیات حافظ''	پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی	۱۶۵

English Artilces

1	Cultural Significance of Assamese Muslims and their Zikir and Zari: A Literary Review	Dr. Tafiquar Rahman	3
2	Hazrat Ameer Khusro Dehlavi and his contributions to Hindavi Literature	Dr. Zeenat Kaifee	8
3	Contribution of Anwar Shah Kashmiri to perception and dissemination of Hadith Literature	Mr. Abdullah Mulla	22
4	Babur, The first Mughal Emperor: A case study of early Invasions	Sabistan Bano	30
5	Persian Poets of early Mughal Period	Abdul Rahman Ansari	41
6	Brief History of Nawab Sultan Jahan Begum and Aligarh	Tarique Jameel Ansari	48
7	Resemblence of Anecdots and Admonitions in Panchatantra and Mathnavi of Maulana Jalal ud din Rumi	Sunita Kumari	52

اداریہ

علم کو اللہ رب العزت نے وہ فضیلت بخشی ہے اور اعزاز عطا کیا ہے کہ اس کے بغیر انسان کی شناخت ہی ممکن نہیں مگر اس کے لئے بھی ایک شئے لازم کر دی گئی یعنی ادب۔ ادب ایک ایسی شئے ہے جو دو عالموں میں سے ایک کو شیطان اور دوسرے کو فرشتہ بنانے کا ہنر رکھتی ہے۔ دین مبین کا بنیادی مقصد علم کا حصول اور تبلیغ علم ہے جس مذہب کی شروعات ''اقراء'' سے ہوئی ہو وہاں آج عالم ہی دوسرا ہو چکا ہے۔ جو غیر تعلیم یافتہ ہیں ان کا ذکر ہی کیا تعلیم یافتہ طبقہ متعدد فرقوں، گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم ہو چکا ہے اور ان کے علم کا معیار اور ان کی معراج فقط اپنے فرقہ، گروہ، مسلک یا جماعت کی اشاعت ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم آہنگی کا عنصر تو جیسے معیوب سمجھا جانے لگا ہے ،کوئی ایسا انسان نہیں جو خطا سے خالی ہو چاہے وہ جس بھی طبقہ کا ہو لیکن اگر جیسے ہی کسی عالم سے نادانستہ طور پر بھی کوئی خطا ہو جائے جس کا تعلق مذہبی ہے بھی یا نہیں اسے جانے بغیر یہ مسلکی نظام کو چلانے والے ٹھیکیدار اس پر لعن طعن کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے بعد یہ باتیں اجتماع میں بھی ذکر کی جاتی ہیں اور پھر وہ طبقہ جس کی سمجھ مسائل میں کچھ بھی نہیں وہ بھی اپنے اپنے طریقوں سے احتجاج کرنے لگ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو ہی نہیں مذہب کو بھی رسوا کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ ابھی چند دنوں قبل ہمارے ملک میں ایک المیہ یہ ہوا کہ ایک کالج نے مسلم لڑکی کو باحجاب کلاس میں جانے کی اجازت نہ دی۔ اس واقعہ پر غم و غصہ اور احتجاج اس پیمانہ پر پہنچا کہ معاملہ کورٹ تک پہنچ گیا۔ اب کورٹ کا جو بھی فیصلہ ہو وہ اپنی جگہ لیکن ہمارے غور کی بات یہ ہے کہ آیا ایک جمہوری نظام مذہبی معاملات میں دخل اندازی کر سکتا ہے؟ اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ کیا تمام ہندوستان کے مسلمان اس واقعہ سے پریشان ہیں اور اپنا احتجاج درج کرا رہے ہیں۔ میڈیا ایسے لوگوں کو ٹیلیویژن کی زینت بناتا ہے اور مناظرہ کرواتا ہے جو اسلامی پیرایہ میں خود مقید محسوس کرتے ہیں اور اس کے بعد بڑے غرور کے ساتھ بولتے ہیں کہ اصل میں یہ اس اسلام کے ابتدائی زمانہ کی باتیں اور پردہ یا حجاب کا مطلب یہ نہیں یا ایسا نہیں۔ بہرحال ہمیں غور اس بات کرنا چاہئے کہ یہ جو ٹی وی پر بیٹھنے والے لوگ کیا ہمارے رہنما ہیں؟ اگر ہم انہیں رہنما مان لیں گے اور پوری وجود کے ساتھ اکٹھے نہ ہونگے پھر چاہے فرقہ یا مسلک کوئی بھی ہو تو آج حجاب پر بات آئی ہے، کل ٹوپی، داڑھی، پہناوا، کھان پان سب پر روک لگا دی جائے گی۔ اعمال کے سدھار، محبت، ہم آہنگی، ملاپ اور فرقہ واریت کی قید سے آزاد ہو کر صرف مسلمان ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

ازلان حیدر

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی
صدر شعبۂ فارسی
برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

اقبال کے کلام میں 'دیدہ' کی اشتراکیت وتراکیب

شمع کی طرح جیئں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

علامہ اقبال کی شخصیت اور انکی ادبی کاوشوں پر بے شمار اور بیش بہا تحریریں اور مقالات لکھے جا چکے ہیں اور آئندہ بھی لکھے جاتے رہینگے کیونکہ ایک مفکر، فلسفی، ہمدرد قوم اور خودی کے پیکر انسان کا ہر نکتہ اپنے اندر ایک معنی کا سمندر سموئے رہتا ہے جسکے رموز ونکات تک رسائی ایک دشوار کن مسئلہ ہے اور بطور خاص علم کی کم مائیگی کا احساس اسکو اور مشکل کر دیتا ہے بہر حال ایک ادنی سی کاوش اقبال کی شاعری میں ''دیدہ'' کی تراکیب اور اصطلاحات کو زیر نظر رکھ کر کی گئی ہے۔

علامہ اقبال اپنے وقت کے ایک حوصلہ منداور مجاہد شاعر تھے انکی فکر کی گہرائی و گیرائی بے کنار تھی۔ اقبال نے اپنی تمام زندگی قوم کی دل بستگی اور بیداری کے لئے وقف کر دی تھی انکا دائرہ کار بہت وسیع اور انداز بیاں مختلف النوع تھا اپنے خیالات اور احساسات کو جو لفظی پیکر میں ڈھالا ہے وہ بھی بے نظیر ہے انہیں خیالات کو انھوں نے اشعار کے قالب میں ایک ہی لفظ کو جداگانہ انداز و معنی میں بیان کیا ہے جو انکو علم کا بحر ذخار ہونے کی برہان ہے۔

اقبال نے اپنے کلام میں چشم، نظر، دیدہ اور دید جیسے الفاظ بطور اصطلاح کے استعمال کئے ہیں۔ جنھیں انہوں نے عشق کے عشوہ طرازیوں کے باب میں استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ ان کے نظام فکر میں 'انا' کا استحکام عشق سے ہوتا ہے جو عشق کے انسان کی خودی کو خدا کا راستہ بتاتا ہے۔ لفظوں کی ترتیب سے جن کی تعداد کم از کم پانچ سو ہے۔ اقبال نے اپنے کلام کو شان وشوکت کے ساتھ مزین کیا ہے۔ قدرت کمال حقیقت میں ان کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشہ کو فلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے۔ جو ہر شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور غالب کی طرح اشکال لفظی میں دقت معنی نہیں ہوئی۔

اقبال اپنی ترکیبوں میں الفاظ کو جوڑ کر ذہنی اور جزباتی کیفیات کو مربوط کر کے ایک وحدت بنا دیتے ہیں۔ اور وہ ان اشارات سے قاری کے ذہن میں وہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو شاعر کے ذہنی کیفیت سے قریب تر ہو جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک لفظ ہے 'دیدہ' جس سے وضع کی گئی تراکیب اس مضمون کا موضوع ہے اور اس سے ترتیب دیئے گئے اشعار ذیل میں شامل کئے جارہے ہیں۔

دیدہ: مندرجہ ذیل شعر میں علامہ اقبال نے دیدہ کی یہ خاصیت بتائی ہے کہ غصّہ و ہیجان کی شدت میں آنکھ سے ایسی چنگاری نکلتی ہے کہ جس سے لوہا بھی پگھل جائے اور وہی آنکھ اگر خالق حقیقی کے سامنے خوف الہیٰ کے سبب حالت نماز میں ہو تو نرمی اتنی کہ مسلسل اس سے پانی کی دھار (آنسوؤں کی شکل میں) نکلتی ہے۔ یہاں پر انھوں نے دو مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔

☆ وقت هیجا تیغ او آهن گداز دیدۂ او اشکبار اندر نماز

☆ شیونش ازجان تو سرمایه برد لطف از دیده ہمسایه برد

اس شعر میں علامہ اقبال نے دیدہ کو ظرف بمعنی) آنکھ (استعمال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس کی آہ و بکا، چیخ و پکار و فریاد تمھارے عزیز ترین سرمایہ کو ختم کردے گی اس کے ساتھ ساتھ ہمسایوں کی آنکھوں سے نیند کے لطف کو بھی ختم کردے گی۔

ازچمن زارعجم گل چیدۂ نوبہار هندو ایران دیدۂ

اس شعر میں شاعر موصوف کہتے ہیں کہ عجم کے چمن زار ول سے تو نے پھولوں کو چن لیا ہے نیز ھندو ایران کی نئی بہاروں کو دیکھا ہے۔

دیدہ امکاں:

ای سوار اشہب دوراں بیا ای فروغ دیدۂ امکاں به بیں

علامہ اقبال نے اس شعر میں دیدۂ امکاں بمعنی ذات پروردگار استعمال کیا ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ اے اشہب دوراں (زمانے کے گھوڑے) پر سوار آکر دیدۂ امکاں کو فروغ دینے والے کو دیکھو۔

(۱) **دیدہ خفّاش**:۔ مراد وہ آنکھ ہے جسے خفاش (چمگادر) کی طرح آنکھیں ہونے پر بھی آفتاب کی روشنی نظر نہیں آتی۔ یعنی وہ آنکھ جس سے کائنات کے سرے حقائق مخفی ہے۔

☆ ہاں! نمایاں ہوکے برقِ دیدہ خفاش ہو اے دلِ کون و مکاں کے راز مضمر فاش ھو

☆ رونقِ ہنگامہ ایجاد شو در سوادِ دیدہا آباد شو

☆ محرومِ تماشہ کو پھر دیدۂ بینا دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلادے

ذوق وشوق انسانی فطرت کا اہم حصّہ ہے اس لئے اس کی تسکین قلب وانا کے لیے یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم

ہیں۔

دیدۂ بیدار:

درقباء خسروئ درویش زی دیدہ بیدار و خدا اندیش زی

اس شعر کے ذریعہ دیدۂ بیدار سے ''غافل نہ ہونا'' مراد لیا ہے کہ جب اللہ آپ کو ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے تو اس امیری میں بھی درویشی کی شان پیدا کرو اور اللہ سے اپنے آپ کو غافل مت کرو۔ اس شعر میں بھی نصیحت ہے۔

(۲) **دیدۂ بیدار:**۔ دیدۂ بیدار سے مراد وہ آنکھ سے ہے جس پر غفلت طاری نہ ہو

می کنداندلیشہ راہشیار تر دیدۂ بیدار رابیدار تر

خودی ہونے والے خطرے سے ہوشیار کر دیتی ہے اور جاگتی ہوئی آنکھ کو اور زیادہ بیدار کر دیتی ہے۔

درجہاں خورشید نوزائیدہ ام رسم آئین وفلك نادیدہ ام

میں دنیا میں نئے سورج کی حیثیت رکھتا ہوں یعنی میری مثال سورج کی ہے جس طرح سورج کا کام تاریکی دور کرنا ہے اسی طرح میں بھی جہالت کی تاریکی دور کرتا ہوں مگر لوگ آسمان کے آئین وقواعد سے آگاہ واقف نہیں ہیں۔ (اسرارخودی)

چیست اصل دیدۂ بیدار ما؟ لب صورت لذت دیدار ما

آنکھ کی اصلیت کیا ہے؟ آنکھ ہماری خواہشات کو بیدار کرنے یعنی چیزوں کو دیکھنے کی شئی ہے جس سے ہمارے دیکھنے (دیدار) کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ (اسرارِخودی)

کر رہا ہے آسماں جادولبِ گفتار پر ساحرِ شب کی نظر ہے دیدہ بیدار پر (بانگ درا' نوید صبح)

(۳) **دیدۂ گریاں:**۔ دیدۂ گریاں سے مراد کسی کے غم میں آنسو بہانے والی آنکھ سے ہے

تجھ پہ برسا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا ہے نہاں تری اداسی میں دلِ ویراں مرا (بانگ درا گل پژمردہ)

تھمے کیا دیدہ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا (بانگ درا' تصویر درد)

(۴) **دیدہ شاھین:**۔ اقبال کے یاں شاھین تیز' جہات، جہاں بینی اور دوراندیشی کا ایک علامتی پیکر ہے۔ جوان کے نزدیک ایک فرنہانہ شان کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے اس تصوری پیکر میں مسرت کی پیہم جستجو ہی نہیں بلکہ ذہنی فکر میں انقلاب لانے کی صلاحیتیں بھی نظر آتی ہیں۔

فیض فطرت نے تجھے 'دیدہ' شاھین بخشا جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش (ضرب کلیم 'مدرسہ)

(۵) **دیدۂ باطن:**۔ دیدہ باطن سے مراد اقبال کا دل کی آنکھ سے ہے۔

دیدہ باطن پہ رازِ نظمِ قدرت ہو عیاں ہو شناسائے فلک شمعِ تخیل کا دھواں (بانگ درا آفتاب صبح)

(۶) **دیدہ حیران:**۔ دیدہ حیران سے مراد وہ آنکھ ہے جو کسی غیر متوقع حالات کو دیکھ کر حیران ہو۔ درج ذیل شعر میں اقبال کو حیرانی اپنے استاد ڈاکٹر سر ٹامس آرنلڈ کے لاھور ۱۹۰۴ء میں لندن واپس جانے پر ہوئی۔ جو ۱۸۹۷ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لاھور آئے تھے اور یہاں عربی کے پروفیسر تھے۔

دیکھتا ہے دیدہ حیران تیری تصویر کو کیا تسلی ہو مگر گرویدہ تقریر کو (بانگ درا، نالہ فراق)

(۷) **دیدہ حکمت پسند:**۔ مراد ہے جو انجام کار حیرانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

رہنے دے جستجو میں خیال بلند کو حیرت میں چھوڑ دیدہ حکمت پسند کو (بانگ درا درد عشق)

(۸) **دیدہ بینائے قوم:**۔ اگر قوم کو جسم فرض کیا جائے تو افراد اس کے اعضاء ہیں حکومت اس کا چہرہ اور شاعر اس کی آنکھ۔

محفل نظم حکومت چہرہ زیبائے قوم شاعر رنگین نوا ہے دیدہ بینائے قوم (بانگ درا شاعر)

(۹) **دیدہ بینا:**۔ جب انفرادی شعور انسان کو اپنی حقیقت سے غافل کر دیتا ہے تو شعور کا حجاب دیدہ بینا کے حق میں غبار بن جاتا ہے۔

نور تیرا چھپ گیا زیر نقاب آگہی ہے غبار دیدہ بینائے حجاب آگہی (بانگ درا۔ بچہ اور شمع)

اس ترکیب سے مراد عقل مدبِ آدمی سے ہے

ہے تختِ لعل شفق پر جلوس اختر شام بہشتِ دیدہ بینا ہے حسنِ منظر شام (بانگ درا۔ فراق)

دیدہ بینا میں دلِ غم چراغ سینہ ہے روح کو سامانِ زیست آہ کا آئینہ ہے (بانگ درا۔ فلسفہ غم)

اس ترکیب سے مراد اس آنکھ سے ہے جو قلب پر حقائق وماے رف کو واضح کر دے۔

محروم تماشا کو پھر دیدہ بینا دے دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے (بانگ درا۔ دعا)

اس 'دیدہ بینا' کو اقبال نے دیکھنے والی آنکھ سے بھی تعبیر کیا ہے۔

برق ایمن میرے سینے میں پڑی روتی ہے دیکھنے والی ہے جو آنکھ وہ کہاں سوتی ہے (رات اور شاعر)

(۱۰) **دیدہ عبرت:**۔ وہ آنکھ جو مظاھر کے نظام سلطنت کو دیکھ کر خدا کی قدرت کاملہ سے عبرت حاصل کرتی ہے۔

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدہ عبرت کہ گل ہو کے پیدا خاک سے رنگین قبا کیوں کر ہوا

(بانگ درا۔ غزلیات حصہ اول۔ باتجویں غزل)

خوابگہ شاھوں کی ہے یہ منزل حسرت فزا دیدہ عبرت! خراجِ اشک گلگوں کر ادا

(بانگ درا۔گورستانِ شاہی)

(۱۱) **دیدہ دل:**۔دل کی آنکھ سے مراد ہے۔اقبال نے یہ ترکیب سورہ الحج ۲۲ کی درج ذیل آیت ۶۴ سے لی ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں بےنور نہیں ہوتیں، وہ دل بےنور ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی

(بانگ درا۔غزلیات حصہ اول ساتویں غزل)

دیدہ برخوان اجانب دوخت است

آتش جوعش جہانے سوخت است

اس نے دسترخوان کے دونوں سروں پر آنکھ کو گڑا رکھا ہے اور اسکی بھوک کی آگ نے ایک دنیا کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔

(۱۲) **دیدہ اغیار:**۔درج ذیل شعر میں اقبال نے ان شعراء کی آنکھوں سے مراد لیا ہے جنہوں نے ۷۵۶ء میں اسپین (اندلس) کو فتح کرنے کے بعد قرطبہ کو اپنایا۔اور جن کی حکومت ۱۴۹۲ء میں ختم ہوگئی۔

ہے زمین قرطبہ میں دیدہ مسلم کا نور ظلمت مغرب میں جو روشن تھی مثل شمع طور (بانگ درا۔بلادِ اسلامیہ)

(۱۳) **دیدہ تر:**۔اس سے مراد اشک بار آنکھوں سے ہے

لرزتے تھے دلِ نازک، قدم مجبورِ جنبش تھے رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدہ تر تھے

(بانگ درا۔غلام قادر روہیلہ)

مرے دیدہ تر کی ہے خوبیاں مرے دل کی پوشیدہ بےتابیاں (بالِ جبریل۔ساقی نامہ)

(۱۴) **دیدہ انا ان:**۔اس سے مراد انسان کی عمومی آنکھوں سے ہے۔

سر پہ آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں اشک پیہم دیدہ انسان سے ہوتے ہیں رواں

(بانگ درا۔والد مرحومہ کی یاد میں)

(۱۵) **دیدہ نادر:**۔نادر سے مراد محمد نادر شاہ والی افغان سے ہے۔جنھوں نے اکتوبر ۱۹۳۳ میں اقبال، سید سلمان ندوی، سر راس معوند کو افغانستان میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا۔اور اسی سلسلہ میں کابل بلایا تھا۔نادر شاہ کی آنکھیں اپنے ملک اور ملت کے لیئے ہمیشہ اشک بار رہتی تھیں۔یہ امان اللہ خان کے چچازاد بھائی تھے۔۱۹۲۹ء میں تخت پر بیٹھے اور ۱۹۳۳ء میں قتل کر دیئے گئے۔ان کی جگہ محمد ظاہر شاہ نے لی جنھیں وزیر اعظم محمد داؤد نے ۱۹۷۳ء میں تخت سے ہٹایا تھا۔

سرشکِ دیدہ نادربہ داغ لا لہ فشاں چناں کہ آتش اور ادگر فروز نشاں

(بالِ جبریل۔نادرشاہ انفال)

(۱۶) **دیدہ راہ بیں:**۔ یہاں دیدہ راہبیں سے مراد اسلامی علوم سے ہے ۔ یہ ترکیب حکیم خاقانی کی ہے 'تحفۃ العارفین' میں ہے۔اوراس شعر کی تضمین اقبال نے کی ہے۔اس شعر میں بخاری مراد حکیم ابوعلی سینا ہیں جو دسویں صدی عیسوی میں دنیائے اسلام کے نامور حکیم اور فلسفی گذرے ہیں۔قرشی سے مرادی معنی قبیلہ قریش سے تعلق رکھنے والا ہے۔مگر یہاں مراد دین اسلام کا جاننے والا ہے۔

بیا غان بافرو دین دھد عشق برا غان غنچہ چوں پروین دھد عشق

شعاع مہرا و قلزم شگاف است بہ ماھی دیدۂ رہ بین دھد عشق

اس رباعی میں دونوں طرح کی محبت وعشق کا ذکر ہے۔عشق مجازی وعشق حقیقی۔باغوں،صحراؤں میں جو ہریالی، غنچے اور پھول نظر آتے ہیں یہ سب عشق کی دین ہے آفتاب کی کرنیں جو سمندر کے تہہ تک شگاف کر کے مچھلی کو راستہ دکھاتی ھے یہ سب عشق الہیٰ کی بدولت ھے۔

چوں دیدۂ راہ بیں نداری قاید قرشی بہ از بادری

(ضرب کلیم ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام)

دیدہ ادراک: اس شعر میں ڈاکٹر اقبال نے بہترین اشارہ کیا ہے کہ ظالم اپنی طاقت وظلم پر فخر و ناز کرتا ہے حالانکہ ایسے حالات میں اس کے غور وفکر کرنے کی طاقت سلب ہو جاتی ہے اور وہ آنکھ رکھتے ہوئے بھی نابینا ہو جاتا ہے جس سے وہ زمانے میں ذلیل ورسوا ہو جاتا ہے۔اس میں نصیحت ھے

تیزء دنداں ترا رسوا کند دیدۂ ادراک را اعمیٰ کند

(۱۷) **دیدۂ وگوش:**۔اقبال نے درج ذیل شعر میں جنت کی ان نعمتوں کا ذکر کیا ہے جن کی آنکھ اور کان کو آرزو ہو سکتی ہے۔دوسرے مصرعے میں 'ارم' سے مراد وہ بشت ہے جسے شداد نے بنائی تھی۔شداد عاد کا بیٹا تھا۔عاد ارم کا ذکر سورۃ الفجر ۸۹ کی آیات ۶ تا ۸ میں وارد ہے جس میں 'عاد' کے معنی اونچے ستونوں والے ہیں۔

کیا ساؤں تمہیں ارم کیا ہے خاتمِ آرزوئے دیدۂ وگوش (بانگ درا۔سیر فلک)

اس طرح اقبال نے اپنے کلام میں مختلف مقامات پر مختلف حیثیتوں سے مخلف مضامین میں دیدۂ کا استعمال کیا ہے جیسے دیدہ طاھر، دیدہ حکمت، دیدہ بلبل، دیدہ امید، دیدہ پرنم، دیدہ غمناک، دیدۂ خونابہ بار، جیسے ماتمات پر مختلف اصطلاحوں میں دیدۂ کا بڑے معنی خیز انداز میں استعمال کیا ہے۔

سی شود پردۂ چشم پر کاهی گاهی دیده ام هر دوجهاں را به نگاهی گاهی
وادئی عشق لبی دور و دراز است ولی طے شود جادۂ صدساله به آهی گاهی

کبھی کبھی عاشق کی آنکھ پر پردہ پڑ جاتا ہے تو وہ عام انسان کی طرح دنیا کے حالات سے بے خبر ہو جاتا ہے یعنی اس کو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا مگر جب فیضان الٰہی کا اس پر نزول ہوتا ہے تو وہ ایک ھی نظر میں ساری کائنات کو دیکھ لیتا ہے۔ وادئ عشق کی دوری بہت زیادہ ہونے کے باوجود وہ آہ میں سیکڑوں سال کا سفر طے کر لیتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جدوجہد کرنے کے ساتھ ساتھ ذات الٰہی سے کامیابی کی دعا بھی کرتا رہے۔

بلاشبہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال چشم بینا، بیدار ذہن اور وسعت علمی کی بناء پر دیدہ اور دیدہ ور کی اصل حقیقت سے واقف تھے۔

آخر میں اپنی تحریر کا اختتام خود علامہ اقبال کے اس شعر سے کرتی ہوں:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پے روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ دیدار

☆☆☆

پروفیسر وجیہ الدین
بڑودہ، گجرات

درگاہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری (احمد آباد) کے جرنل کا اشاریہ

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی جب کہ دنیا بھر کی کتابیں پرسنل کمپیوٹر پر دستیاب ہیں، کتابوں اور لائبریریوں کی اہمیت کم نہیں ہوئی، اہل علم کے ذوق کی تسکین اوراق پر تحریر کردہ مواد ہی سے ہوتی ہے، کیونکہ آنکھوں کی راہ سے یہ مواد دماغ کے پردے پر نقش ہو جاتا ہے، قدیم زمانیں میں اہل علم کتابوں کے اپنے ذخیرے رکھتے تھے، مکاتب اور درسگاہوں میں بھی کتب خانے ہوا کرتے تھے، علم کے شائق بادشاہوں نے بھی عظیم کتب خانے قائم کئے اوران کی سرپرستی کی، چھاپہ خانہ کی ایجاد سے پہلے کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں، املا اور نقل کی وجہ سے ایک ہی کتاب کے مختلف نسخوں میں بہت سے اختلاف بھی در آتے تھے، نسخوں کا یہی اختلاف ہے جسے رفع کرنے کے لئے ارباب تحقیق اب مختلف لائبریریوں میں منتشر الگ الگ نسخوں کو سامنے رکھ کر کتاب کی تصحیح وترتیب کا کام انجام دیتے ہیں اور یونیورسٹیاں مخطوطات کی تصحیح کر کے انہیں مرتب کرنے والوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں سے نوازتی ہے۔

بڑی لائبریریاں عموماً حکومت کی سرپرستی کی محتاج ہوا کرتی ہیں، قومی لائبریریوں میں پریس ایکٹ کے تحت ملک کی مطبوعہ تمام کتابوں کے دو نسخے بھیجنا قانوناً ضروری ہے، ہندوستان میں یہ قومی لائبریریاں کولکاتا، ممبئی، چنئی، دہلی اور دیگر جگہوں پر ہیں لیکن لائبریریوں کی اصل اہمیت قدیم کتابوں کے ذخیروں سے ہوتی ہے جو عموماً مخطوطات کی شکل میں ہوتی ہیں، انگریزوں اور یورپ کے دوسرے استعمار پسندوں نے اپنے دور حکومت میں نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی دنیا کے عظیم کتب خانوں سے مخطوطات کے ذخیرے چوری کر کے انہیں اپنی لائبریریوں میں سجا دیا، لندن کے برٹش میوزیم کے علاوہ جرمنی اور پیرس کے کئی کتب خانے اس چوری کے مال سے مالا مال ہیں۔

اس کھلے ظلم اور کتابدوزی کے باوجود الحمد اللہ ہندوستان میں کئی کتب خانے ایسے ہیں جہاں مخطوطات کے بیش بہا جواہر محفوظ ہیں، ان کتب خانوں میں اولین مقام پٹنہ کی خدا بخش اورینٹل لائبریری کا ہے جو حکومت ہند کے زیر انتظام ہے، دوسرا سب سے بڑا مخطوطات کا ذخیرہ رضا لائبریری رامپور ہے، مخطوطات کی تیسری بڑی لائبریری حیدرآباد میں سالار جنگ میوزیم کی لائبریری اور چوتھی حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری ہے جو حکومت کی بدانتظامی کا شکار ہے، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور نئی دہلی میں ہمدرد کی لائبریری میں مخطوطات کے عظیم ذخائر محفوظ ہیں، گورنمنٹ لائبریریوں میں

صرف کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں مخطوطات کی تحفیظ کی گئی ہے، ایشیاٹک سوسائٹی ممبئی نے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کے ساتھ وہ ظالمانہ سلوک کیا کہ یہ پورا ذخیرہ تلف ہوگیا لیکن جامعہ مسجد ممبئی کی محمدیہ لائبریری میں مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، اس وقت مغربی ہندوستان میں مخطوطات کا سب سے بڑا ذخیرہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری، احمد آباد میں ہے جہاں چار ہزار سے زیادہ مخطوطات کی تحفیظ کی گئی ہے، خوش آئیند بات ہے کہ یہ لائبریری بہ جائے حکومت ایک ٹرسٹ کے زیر انتظام ہے جس کی آمدنی خاطر خواہ اور اس کے ٹرسٹیان باذوق ہیں، مغل دور حکومت سے پہلے گجرات سلاطین دہلی کا ایک صوبہ اور بعد میں شاہان گجرات کا مرکز رہا ہے، ان کی سرکاری زبان فارسی تھی، پورا خطہ گجرات اور خاص طور سے احمد آباد بزرگوں اور ولیوں کا مسکن رہا ہے، اس لئے اس شہر میں تصوف کی بیش از بیش قدردانی رہی اور حقائق و معارف تصوف سے متعلق بے شمار کتابیں لکھی گئیں جو چند ایک کو چھوڑ کر سبھی غیر مطبوعہ ہیں۔

حضرت پیر محمد شاہ (۱۱۰۰ھ تا ۱۱۶۳ھ) ایک صاحب دل اور صاحب نسبت بزرگ تھے، جو بیجاپور سے ترک وطن کر کے احمد آباد آ گئے تھے، آپ کا مختصر ذکر مرآۃ احمدی (طبع اول ممبئی ۱۳۰۷ھ وطبع ثانی احمد آباد ۱۹۳۰ء) میں موجود ہے، آپ شاعری بھی کرتے تھے اقدس تخلص فرماتے تھے، مولانا ابوظفر ندوی نے آپ کی سوانح ''تذکرۂ اقدس'' کے نام سے قلم بند کی تھی جو ۱۹۳۴ء میں مطبع معارف اعظم گڑھ میں طبع ہوئی تھی اور اب حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کی طرف سے دوبارہ شائع ہوئی ہے، تذکروں میں مرقوم ہے کہ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا اور مزید تحصیل علم کے لئے حجاز مقدس کا سفر کیا تھا، آپ نے حرمین شریفین میں تیرہ سال قیام فرمایا، چونکہ ذوق علمی تھا اسلئے وہاں سے قلمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہمراہ لائے، آپ کے سلسلہ ارشاد و بیعت میں بہت سے ارباب علم تھے جن کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان لوگوں نے بھی آپ کے کتب خانے کے لئے بہت سی کتابیں نذر کیں، اسی طرح حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کی ابتداء ہوئی، پھر تو فتوحات غیبی کی طرح آپ کے کتب خانے میں کتابوں کی بارش ہونے لگی، اس طرح یہ کتب خانہ ۱۳۲۵ھ میں حضرت پیر محمد شاہ کی زندگی ہی میں قائم ہوگیا تھا، جن بزرگوں نے اس کتب خانہ کو مرکزی حیثیت دینے میں حصہ لیا ان میں عماد الدین ابن ولی اللہ گجراتی، پروفیسر محبوب حسین عباسی، مولوی محمد خوب پیٹی والے خلیفہ پیر جماعت علی شاہ، احمد آباد شہر کے سنی بوہروں اور کڑی (ضلع بہسانہ) کے آپکے مریدوں کی کثیر تعداد شامل تھی۔

اس لائبریری کی مندرجہ ذیل خصوصیات اہالیان علم کے لئے لائق توجہ ہیں:۔

(۱) قرآنیات وعلوم الحدیث، فقہ وتصوف اور دیگر علوم دینیہ نیز علم وحکمت کے تقریباً چار ہزار مخطوطات جو دسویں صدی ہجری سے قبل کے ہیں، یہاں تمام وکمال محفوظ ہیں۔

(۲) بزرگوں کے ملفوظات کا بہت بڑا ذخیرہ جس پر ریسرچ اور ان کی ترتیب کی ضرورت ہے۔

(۳) قدیم فارسی کے دواوین ہیں،ان پر فارسی میں ریسرچ کرنے والوں کی توجہ درکار ہے۔

(۴) اس لائبریری میں میرامن کی ''باغ و بہار'' کا پہلا ایڈیشن موجود ہے جو مطبع کے ایجاد کے بعد کا ایک تاریخی نسخہ ہے۔

(۵) لائبریری میں بے شمار نوادرات ہیں جن کی تاریخی حیثیت ہے، یہ نوادرات ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی مرحوم کے حسن توجہ کی مرہون منت ہیں۔

(۶) قدیم فہارس کتب مع ترجمہ مصنفین وعناوین جیسے ، الفہرست، انجد العلوم، کشف الظنون، مفتاح الکنوز السعادۃ، کشاف ومصطلحات الفنون، معجم المفرس لالفاظ القرآن، معجم المفہرس الفاظ الحدیث، مفتاح الکنوز السنۃ، نیز عربی و فارسی کی زیادہ تر تفاسیر، لغت اور دیگر کتب یہاں موجود ہیں۔

(۷) دنیا کی زیادہ تر لائبریریوں کی فہارس کتب بھی اس کتب خانہ کی زینت ہیں۔

(۸) لائبریری میں موجود اردو، عربی و فارسی کے مخطوطات کا کیٹیلاگ (بارہ (۱۲) جلدوں پر مشتمل) بھی شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔

لائبریری کی علمی وادبی کاوشوں، کارناموں کو آگے بڑھانے اور عام کرنے میں اس لائبریری کے جرنل کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ہم اس مقالہ میں درگاہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اور ریسرچ سینٹر، احمد آباد کے جرنل (شمارہ ۱ تا ۶) کا اشاریہ پیش کررہے ہیں تاکہ اہل علم ودانش کو اس کے اندرجات ومشمولات کا علم ہوسکے۔

☆ جرنل شمارہ یک (۱)، عنوان:۔تصوف اور ہندوستانی معاشرہ، سن اشاعت، ۱۹۹۸ء

☆ جرنل شمارہ دو (۲)، عنوان:۔گجرات میں علمی وادبی سرگرمیاں، سن اشاعت، ۲۰۰۱ء

☆ جرنل شمارہ تین (۳)، عنوان:۔گجرات کی علمی ادبی وثقافتی سرگرمیاں، سن اشاعت، ۲۰۰۳ء

☆ جرنل شمارہ چار (۴)، عنوان:۔گجرات کی علمی، ادبی اور ثقافتی وراثت، سن اشاعت، ۲۰۰۷ء

☆ جرنل شمارہ پانچ (۵)، عنوان:۔تاریخ گجرات کا تحقیقی مطالعہ، سن اشاعت، ۲۰۱۰ء

☆ جرنل شمارہ چھ (۶)، عنوان:۔تہذیبی بازگشت و دیدۂ بینا، سن اشاعت، ۲۰۱۶ء

جرنل شمارہ:۔۱ (ایک)

مضمون کا عنوان	**مضمون نگار**
پیش لفظ	محی الدین بمبئی والا

تصوف، تاریخ وتہذیب، رسم وحقیقت	خواجہ حسن ثانی نظامی
تصوف اور ویدانت: مشترکہ قدریں	نثار احمد فاروقی
گجرات واحمد آباد اوران کے بعض صوفیائے کرام کی علمی وثقافتی دین	ضیاءالدین اصلاحی
گجرات میں مذہبی اور ادبی رجحانات	سید امیر حسن عابدی
خانوادہ حضرت شاہیہ؛ گجرات کے فضلاء کی تصانیف کے تین نادر مخطوطے	نذیر احمد
نگاہی بہ ملفوظات شاہ عالمؒ	اکبر ثبوت
حضرت شاہ عالم کے ملفوظات پر ایک نگاہ	شریف حسین قاسمی
گجرات کے سہروردی مشائخ کی عرفانی زندگی کی ایک جھلک؛ سیرت السادات کی روشنی میں	شریف حسین قاسمی
اسلامی تصوف اور خدماتِ اولیائے گجرات	اعجاز مدنی
گجرات کے صوفیائے کرام کی علمی خدمات اور قومی یک جہتی	سید باوا صاحب اصغر علی ترمذی
صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی درگاہوں کی تعمیر میں غیر مسلموں کا حصہ	سید عبدالرحیم
ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو کے (غیر مسلم) ہندو شعرا کا حصہ	نثار احمد انصاری
رسالہ "شیخ گنج" احمد کھتّو	چاند بی بی شیخ
تصوف اور ہندوستانی معاشرے کو اس کی دین	مشکور احمد قریشی
Introduction	
Medieval Gujrat Society and Sufis	Ziyauddin A.Desai
The Sect of Imam Shah in Gujrat	W.Ivanow
Sheikh Akbar Ibn Arabi's Philosophy of Wahdat Al Wujud	Ismail Lali Wala

جرنل شمارہ:۔۲(دو)

مضمون کا عنوان	**مضمون نگار**
سخن چند	محی الدین بمبئی والا

احمد آباد کے ساداتِ شیرازی کی علمی خدمات	شیخ جمال الدین گجراتی
قرون وسطیٰ میں گجرات کے علمائے کرام کی حدیثی خدمات	اقبال ننکاروی
احمد آباد میں مدفون فارسی شعرا	محبوب حسین عباسی
گجرات کا عربی زبان اور علوم اسلامی کی ترویج میں حصہ	سید باوا صاحب اصغر علی ترمذی
درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہ کے عربی اور فارسی کتبے	سید عبدالرحیم
احمد آباد کے ایک غیر معروف عالم مولانا محمد رضا کُردی کی علمی خدمات	سید عبدالرحیم
سادات شاہیہ بخاری کی علمی خدمات	شیخ خواجہ معین الدین محمد عثمان
انیسویں صدی کے گجرات کے غیر معروف شعرا	کریم اللہ انصاری
گجرات میں اردو ادب کا ارتقا بعد از فتح گجرات	عزیز اللہ مبین اللہ انصاری
ہندوستان کے فارسی زبان وادب کی ترویج وتوسیع میں گجرات کا حصہ	عبدالودود اظہر دہلوی
طبقات نگاری وتذکرہ نویسی کی روشنی میں " گلزار ابرار " کا جائزہ	محمد حسین وفا جون پوری انصاری
نظیری کا کچھ غیر مطبوعہ کلام	سید امیر حسن عابدی
احمد آباد میں مقیم چند ایرانی شعرا	شریف حسین قاسمی
مہدوی تحریک کا ثقافتی منظر نامہ	عبدالحق
رشکِ خراسان " گجرات " اور رشکِ گلشنِ فردوس "احمد آباد "چند فارسی مآخذ کی روشنی میں	شعیب اعظمی
تقی اوحدی کی گجرات میں ایرانی شعرا سے ملاقاتیں	سید امیر حسن عابدی
Introduction	Muhammad Habib Kakiwala
In the Name of God	Mohammad Reza Bagheri
Zuban-e-Urdu-e-Mu'alla and the Idol of Linguistic Origins	David Lelyveld

Gujrat's Contribution to Gujri &Urdu	Mohammad Ibrahim Dar
Early Muslim Settlements in Gujrat	Mohammad Ibrahim Dar
Ali Mohammad Khan Bahadur	Ziyauddin A.Desai
i(Ahmedabad-Arabic &Persian Inscriptions ii(Jama Masjid iii(Ahmedabad-Madrasas	Ziyauddin A.Desai
Life &Society in 16th Century Gujrat as depicted in a Persian Hagiological work	Ziyauddin A.Desai
AForgotten colony of Iranians in Maharashtra and some other over-looked aspects of Indo-Iran Relations	Ziyauddin A.Desai

جرنل شمار:۔تین(۳)

مضمون کا عنوان	مضمون نگار
پیش لفظ	محی الدین بمبئی والا
افتتاحی خطبہ	ضیاءالدین۔اے۔ڈیسائی
بیرون گجرات کی علمی خدمات کے مآخذ	ضیاءالدین۔اے۔ڈیسائی
احمد آباد(گجرات)میں ایرانی شعرا کی آمد	سید امیر حسن عابدی
خاندان ولی اللہ کی علمی اور دینی خدمات	سید عبدالرحیم
گجرات میں علم حدیث اور شیخ عبدالملک بمبانی	ضیاءالدین اصلاحی
ثمرات القدس من شجرات الانس "میں مذکور گجرات کے مشائخ کرام	شریف حسین قاسمی
سلطنت گجرات کے فارسی مورخین: تاریخ نگاری کی نوعیت اور اس کا علمی معیار	اقتدار حسین صدیقی

جامع مسجد اچل پور کا ایک نادر کتب خانہ	سید عبدالرحیم
خواجہ محمد دہدار فانی حالات وادبی خدمات	آغا غیاث الرحمٰن
گجرات کیا ایک بلند پایہ مفسر	عبدالاحد قاسمی تاراپوری
گجرات کے چند غیر معروف علماء دین	محبوب حسین عباسی
دن فارن وکیبولری آف دی قرآن؛ تعارف وتجزیہ	مقصود احمد
اسم نامہ؛ سید غلام محی الدین غمگین گجراتی ملقب بہ "اوکلی سری" (انکلیشوری)	نورالسعید اختر
گجرات میں اہلِ بواہر	سید حاتم ذکی الدین
سورت کے مشائخ وعلماء کی ادبی خدمات	محمود صدیقی
تجوید وقرات اور صوبہ گجرات	محمد اقبال ننکاروی
گجرات کے اُمرا کی سماجی اخلاقیات (گجرات کی عربی تاریخ "ظفر الوالہ۔۔" کے تناظر میں	خواجہ معین الدین محمد عثمان
گجرات میں قدیم مدارس	سید باوا صاحب اصغر علی ترمذی
قرون وسطیٰ (1758ء/ 1297 ہجری) میں گجرات کے مدارس میں طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم	شیخ عبدالرشید ابہام
'گلزار ابرار" میں مذکور مشائخ احمد آباد اور ان کی تصانیف	محمد حسین۔م۔انصاری
قلم وادب کا مرکز "بدایون"	عراق رضا زیدی
حافظ کے اشعار میں ضرب الامثال کا استعمال	وجیہ الدین
Introduction	Muhammad Habib Kakiwala
Two Irani Significant Sufi Orders in India with Special References to Gujrat	Jafer husain Lali wala
Iranians at the Court of Sultans of Gujrat	Nisar Ahmed Ansari

An expounder of al Fattah al Askari;Abd' Mathnawi of Rumi	M.H.Siddiqui

جرنل شمار:۔ چار(۴)

مضمون کا عنوان	مضمون نگار
گجرات میں مسلمانوں کی آمد اور عرفائے کرام کی مساعی جمیلہ	جلال تاملی
شمس الائمہ السرخسی	محمد حمید اللہ
حافظ سخاوی کے سب سے پہلے گجراتی شاگرد۔ مولانا راج بن داؤد احمدی	ضیاء الدین اصلاحی
نظیری نیشاپوری کی کچھ غیر مطبوعہ غزلیں	سید امیر حسن عابدی
شرح بحر العلومی	سید امیر حسن عابدی
محبت ہی تصوف ہے	شریف حسین قاسمی
اقبال اور تصوف کا دوسرا رخ	عبدالحق
کرتا ہے ترا جوشِ جنوں تری قبا چاک	عبدالحق
دربارِ خان خانان کا ایک شاعر۔ محمد رضا نوعی خبوشانی	عراق رضا زیدی
عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ	مقصود احمد
"اخبار الاخیار" میں گجرات کے مشائخ کا تذکرہ	وجیہ الدین
تصوف اور بھکتی۔ مماثلت اور مغائرت	شمیم طارق
سانحہ گجرات کے پس منظر میں۔ اسلام کا پیغام امن و آشتی	حسن مُثنیٰ
قاضی القضاۃ سیدنا النعمان بن محمد التمیمی قدّس اللہ روحہ اور ان کی تالیف شدہ کتاب "اساس التاویل الباطن"	حاتم زکی الدین
حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی	عبداللہ قادری صدیقی
ولی کا تاریخی کارنامہ	ظفر احمد صدیقی
شیخ نور الدین احمد بن عبداللہ الطاوسی الشیر ازی اور رسالہ "اخلاق سلطانی"	محبوب حسین احمد حسین عباسی

دیوان ملک عبدالسلام بن عبدالرحمان العیدروسی	نثار احمد انصاری
گجرات کے بارھویں صدی ہجری کے کاتب اوران کی کتابت کردہ کتابیں	محبوب حسین احمد حسین عباسی
آزادی کے بعد گجرات کے مسلم تعلیمی اداروں کی خدمات۔ایک جائزہ	ابہام رشید
مرحوم سید ابوظفر ندوی۔حیثیت مترجم	وفا جون پوری
حضرت شیخ مخدوم رحمت اللہ	شیخ جمال الدین گجراتی
صوفیائے گجرات کی علمی خدمات	اختر شاہ دیوان
دستور ملا فیروز بن کاؤس جلال	محی الدین بمبئی والا
	Ali -e-Aaqa Yusufi
گوشہ ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی-ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی مرحوم چند یادیں	سید عبدالرحیم
گوشہ ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی-ڈاکٹر ضیاءالدین احمد دیسائی تاثرات اور یادیں	ضیاءالدین اصلاحی
گوشہ ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی-استاد دانش مند ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی فارسی زبان و ادب کے ایک منفرد عالم	شریف حسین قاسمی
گوشہ ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی-ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی مرحوم	آغا غیاث الرحمٰن
گوشہ ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی-شیرانی دبستان تحقیق کا ماہِ درخشان	مظہر محمود شیرانی
گوشہ ڈاکٹر ضیائالدین دیسائی-	Pankaj.T.Desai
ScholarDr. Ziyauddin.A.Desai An Epigraphist &	
گوشہ ڈاکٹر ضیائالدین دیسائی-	Markand Mehta
My Friend Late Dr. Ziyauddin.A.Desai	
Acritical Study of Arab o Hind ke talluqat	Maqsood Ahmed
Sufism in Quran and Hadith and the Crises in the Modern World	Jafer husain Lali wala

Ziyauddin.A.Desai Persian Sources of the Social and Cultural History of Medieval Gujrat	
No Title	Ali Yusufi

جرنل شمارہ۔۵ (پانچ)

مضمون کا عنوان	**مضمون نگار**
تصوف کی حقیقت	مقصود احمد
احمد آباد (گجرات) کے دسویں صدی ہجری کے فارسی شاعر؛ شیخ یحییٰ مفتی اور ان کا کلام	محبوب حسین عباسی
مناقب حضرت علامہ محمد بن طاہر گجراتی المعروف بہ محدث پٹنی مع سفر نامہ حجاز	مرتب: محمد ولی عبداللہ نور ولی
کتاب "گنج المعانی" باسم حضرت صاحب قرانی۔از: مطیعی	ترتیب و نظر ثانی: شیخ جمال الدین گجراتی
چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں کی علمی و ادبی حالت سیاسی تناظر میں	عصمت ناز
تاریخ سلاطین گجرات (فارسی)	سید محمود بخاری
Society and culture	Tarachand
Eminent Abbasi Scholars and Nobles of Gujrat	Mehboob Husain Abbasi
Tarikh-i-Salatin-i-Gujrat-By:Mahmud Bukhari	:Foreword Edited Tarachand with Introduction :Notes by& S.A.I.Tirmizi
Sketch of Saiyed -New Introduction and Life	Mehboob :by Husain Abbasi
Mahmud Bukhari	

جرنل شمارہ:۔۶(چھ)

مضمون کا عنوان	مضمون نگار
مولانا جلال الدین بلخی رومی اور مثنوی معنوی سے تعلق رکھنے والے حضرت پیر محمد شاہ	محبوب حسین احمد حسین عباسی
کتب خانے کے دو اہم نایاب فارسی رسالے	
پٹرول گیس اور ابتدائے اسلام	حمید اللہ
اللہ کی نعمت عظمیٰ پانی کا ظاہر و باطن	حاتم زکی الدین
اردو شاعری کی سرپرستی مغل اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان ایک موازنہ	چودھری محمد نعیم
قرون وسطیٰ کے مسلم سکے اور کتبے	سید عبدالرحیم
قرآن پاک کے اردو تراجم و تفاسیر	محمد افضل خان
احمد آباد میں علم و فن کا ایک مثالی مخزن پیر محمد شاہ لائبریری	محمود حسن الہ آبادی
کتبہ شناسی کے موضوع پر ایک انگریزی کتاب Triumphal Sun	محمود حسن الہ آبادی
'مذہب مختار" ترجمہ و حواشی "معانی الاخبار"	محمود حسن الہ آبادی
مولانا شیخ احمد المعروف میاں مخدوم	شیخ جمال الدین گجراتی
شعرائے سوراشٹر	مولوی محمد ابراہیم
Biruni and his Scientific Achievements-Al	M.Nizamuddin
Bilingual Coins of Mahmud of Ghazni-A Re-study	A.K.Bhattacharyya
An Etymological study, Saba'Mu'allaqat or Seven Arabic Odes	Qazi Ahmad Mian Akhtar
Royal policy and patronage of Sufi shrines I:in Mughal Revenue Documents from Khuldabad	Carl W.Ernst
Royal policy and patronage of Sufi shrines II: Barahmani and Faruqi relations with the Sufis of Khuldabad	Carl W.Ernst

Carl W.Ernst	The theory and practice of Sama'in the Sufi circle of Burhan Al-Din Gharib
Jerald F.Dirks	Muslims in America;The Pre Columbian Era
	Some illuminated Quran manuscripts which were released at "International Exhibition of Islamic Books and Manuscripts (March 27April 2, 1983), Karachi
	Hamza-Nama, Tuti Nama
Shaikh Muhammad Ashraf	The Holy Quran English translation and commentary by Yusuf Ali
	If we had such teachers Excerpts from Krishna Murti's books on education

☆☆☆

ڈاکٹر احتشام الدین
اسسٹنٹ پروفیسر، مرکز تحقیقات فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

انیسویں صدی میں فارسی ادب-ایک اجمالی جائزہ

ہندوستان کی تاریخ میں انیسویں صدی عیسوی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس صدی میں ہندوستان کا صدیوں پرانا سیاسی وسماجی نظام خطرے میں پڑ گیا۔ مغلوں کی عظیم سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور اور اسی صدی کے وسط میں ایک استعماری طاقت نے مغلوں کی مرکزی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس سیاسی تغیرات نے معاشرے پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ لیکن اس طوائف الملو کی اور افراتفری کے دور میں بھی کچھ ایسے اشخاص اور صاحب علم وفن پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی خدمات کے ذریعہ فارسی ادب کو ایک نئی جہت عطا کی۔

انیسویں صدی کے فارسی زبان وادب کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں تخلیق ہونے والا ادب گذشتہ ادوار میں وجود میں آنے والے ادب کے مقابلے میں کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے کسی بھی طرح کم وقیع نہیں ہے۔ نظم ونثر، تذکرہ نویسی، تاریخ نویسی، لغت نویسی، سفرنامہ وغیرہ سبھی اصناف پر کثرت کے ساتھ شعرا وادبا نے خامہ فرسائی کی۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ فارسی ادب کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر اس دور کے شعرا وادبا نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ اس مختصر مقالہ میں انہیں اصناف سخن کی روشنی میں انیسویں صدی میں فارسی ادب پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی سرپرستی شاہی درباروں نے کی ہے۔ دہلی سلطنت ہو یا پھر مغلیہ دور حکومت ان تمام ادوار میں علما، شعرا وادبا کی کثیر تعداد درباروں سے وابستہ رہی اور یہ سبھی اپنے مخصوص میدانوں میں علمی وادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ انیسویں صدی میں جب انگریز کے ہاتھوں مغلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور مختلف ریاستوں میں قائم نیم آزاد حکومتیں بھی انگریزوں کے تحت آ گئیں تو اس کے نتیجے میں فارسی زبان و ادب بھی بتدریج زوال پذیر ہوا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فارسی زبان وادب کی سرپرستی کرنے والے موجود تھے۔ مثلا رامپور، حیدرآباد، اودھ، بھوپال، عظیم آباد وغیرہ درباروں کے سربراہان نے اس عہد میں فارسی زبان وادب کی سرپرستی کا بیڑا اٹھایا، جس کے نتیجے میں فارسی ادب کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا۔ تذکرہ اور تاریخ کی رو

سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں سینکڑوں کی تعداد میں شعرا اور ادبا ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مصروف کار تھے لیکن ان کے آثار آج ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ اس دور کے شعرا نے غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی و دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غالب اور اقبال کی شخصیت اس کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ ذیل میں ہم اس دور کے معروف شعرا و ادبا اور ان کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کریں گے۔

غالب بلاتردید اس عہد کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ غالب نے فارسی نظم ونثر کو جو مقام عطا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ غالب پر لکھنے کے لئے ایک مقالہ نہیں بلکہ ایک دفتر درکار ہے اور یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں۔

جیسا کہ ذکر ہوا، انیسویں صدی کے نصف اول میں سینکڑوں کی تعداد میں شعرا و ادبا فارسی زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ خود دہلی میں غالب کے علاوہ مشاہیر سخن کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ اس عہد کے اکثر شعرا نے فارسی و اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان میں امام صہبائی، شیفتہ، مرزا ہرگوپال تفتہ، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے فارسی کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی۔

حکیم مومن خان مومن کو فارسی زبان و ادب پر وہ دستگاہ حاصل تھی کہ اکثر لوگ انہیں ایرانی تصور کرتے تھے۔ مومن نے شاعری کی بیشتر اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی کو موضوع سخن بنایا اور ان تمام اصناف میں شاعری کا اعلی نمونہ پیش کیا۔ ذیل میں ان کی غزل کے چند ابیات نقل کئے جاتے ہیں جن سے فن شاعری میں ان کی کامل دسترس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے:

هم تاب وصل نیست من بی نصیب را — خود دشمن خودم نشناسم رقیب را
دارم هنوز یك دو نفس جان من بیا — دریاب دردمند بمردن قریب را [1]

نیز یہ ابیات:

کیستم بی قرار وغمزدۂ — دوجهان را به روی هم زدۂ
عاشقی سخت آرزومندی — بیدلی، بیکسی، ستم زدۂ
منکر شیخ شهر مومن نام — بوسه بر پای هر صنم زدۂ [2]

مولانا صہبائی ایک جید عالم تھے۔ انہوں نے فارسی میں گرانقدر ادبی سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے جن میں کلیات، قول فیصل اور مختلف شرحیں قابل ذکر ہیں۔ کلیات صہبائی کے دیباچے میں ان کی نظم ونثر کے تعلق سے لکھا ہے:

" سواد عبارتش ابریست چون ابر نیسان گوهربار و بیاض بین

السطورش صبحیست چون صبح مطلع انوار، نثرش تاب الفاظ حرف قدر نثره از صفحۂ روزگار شسته و نظمش از طلوع آفتاب معانی صورت عقد ثریا از نظر مردم نهفته"[۳]

درج بالا اقتباس فارسی نظم ونثر میں صہبائی کی مہارت پر دال ہے۔صہبائی کا دیوان قصائد،غزلیات، رباعیات اورمخمسات پر مشتمل ہے۔نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

بوی آن رخسار دارد جان غم فرسود ما سینه چون گل می خراشد آه مشك اندود ما

نیز یہ شعر:

وحدت هزار جلوه فتاده است دیده ام در دیر و کعبه رنگ عذاب و ثواب را [۴]

منشی ہرگوپال تفتہ بھی اس عہد کے مشہور شاعر اورادیب تھے۔تفتہ ۱۷۹۹ء میں ضلع بلند شہراتر پردیش کے سکندرآباد میں پیدا ہوئے۔تفتہ پہلے رامی تخلص کرتے تھےاور میرزا محمد حسن قتیل سے اصلاح سخن لیا کرتے تھے۔وہ ان خوش نصیب شاعروں میں سے تھے جنہیں غالب جیسا استاد اور مہربان دوست ملا۔غالب نے ہی تفتہ کا تخلص رامی سے بدل کر تفتہ رکھا۔

تفتہ کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات نمایاں ہے کہ ان کی غزلیں تقلیدی ہیں۔انہوں نے اپنی غزلوں میں سعدی شیرازی، حافظ،کلیم کاشانی،حزین لاہیجی اور غالب کی تقلید کی ہے،لیکن سب سے زیادہ میرزا جلال اسیر کا اثر قبول کیا ہے۔ان کی بیشتر غزلیں اسیر کی تضمین میں ہیں۔تفتہ کی غزلیات پر میرزا جلال اسیر کے اثرات کا اندازہ صرف ان کے دیوان دوم کے مطالعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دیوان میں شامل ان کی سو سے زیادہ غزلیں میرزا جلال اسیر کی زمین میں ہیں۔

اس کے علاوہ تفتہ نے بوستان سعدی کی تقلید میں ''سنبلستان'' لکھی۔تفتہ نے اسے مولوی ظہور علی کی فرمائش پر ان کے جوان سال بیٹے محمد سلیمان کی موت پر لکھی تھی۔سنبلستان کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

به نام خدای جهان آفرین زمین آفرین آسمان آفرین

تفتہ نے سنبلستان کو ۱۳ ابواب میں منقسم کیا ہے۔اگر چہ ''سنبلستان'' فصاحت و بلاغت میں کسی بھی لحاظ سے بوستان سعدی کے پایہ کو نہیں پہونچتی،لیکن بہرحال انیسویں صدی کے فارسی ادب میں اس کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔

'تضمین گلستان' کے عنوان سے تفتہ نے گلستان سعدی کی تضمین بھی لکھی ہے جو پہلی بار ۱۸۶۵ء میں لکھنو اور پھر ۱۸۷۳ء میں نولکشور سے شائع ہو چکی ہے۔ایک جگہ اس کتاب کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

دگر گوئی نہ کمتر از گل است آن خودش نام است تضمین گلستان [۵]

انیسویں صدی کی ایک اور نمایاں شخصیت جس نے فارسی نظم ونثر دونوں میں اعلیٰ نمونہ پیش کیا نواب مصطفےٰ خان شیفتہ ہیں۔شیفتہ نے فارسی واردو دونوں زبانوں میں شعر کہے اور کتابیں تصنیف کی۔وہ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔غالب کو شیفتہ سے حد درجہ انس تھا اور وہ ان کی شاعرانہ صلاحیت کے قائل بھی نظر آتے ہیں۔ایک قصیدے میں غالب نے شیفتہ کی یوں تعریف کی ہے:

آن ہمای تیز پرواز کہ بال در ہوای مصطفی خان می زنم

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

غالب ز حسرتی چہ سرایی کہ در غزل چون او تلاش معنی ومضمون نکردہ کس

شیفتہ کا فارسی کلام تصوف،حکمت،اخلاق اور محبت کے اعلیٰ جذبات سے پر ہے۔ان کے دیوان میں سات قصائد،متعدد قطعات اور باقی تمام غزلیات ہیں۔شیفتہ کے قصائد امراوملوک کی مدح کی بجائے سرور کائنات کی نعت اور حضرت علی کی منقبت میں ہیں۔مثلاً شیفتہ کا ایک قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے:

دوش کآن رشك ماہ کنعانی ہمچو خور کرد پرتو افشانی
بحر جود و کرم علی کہ کفش در فشاند چو ابر نیسانی [۶]

شیفتہ کی غزلوں میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے اور یہ ان کے بہت سے اشعار سے ظاہر ہے:

دور نبود اگر آن مرد سبکتاز رسد کہ سر آمد رہ و پنداشت کہ آغازی ہست
کار ہمت نہ بہ اندازۂ طاقت باشد مرغ بسمل شدہ را ہم سر پروازی ہست [۷]

عبداللہ خان علوی بھی اس عہد کے ایک اہم شاعر تھے۔وہ اتر پردیش کے ضلع قایم گنج میں پیدا ہوئے لیکن مدت دراز تک دہلی میں مقیم رہے۔جب وہ شمس آباد پہونچے تو رئیس شمس آباد میرزا نوب دولھا کے رفیق ہوئے اور شمس آباد میں ہی ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی [۸]۔غالب نے علوی کی شاعرانہ صلاحیت کا اعتراف کیا ہے۔غالب کے درج ذیل اشعار میں علوی کا ذکر یوں آیا ہے:

ہمہ را خوش نفسانند سخنور کہ بود باد در خلوت شان مشك فشان از دم شان
مومن و نیر و صہبائی وعلوی وآنگاہ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جان گرچہ نیرزد بشمار ہست در بزم سخن ہمنفس و ہمدم شان

علوی نے غزل،قصیدہ،مثنوی اور رباعی سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔مختلف تذکروں میں ان کا فارسی اور

اردو کلام ملتا ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شب ھجرت چہ دانی با دل مضطر کہ چون کردم
فشردم آن قدر در سینۂ تنگش کہ خون کردم
اشکم رود از دیدہ و مقدار نداند
این نو قدم اندازۂ رفتار نداند
گر جیب نماند است بزنجیر درآویز
آن کس کہ کسی بیند و بیکار نداند
علوی خیر طلب قابل بیداد نبود
آنکہ آباد تو می خواست خرابش کردی [9]

میرزا مہدی متخلص بہ مجرم کشمیری (متوفی ۱۸۵۶ء) کشمیر کے فارسی زبان کے سربرآوردہ شعرا میں سے ایک تھا۔مجرم نے غزل،مثنوی اور رباعیات کہی ہیں۔اس کا ایک ضخیم کلیات موجود ہے جو غالباً اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا ہے۔مجرم کے کلام کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک باذوق شاعر تھا۔ذیل میں اس کی غزلیات کے چند اشعار نقل کئے جارہے ہیں جن سے غزل گوئی میں اس کی مہارت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے:

شمعم کہ بھر محفل می سوزم و می سازم نم از مژہ غم در دل اندوزم و اندازم
از نرگس فتانت مخمورم و مفتونم با سنبل پیچانت ھمروزم و ھمرازم [10]

صاحب تذکرۂ نتائج الافکار محمد قدرت اللہ قدرت بھی انیسویں صدی کے فارسی شعرا میں اہم مقام کے حامل ہیں۔قدرت ۱۷۸۴ء میں خطۂ اودھ کے قدیم قصبہ گوپامئو میں پیدا ہوئے۔شعروسخن اور فن عروض کی تعلیم وتربیت احمد مجتبیٰ متخلص بہ خوشدل گوپاموی سے حاصل کی۔قدرت فارسی کے صاحب دیوان شاعر ہیں۔اس کے علاوہ ایک مثنوی 'گلزار عشرت' بھی ان کے نام منسوب ہے۔ان کی شاعری ایک بلند معیار کی شاعری ہے۔ان کی غزلوں میں نکتہ سنجی،معنی آفرینی، اور تغزل کا خالص آہنگ نظر آتا ہے،مثلاً یہ ابیات:

قند شیرین یا لب دلدار یا گفتار من لالہ خوش یا عارضش یا سینۂ افگار من
شب سیہ تر یا دو زلف عنبرین یا بخت من برق خوش یا جلوہ ات یا آہ آتشبار من

قدرت کے دیوان کے مختلف نسخے ہندوستان کی مختلف لائبریریز میں موجود ہیں۔قدرت نے نتائج الافکار کے نام سے فارسی شعرا کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیا ہے،جس کا ذکر آگے آئے گا۔

انیسویں صدی کے نیمۂ دوم میں ایک اور اہم شخصیت نظر آتی ہے جس نے فارسی زبان وادب کی خدمت میں گرانمایہ کارنامہ انجام دیا اور اس شخصیت کا نام ہے خواجہ الطاف حسین حالی۔ حالی کو شاعری سے طبعی مناسبت تھی۔ لیکن جب وہ دہلی پہونچے تو اس وقت دہلی میں بڑے بڑے صاحب کمال موجود تھے۔ غالب، آزردہ، صہبائی، شیفتہ جیسے یکتائے روزگار کی وجہ سے دہلی گہوارۂ علم وادب بنی ہوئی تھی اور شعروادب کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ حالی کی ان محفلوں میں شرکت سے ان کا شعری ذوق اور بلند ہوا اور پھر غالب جیسے باکمال استاد کی شاگردی اختیار کی۔ غالب کے یہ کلمات حالی کی شاعرانہ طبیعت کے شاہد ہیں:

''اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے''[۱۱]

حالی کا فارسی کلام شاعری کی ہر صنف سے مزین ہے۔ انہوں نے قصیدہ، رباعی، مرثیہ اور غزل ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور کامیاب بھی رہے۔ حالی نے قصائد میں ایک طرز نو کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے مبالغہ آرائی کو ترک کر کے اس کے اصل موضوع مدح اور ہجو کی طرف بیشتر توجہ کی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے قصیدے کی عام روش سے ہٹ کر قصیدہ کی دنیا کو اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور اسے قومی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ مثلا ان کے قصیدے کے یہ اشعار:

بحمد اللّٰہ کہ من مداح آن سرچشمۂ فضلم
کہ در فضل و کمالش ہرچہ گویم باشدش زیبا
بنرمی کز سخن سنجان حدیثی درمیان افتد
سخن بر خویشتن بالد کہ ما از شاہ و شاہ از ما

اسی طرح ان کی غزلوں میں عشقیہ مضامین کے ساتھ ساتھ معاشرتی، اصلاحی اور اخلاقی مضامین بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

در گلستان بلبل و در انجمن پروانہ ام — من بہ ہرجا محو نیرنگ رخ جانانہ ام
محرمیت نیست دل را با ہزاران قرب دوست — یار گرم آشنایی ہا و من بیگانہ ام

اس کے علاوہ اس عہد کے شعرا میں دیری کشمیری، آزاد جہانگیر نگری، مرزا سعدالدین سعد، حمید کشمیری، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

انیسویں صدی میں فارسی شعرا، صوفیا، علما اور ادبا کے تذکرے بھی کثیر تعداد میں لکھے گئے۔ 'ریاض الوفاق'

تالیف ذوالفقار علیخان مست، 'نتائج الافکار' تالیف قدرت اللہ خان گوپاموی، 'آفتاب عالمتاب' تالیف قاضی محمد صادق اختر، 'عقد ثریا' تالیف غلام ہمدانی مصحفی، 'نشتر عشق' تالیف آقا محمد قلیخان، 'تذکرۃ الکرام' تالیف محمد ابوالحیات قادری، 'شمع انجمن' تالیف نواب صدیق حسن خان، 'صبح گلشن' تالیف علی حسن خان، 'روز روشن' تالیف مظفر حسین صبا وغیرہ اس عہد میں تالیف ہونے والے اہم تذکرے ہیں۔ ذیل میں ہم آفتاب عالمتاب اور ریاض الوفاق کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کریں گے۔

تذکرہ 'آفتاب عالمتاب' قاضی محمد صادق اختر کی ایک اہم تالیف ہے۔ قاضی محمد صادق اختر اپنے زمانے کے مشہور عالم اور ادیب تھے۔ وہ ۱۳۰۲ھ میں بمقام ہگلی پیدا ہوئے، لیکن اپنی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گذارا اور محمد علی شاہ و امجد علی شاہ وغیرہ کے دربار سے منسلک رہے۔ 'آفتاب عالمتاب' ایک ضخیم تذکرہ ہے جو چار ہزار سے زائد فارسی و اردو شعرا کے احوال پر مشتمل ہے۔ اختر نے اس تذکرہ کو ۱۸۵۲ء میں مکمل کیا۔ مولف نے تذکرہ کے آغاز میں ایک مفصل اور عالمانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں سخن کی فضیلت اور شاعری سے متعلق اپنے نظریہ کا اظہار کیا ہے۔ اس تذکرہ کا وہ حصہ خاص طور پر اہم ہے جس میں مولف نے معاصر شعرا کا ذکر کیا ہے۔ تذکرہ 'شمع انجمن'، 'صبح گلشن' اور 'روز روشن' کے مولفین نے اپنے تذکرہ کو ترتیب دیتے وقت اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ اس تذکرہ کا منحصر بفرد نسخہ شمس آباد میں پروفیسر آزرمیدخت صفوی کے جد اعلی کے ذاتی کتابخانے کی زینت ہے۔ ابھی چند سال پہلے محترمہ کی کوشش سے ایک مفصل اور مبسوط مقدمہ کے ساتھ ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی نے اس کا چاپ عکسی شائع کیا ہے۔

'ریاض الوفاق' مولفہ ذوالفقار علی خان مست ۱۲ویں اور ۱۳ویں صدی ہجری کے ان ہندوستانی فارسی اور اردو شعرا کا تذکرہ ہے جو مولف کے معاصر تھے۔ چونکہ مولف کا زیادہ تر قیام بنارس اور کلکتہ میں رہا لہذا بنارس اور کلکتہ کے شعرا کی طرف ان کی زیادہ توجہ رہی ہے۔ اس تذکرہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تالیف کے وقت مولف کے پیش نظر کوئی اور تذکرہ نہیں تھا بلکہ اس نے خود براہ راست ان شعرا کے احوال تلاش کر کے جمع کئے۔ اس کے علاوہ متعدد شعرا ان کے احباب میں سے تھے اور بہتوں سے خود ان کی شناسائی تھی۔

'ریاض الوفاق' ۱۲۲۹ھ/۱۴-۱۸۱۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ یہ تذکرہ ایران اور ہندوستان سے شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں ڈاکٹر سید حسن، پٹنہ یونیورسٹی نے اسے شائع کیا ہے، جب کہ ایران سے ڈاکٹر عبدالرسول خیام نے اس کی اشاعت کا کام انجام دیا ہے۔

اس عہد میں تصنیف ہونے والا ایک اور اہم تذکرہ عبرتی عظیم آبادی کا تذکرہ 'ریاض الافکار' ہے جسے مولف نے ۱۸۵۱ء میں ترتیب دیا۔ 'ریاض الافکار' فارسی نثر نگاروں کا تذکرہ ہے جس میں عبرتی نے ایک سو سے زائد نثر نویسوں کے

احوال قلمبند کئے ہیں۔

'شمع انجمن' مولفہ نواب صدیق حسن خاں بھی فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ ہے جس میں مولف نے الفبائی ترتیب سے ۹۷۸ متقدمین ومعاصر شعرا کا ذکر کیا ہے۔

اس کے علاوہ تذکرہ 'صبح گلشن' مولفہ علی حسن خان جو ۱۲۹۴ھ میں تالیف ہوا۔ یہ تذکرہ بھی متقدمین شعرا اور مولف کے معاصر شعرا کے احوال پر مشتمل ہے۔ مولف، نواب صدیق حسن خان مولف تذکرہ شمع انجمن کا فرزند تھا۔ اس تذکرہ کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے مولف نے لکھا ہے کہ شعرا کا وہ گروہ جن کا نام تذکرہ شمع انجمن میں شامل نہیں ہو پایا تھا وہ اس امر سے رنجیدہ خاطر تھے لہذا انہوں اس تذکرہ کی تالیف کا ارادہ کیا۔

تذکرہ 'نتائج الافکار' مولفہ قدرت اللہ گویاموی (۱۱۹۹-۱۲۸۱) بھی اس عہد میں تالیف ہونے والا ایک اہم تذکرہ ہے جو ۱۲۵۸ھ میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ یہ تذکرہ بقول مولف ۵۳۹ شعرائے متقدمین ومتاخرین کے تراجم احوال پر مشتمل ہے اور میر الٰہی ہمدانی کے ذکر سے شروع ہوکر میر یوسف بلگرامی پر ختم ہوتا ہے۔ لیکن تذکرہ نتائج الافکار جو یوسف بیگ کی کوشش سے مجمع ذخائر اسلامی قم سے ۲۰۰۸م میں شائع ہوا ہے اس کے متن میں شعرا کی تعداد ۵۲۸ ہے۔

تذکرہ 'روز روشن' ۲۴۱۰ شعرا کے تراجم احوال پر مشتمل ایک اہم تذکرہ ہے جسے مظفر حسین صبا نے ۱۲۹۶ھ میں مکمل کیا۔ اس تذکرہ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے فارسی زبان کے ان شعرا کے احوال پر مشتمل ہے جن کا ذکر ایران میں تالف شدہ تذکروں میں نہیں ملتا۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ انیسویں صدی میں فارسی شاعری سے قطع نظر علمی زبان فارسی ہی تھی لہذا اس عہد میں اردو شعرا کے تذکرے بھی فارسی زبان میں لکھے گئے۔ ایسے تذکروں میں 'مجموعہ نغز' مولفہ حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ متخلص بہ قاسم، تذکرہ 'گلشن بے خار' تالیف مصطفے خان شیفتہ، 'سخن شعرا' مولفہ عبدالغفور خان نساخ، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مجموعہ نغز؛ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۷ء میں مکمل ہوا اور ۶۹۳ ریختہ نگاروں کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس کے مولف ابوالقاسم عرف میر قدرت اللہ قادری متخلص بہ قاسم ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہوا یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے جس میں نثر سادہ وعاری کو مرجز ومقفی کے ساتھ آمیز کیا گیا ہے[۱۲]۔

'گلشن بے خار' نواب مصطفے خان شیفتہ کی مایہ ناز تخلیق ہے جو ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں مکمل ہوئی۔ اس تذکرہ میں شیفتہ نے فارسی زبان میں اردو کے اہم شعرا کے احوال قلمبند کئے ہیں اور ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ اس تذکرہ کی اہمیت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس عہد میں لکھے گئے دوسرے تذکروں کے برخلاف شیفتہ نے نہ صرف شعرا کے احوال درج کئے ہیں بلکہ ان کے کلام پر آزادانہ تنقید بھی کی ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں تذکرہ نویسی

کی بنیاد میر کے 'نکات الشعرا' اور شیفتہ کے 'گلشن بے خار' کے ذریعہ ہی پڑی۔ اس کے علاوہ کتاب کے اخیر میں جو اس عہد کے ماہرین فن مومن، آزردہ، علوی اور غالب کی تقریظیں درج ہیں وہ درحقیقت فارسی انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں تاریخ کی متعدد کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئیں۔ ان میں ہندوستان کی تاریخیں، دنیا کی عمومی تاریخیں، علاقائی تاریخیں اور بعض حکمراں خاندانوں کی تاریخیں شامل ہیں۔ زبدۃ الاخبار تالیف غلام محی الدین قادری، مرآۃ الاحوال جہان نما تالیف احمد بن محمد باقر اصفہانی معروف بہ بہبہانی، فراست نامہ تالیف دین محمد، عبرت نامہ تالیف مفتی علی الدین لاہوری، مخزن الجواہر تالیف قاضی محمد صادق اختر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں ہم مرآۃ الاحوال جہان نما، فراست نامہ اور زبدۃ الاخبار کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کریں گے۔

مرآۃ الاحوال جہان نما احمد بہبہانی کی ایک اہم تاریخ ہے۔ بہبہانی انیسویں صدی کے دانشمندوں میں سے تھا۔ اس نے اپنی اس تصنیف کو اپنے سفر ہند ۱۲۲۰-۱۲۲۵ھ کے درمیان ہندوستان میں لکھی۔ بہبہانی نے اس میں ہندوستان کی معاصر سیاسی، سماجی وثقافتی تاریخ لکھی ہے۔ مولف جب ہندوستان آیا تو پہلے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کیا اور پھر عظیم آباد میں سکونت اختیار کی۔ ہندوستان کے تعلق سے اس نے بڑی جالب اطلاعات اپنی اس تصنیف میں فراہم کی ہیں ۔مثلاً عظیم آباد کے تعلق سے ایک جگہ اس نے لکھا ہے:

" شهری است فقرا پرور و نهایت رنگین و خوش آب و هوا، و انواع ملبوس و ماکول در آن مبتذل است که از آنجا به اطراف و نواحی وی برند و در حدود بنگاله بلکه هند، شهری به جامعیت آن کم است و اگر جنت الهندش بنامند روا ست"۔[۱۳]

فراست نامہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس عہد کی ایک ممتاز تصنیف ہے۔ اس کا مولف دین محمد ہے۔ مولف نے فراست نامہ میں انیسویں صدی کے سیاسی وسماجی احوال پر سخت تنقید کی ہے۔ فراست نامہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ای خرد بخش بندۂ خاکی — خاك را دادی از خرد پاکی
آفریدی تو عقل را اول — گشت از هر چه هست عقل افضل
عقل سرمایۂ خدا دانی است — عقل زیب لباس انسانی است
عقل شد گوهر فروزنده — آدمی راست عقل زیبنده

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"بحریست در کوزه گنجیده و گنجیست در خرابه آسوده، جز شاهان

خریداری ندارد و گدایان را به او سر و کاری نباشد۔ اگر سروران دوران
اورا حرز بازوی دولت سازند روا ست و اگر صاحب ریاستان با
حشمت چون جان در برش دارند بجا ست:

من کہ در تصنیف آن پرداختم لایق شاهان دوران ساختم
پیش دانا می کنم توصیف او زانکہ آمد طرح نو تصنیف او
طالب انعام از کس نیستم شکر حق خاك رهم خس نیستم

"فراست مند آنکه هر کار را به مشاورت عقلا از قوه به فعل آرد تا
دیگران نیز در صواب و خطای کارش مشترك باشند. بعضی امورات
چنانست که اگر امیری به فعل کامل خود کاری را بخوبی انتظام و
اختتام یافته و حسب دلخواه انجام پذیرفته کار برادران دیگر که همیشه
شریك کارهای او بوده اند از کمال حسد آن کار را نه پسندند و گویند
که در اصل این کار قصور و فتور واقع شده...."[۱۴]

غلام محی الدین کی تصنیف زبدۃ الاخبار، انبیا، خلفا، مشاہیر، حکما وشعرا کی تاریخ ہے اور تین مقاصد اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ خود مولف کی تحریر سے اس کتاب کے محتویات ومشتملات اور شیوۂ بیان پر روشنی پڑتی ہے۔ مولف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

"این انتخاب از نخبۂ اخبار و خلاصۂ آثاریست که بطون کتب و متون
صحف سیر و تواریخ به مضامین آن مشحون است و فواید آن به طریق
ایجاز واختصار بل بر سبیل اشارت و کنایت استنباط نموده .....و
خلاصۂ وقایع انبیا و رسل و نبی هادی السبل حضرت محمد صلی اللّٰه
علیه وسلم ، خلفای راشدین و احوال تابعین در حیطۂ تحریر و بیان
آورده". [۱۵]

جیسا کہ ذکر ہوا، زبدۃ الاخبار تین مقاصد اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ خاتمہ میں مولف نے مشاہیر حکما اور شعرا کے ضمن میں حکیم فیثا غورس، سقراط، افلاطون، ارسطو، حکیم جالینوس، عربی زبان کے مشہور شاعروں میں لبید، فرزدق اور حریری، فارسی شعرا میں اسدی طوسی، عسجدی، عنصری، فرخی، فردوسی، خاقانی، انوری، عطار، مولانا روم، حافظ، امیر خسرو،

حسن دہلوی، وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ہرمس حکیم کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"اما هرمس حکیم از شاگردان ادریس علیه السلام است. در مسافرت مصاحبت وی اختیار کرده شرائط خدمت بجا آوردی ....چون حضرت ادریس از زمین هند مراجعت نموده به خطهٔ فارس رسید اورا بجهت تبیین امور شرعی و قواعد دینی به بابل فرستاد ....از سخنان اوست عالم بی عمل و عابد بی معرفت شبیه به نهر و آسیا ست که شب و روز در تعب دوران سرگردانست و نمی داند که چه حال دارد" ۱۶۔

اس کے علاوہ تاریخ کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں مرآۃ گیتی نما تالیف کریم خان جھجری، سراج التواریخ، جامع التواریخ وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اس عہد میں لغت نویسی کی جانب بھی خاص توجہ دی گئی۔ غیاث اللغات تالیف محمد غیاث الدین رامپوری، (سال تالیف ۱۲۴۲ھ) قاطع برہان تالیف غالب دہلوی، تالیف نواب غازی الدین حیدر، بہار عجم تالیف ٹیک چند بہار، نفایس اللغات وغیرہ وہ فرہنگیں ہیں جو انیسویں صدی میں لکھی گئیں۔

'برہان قاطع' محمد حسین بن خلف تبریزی متخلص بہ برہان کی ۱۱۲۲ھ/۱۶۵۲ء میں مرتب کی گئی ایک ضخیم لغت ہے۔ لیکن اسے شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب غالب دہلوی نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا۔ انیسویں صدی کا سب سے بڑا علمی وادبی معرکہ برہان قاطع ہی سے متعلق ہے جس کے نتیجے میں غالب کی 'قاطع برہان' منصۂ شہود پر آئی۔

فارسی ادب میں تنقید نگاری میں حالی کی شخصیت ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ حالی نے فارسی تنقید نگاری کو ایک نئی روش سے روشناس کرایا۔ حالی نے مغربی تنقید کے زیر اثر معانی وخیال کو اہمیت دی۔ ان کی نظر میں صرف عروض و قافیہ شاعری کے لئے ضروری نہیں بلکہ انہوں نے سادگی، اصلیت اور جوش کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا۔ ان کی تصنیفات حیات سعدی اور یادگار غالب جو سوانح عمریاں کہلاتی ہیں ان میں تنقید کا پہلو زیادہ ہے۔

منابع وحواشی:

۱- دیوان مومن (فارسی) نسخۂ خطی، ذخیرۂ شیفتہ، مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ

۲- ایضا

۳- کلیات صہبائی (دیباچہ)، بکوشش عبدالرحمٰن، مطبع نظامی کانپور، ۱۲۹۸ھ
۴- دیوان صہبائی، شامل کلیات، مطبع نظامی کانپور، ۱۲۹۸ھ
۵- تضمین گلستان، تفتہ، ص۱۰
۶- دیوان شیفتہ، ص۴۷
۷- دیوان شیفتہ، ص۷۹-۷۸
۸- شمع انجمن، نواب محمد صدیق خان، مطبع شاہجہانی بھوپال، ص۳۰۲-۳۱۸
۹- ایضا
۱۰- مجرم کشمیری
۱۱- مسدس حالی، الطاف حسین حالی، مسلم یونیورسٹی پریس، علیگڑھ، ۱۹۲۸، ص۹
۱۲- مجموعۂ نغز، ابوالقاسم میر قدرت اللہ، مرتبہ محمود شیرانی، نیشنل اکاڈمی، دریا گنج، دہلی، ۱۹۷۳، دیباچہ
۱۳- مرآۃ الاحوال جہان نما، احمد بیہبانی، بکوشش علی دوانی نشر مرکز فرہنگی قبلہ، ۱۳۷۲، ص۲۷۹
۱۴- فراست نامہ، دین محمد (نسخہ خطی)، عبدالسلام کلکشن، مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ، ورق۱۰۳الف
۱۵- زبدۃ الاخبار، غلام محی الدین (نسخہ خطی)، عبدالسلام کلکشن، مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ، مقدمہ
۱۶- ایضا، ورق۹۵الف

☆☆☆

ڈاکٹر واحد احمد شیخ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
کشمیر یونیورسٹی، کشمیر

عورت : فروغِ زمان فرخزاد کی شاعری میں

جدید فارسی شاعری کا باقاعدہ آغاز نیما یوشیج سے ہی ہوا ہے۔انہوں نے روایتی شاعری، کلاسیکی شاعری اور قدامت پرستوں کو ہی اپنی شاعری کا نشانہ بنایا۔وہ پہلا شاعر ہے جس نے قافیہ، ردیف اور مروج عروض سے فارسی شاعری کو آزاد کیا اور اپنے اوزان کی بنیاد داخل موسیقی پر رکھی اور نئے نئے رشتے دریافت کئے انہی عناصر کے مزید پہلو کو فریدون توللّی اور مہدی اخوان ثالث نے اُجاگر کیا۔اسی دور کے ایک اور شاعر احمد شاملو کے نام سے گذرے ہیں جنہوں نے شاعری کو وزن سے بھی آزاد کیا یعنی نیما یوشیج کے آھنگ کو ترک کیا۔

چونکہ سہراب سپہری مصور ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو اور فلسفے سے متاصر تھا اسی وجہ سے اس کے مسائل فلسفیانہ بھی زیادہ ہیں۔اس کے بعد نادر نادر پور پھر سے قافیہ کو اپنی شاعری میں استعمال کیا اور ذاتی آھنگ اور مشاھدات کے بنا پر بھی اس نے قدیم شاعری سے ہی استفادہ کیا۔اسی طرح بہت جدید سارے شعراء گذرے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں لوگوں کے اجتماعی مسائل، روز بروز کے مسائل، قومی اور سماجی مسائل واضح طور پر بیان کئے ہیں اور موضوع کو ہی اپنے کلام کا مقصد بنایا ہے۔اور انہوں نے روایتی شاعری سے پیچیدگی اور دشواریاں نکل کر سادہ اشعار قلم بند کئے۔شعرنو (جدید شاعری) کے بانی نیما یوشیج کے مطابق جدید شاعری کیلئے وزن اور قافیہ لازم نہیں ہیں بلکہ مضمون (عنوان) بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔سب سے پہلے روایتی شاعری سے انحراف کیا اور بیسوی صدی ہجری کی معروف ترین شاعر بن گئے۔ [۱]
فرخزاد نے اپنی مختصر سی زندگی میں فرانس، جرمن، اٹلی اور انگلینڈ سفر کئے اور وہاں کے نامور ادیبوں کی تخلیقات سے استفادہ کیا۔ [۲]

فرخزاد ایک نہایت مہربان اور سلیقہ مند عورت تھی، ظاہرداری اور ریاکاری سے اسے سخت نفرت تھی، فنون لطیفہ کے بھی بہت شوقین رہی۔ادب، شاعری، مصّوری اور فلم سازی میں بھی گہری دلچسپی تھی۔ایرانی معاشرہ کی اصلاح اور حقوق نسواں کی پاسداری اس کا خاص مقصد تھا۔ [۳]

اسیر، دیوار اور عصیان فرخزاد کے پہلے مجموعہ ھای کلام ہیں ان مجموعہ کے اشعار زبانہ، سرکشی اور رومانٹک ہیں جو

بحث انگیز ہیں وہ صرف گناہ کی طرف راغب تھی۔اس کے بعد اپنے معاصر ادیبوں اور دوستوں کے افکار و خیالات کی پیروی کی۔اُن کو یقین تھا کہ'' شعری زندگی بوجود می آید وشاعر باید زندگی شاعرانه داشته باشد''

فرخزاد نے لکھا ہے کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ''اسیر، دیوار اور عصیان'' جیسی کتابیں لکھی کیونکہ میں نے ان کتابوں میں بیرونی دنیا کو بیان کیا ہے۔اُس زمانے میں شعر میرے اندر تحلیل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ شوہر، معشوق اور آدمیوں کی طرح تھوڑی مدت کیلئے میرے گھر میں رہتے تھے۔ ۴

فرخزاد نے آخری عمر میں ایک دوسرا دیوان تصنیف کیا، جو''تولدی دیگر'' کے نام سے شائع ہوا۔اس دیوان میں شامل تمام اشعار اجتماعی وانتقادی اہمیت کے حامل ہیں دراصل یہ دیوان فرخزاد کی شخصیت اور افکار کا آئینہ دار ہے۔ ۵

مذکورہ دیوان میں وہ فلسفہ تجدید حیات کو لئے ہوئے منظر عام پر آئی ہے اس نے عاشقانہ کلام کے ساتھ ساتھ معاشرہ پر سخت تنقید کی ہے۔فرخزاد بڑی حساس طبیعت کی تھی اسی دلیری اور بے باکی کی وجہ سے اس کا نام زبانوں پہ آنے لگا۔'' تولدی دیگر'' میں فرخزاد نے یوں بیان کیا ہے ۔

'' همه چیز را با دیدی روشنگرانه می بیند ۔اندیشه اش داری جسم است ودیگر به خود وبه تن خود نمی اندیشد بلکه به چیزی وسیع تر فکر می کند ، به اجتماع به زندگی به هستی وبه انسان ''

همسایه روی سایه ای خم شد
درنهانگاه راز پرور شب
نفسی روی گونه ای لغزید
بوسه ای شعله زد میان دو لب ۶

فرخزاد کے مجموعہ ھای دیوان میں جو باتیں ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کراتی ہیں وہ اس کا شعری جوہر اور اس کی نمایش ہے جو ایک مخصوص روح کی حامل ہیں۔اس کے بعض اجتماعی تخلیق مثلاً''عروسک کودکی''''دیدار در شب''اور'' غروبی ابدی''وغیرہ،فرخزاد نے ان میں اشعاراتی اور کنایاتی طور پر گفتگو کی ہے۔

فرخزاد کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ کہ اس میں ایک قابل دید نکتہ''استقلال دید'اور'شخصی تجربہ'' ہے اور اپنے کلام میں مورد نیاز کلموں اور ترکیبوں کے آزادانہ استعمال کے وسیلہ سے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ مردوں کے ناھموار زندگی پر پڑے ہوئے پردوں کو چاک چاک کر ڈال دئے۔

"فرخزاد در عرفان در عشق در نفرت وحتی در طنز همیشه به این آگاهی مجهز است وعین آگاهی است که خامی را قابل بخشش می کند"۔ ۷۔

خانم فرخزآد نے معنی مرگ کے ضمن میں یوں لکھا ہے" کار ہنری یکجو رتلاش است برای باقی ماندن وباقی گذاشتن خود ونفی معنی مرگ ۔

من ،من که هیچگاه	جزباد بادکئی سبك ودلگرد
برپشت بامهای مه آلود آسمان	چیزی نبوده ام
در عشق ومیل ونفرت ودردم را	در غربت شبانه ی گورستان

موشی بنام "مرگ" جویده است ۸۔

وزن کے اعتبار سے بھی فرخزآد کا کلام معاصر ادیبوں کی بہ نسبت موردالزام قرار نہیں پاتا ہے وزن وقوافی کی بندش سے آزاد اس کے معاصر شاعروں کا کلام جس تشت وانتشار کا شکار ہے اور جس طرح موردالزام ہے ۔فرخزآد کا کلام اس سے یکسر پاک اور بُری ہے۔فرخزآد کے معاصر جدید شاعروں کے کلام میں غنائیت اور موسیقی بالکل نہیں ہے جب کہ فرخزآد کا کلام اس صفت سے متصف ہے فرخزآد کی فارسی تصنیفات کی اہم ترین خدمات درجہ ذیل ہیں:

اسیر،دیوار،عصیان ،تولدی دیگر،ایمان بیآوریم،برگزیدۂ اشعار اور گزیئنہ اشعار۔فرخزآد جدید فارسی کی عشقیہ شاعری میں ایک نئے جوش وجذبے کے ساتھ وارد ہوئی پہلے اُن کے کلام سے پورا فارسی ادب پریشان ہوکر رہ گیا۔باقی ادیبوں کے ذہن میں یہ بات گونج رہی تھی کہ ایک مشرقی عورت اتنی بے باکی اور بے حجابی سے اپنے مخصوص جذبات وافکار کا اظہار کرسکتی ہے ان ادیبوں نے فرخزآد کو اخلاق اور تہذیب کے نام پرغم وغصے کا اظہار کیا۔

لیکن اسکے باوجود بھی فرخزآد خاموش نہ رہی اور اُن کو اس بہادرانہ انداز میں کہا کہ اگر مرد اس قسم کی شاعری کرتا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں،لیکن جب کوئی عورت اپنی روح کا عکس پیش کرنا چاہتی ہے تو ایک کہرام مچ جاتا ہے اور تمام لوگ اخلاق اور عفت کی تباہی کا ماتم کرنے لگتے ہیں ۔غرض یہ اُس جدید ایرانی عورت کی آواز تھی جس نے خود کو بہت سی معاشرتی اور سماجی زنجیروں سے آزاد کرلیا تھا اور مردوں سے برابری کا خواہاں تھی۔

فرخزآد نے اپنی شاعری میں براہ راستہ حواس کا موضوع اُجاگر کیا ہے جبکہ فکر وخیال سے اُس کا کوئی غرض نہیں،عشق حقیقی میں غوطہ زن ہونے کے بجائے اس نے خالص ارضی وجسمانی عشق کی پیروی کی ،چونکہ عشق حقیقی مادیت کے بجائے روحانیت پر ترجیع دیتا ہے اور اس لحاظ سے وہ اپنے اظہار کے راستے میں نفسیاتی بندشوں اور رکاوٹوں کو آزاد نہیں

رکھ سکتا۔

فرخزاد کی زندگی میں ایک ایسا مقام آیا کہ اُس نے اس فنکارانہ شعور کو ترک کر دیا اور اس نے ایک نظم ''در برابر خدا'' لکھی جس میں اس نے خدا کی بارگاہ میں اپنے تمام گناہوں کی معافی طلب کی۔ چونکہ خود اس نظم میں فرماتی ہے ؎

تنها تو قادری که ببخشائی بر روح من صفای نخستین را
آه ای خدا که دست توانائیت بنیان نهاده عالم هستی را
بنمائی روی واز دل من بستان شوق گناه ونفس پرستی را
راضی مشو که بنده نا چیزی عاصی شود بغیر تو روی آرد
راضی مشو که سیل سرشکش را دریای جام باده فرو بارد (۹)

(یعنی تو اکیلا قدرت رکھنے والا ہے اور میرے حال پر رحم کر۔ میری روح پر اور میرے دل کو پہلے کی طرح صاف بنا دے۔

آہ اے خدا! میں کس طرح کہوں کہ میں اپنے خستہ جسم سے بیزار میں ہر رات تیرے آستاں میں حسرت اور مایوسی کے ساتھ یہ اُمید کرتی ہوں کہ تو مجھے دوسرا جسم عطا کر جس کی مجھے اُمید ہے۔ میری روشن آنکھوں سے لے جاؤ۔ وہ شوق دوسروں کی طرف دوڑائے۔

اے خدا مجھ جیسے ناچیز بندہ پر راضی مت ہو جا کہ میں گناہ گار بنوں اسکے بغیر تیرا روئے انوار دیکھوں؟ اے خدا مجھے راضی مت ہو جا و میرے دل میں سیلاب ہے۔ آنسوں کا اور پاؤں کے نیچے شراب کی پیالی موجود ہے) ۱۰

فرخزاد کے کلام کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ قاری کو شاعر کے فن اور اس کے احساسات و افکار ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے۔ چند اشعار نظم ''رمیدہ'' سے انتخاب کئے گئے ہیں، ملاحظہ فرمائے ؎

نمی دانم چه می خواهم خدایا بدنبال چه میگویم شب وروز
چه می جوید نگاه خسته من چرا افسرده است قلب مرموز ۱۱

راقم اُس مایۂ ناز شخصیت کے ایک مجموعہ جو ''تولدی دیگر'' کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ خانم فرخزاد نے ''تولدی دیگر'' یعنی دوسرا جنم سے پہلے ''اسیر، دیوار، گناہ، جفت، وغیرہ تصنیف کئے ہیں۔ جن میں وہ صرف اپنے جذبات، فکر و احساسات اور عشق دنیای پر زیادہ زور دیتی رہی کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر کیوں نہیں ہے۔

فرخزاد نے اپنی نظم 'گناہ (Sin)' میں یوں لکھا ہے ؎

گنہ کردم گناہی پُر زلذت در آغوشی کہ گرم و آتشین بود
گنہ کردم میان باز وانی کہ داغ و کینہ جوی واھنین بود ۱۲؎

I Sinned sin full of pleasure
in an embrace which was warm and fiery
I sinned surrounded by arms that were hot
and avenging and iron

لیکن اس کے بعد وہ شاعرہ توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور اپنے سارے گناہوں سے باز آتی ہے اور ''در برابر خدا'' کے نام سے نظم لکھ کر توبہ کیا ہے۔ اور ''تولدی دیگر'' یعنی ''دوسرا جنم'' کے نام سے ایک ''مجموعہ'' لکھا۔ جس میں لکھتی ہے کہ جو بھی میری ابھی تک کی زندگی تھی وہ غفلت کے اندھیرے میں گذری چونکہ یہ ساری دنیا تاریکی ہے شوہر سے طلاق لینے کے بعد شوہر بچے کو اپنے ساتھ لے گیا تھا ''تولدی دیگر'' میں فرخزاد اپنے فرزند اور شوہر سے مخاطب ہو کر فرماتی ہے کہ میری پوری زندگی بے نور اور تاریکی میں گذری میں زندگی کے ہر گوشہ میں تمہیں تلاش کرتی رہی اور کھلتے ہوئے پھولوں کی طرح تمہاری زندگی میں شامل ہوتہ رہی اور تنہائی میں صرف تمہیں یاد کرتی رہی، تا کہ اپنے اصلی وجود کو زندہ کر سکھوں۔ زندگی کا فلسفہ' کے بارے میں یوں فرماتی ہے۔

" زندگی شاید یك خیابان دراز ست کہ ہر روز زنی با زنبیلی از آن می گذرد۔
زندگی شاید ریسما نیست کہ مردی با آن خود را از شاخہ می آویزد۔
زندگی شاید طفلیست کہ از مدرسہ بر می گردد۔
زندگی شاید افروختن سیگاری باشد۔ ۱۳؎

شاعرہ کی نقطۂ نظر میں زندگی شاید ایک لمبا راستہ ہے جس پر ہر انسان اپنے رنج والم گرفتاری، مروت وشادمانی غرض ہر قسم کی کیفیت، ہرکات وسکنات لئے ہوئے رواں دواں ہے۔

یعنی شاعرہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ زندگی شاید وہ انسان ہے جو حیات کی رسی سے لٹکا ہوا ہے اور اس کے نیچے موت کا کنواں اس کے گرنے کے انتظار میں ہے۔ اور شاعرہ کی زندگی کا تیسرا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی شاید اس مسرت اور شادمانی کے لمحوں کا نام ہے جب ایک کمسن بچہ مدرسہ کے درس وتدریس سے فراغت کے بعد خوشی اور مسرت کے ساتھ اپنے گھر کی طرف لوٹتا ہے اس وقت جو بچے کے چہرے پر اطمنان اور خوشی نظر آتی ہے شاید وہی زندگی ہے۔ یا زندگی شاید ان بے پروا لمحوں کا نام ہے جب دو دوست آپس میں بیٹھ کر سگریٹ جلا کر لمبے لمبے کش کھینچ لیتے ہیں اور اپنے حوش وہواس

بھول جاتے ہیں۔زندگی شاید اُس ٹیڑھے میڑھے راستے کا نام ہے جو اس قدر پیچ خوردہ ہے کہ اُسکو طے کرتے ہوئے عقل فہم ،صبر، استقلال کی ٹوپی سر سے گر پڑتی ہے۔

مذکورہ شاعرہ حیات جاویدانی کے ضمن میں یوں فرماتی ہے ۔

و بدینسانست-- که کسی میرد--و کسی می ماند

هیچ صیادی در جوی حقیری که به گودالی می ریزد،

مرواریدی صید نخواهد کرد۔ ۱۴؎

چنانچہ ہر کوئی انسان اس دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے لیکن کوئی انسان انتقال کے بعد پیچھے ایسا سرمایہ چھوڑتا ہے یا نیکی چھوڑتا ہے کہ تمام لوگ اُسے ہمیشہ یاد کرتے ہیں اور اُس کو حیات ابدی حاصل ہو جاتی ہے اور کوئی مرد ایسا ہوتا ہے جن کے جانے کے بعد کوئی نام لیوا نہیں ہوتا ہے یعنی ''**کردن خویش آمدنت پیش**'' پہلے اس نے ''قیدی'' اور اس کے بعد' دیوار باغ' شعری تصنیف ہیں ان کی فارسی شاعری کا ترجمہ انگریزی میں شوہل ولپ نے کیا ہے۔وہ ایک فلم ساز اور ہدایت کار بھی تھی ان کی ایک فلم ''گھر سیاہ'' ہے کو بہت شہرت ملی تھی ۔۲۳ سال کی عمر میں ہی ایک سڑک حادثہ میں وفات ہوگئی ۔اپنی ایک نظم ''اسیر'' میں یوں بیان کرتی ہے۔

ترمی خواهم و دانم که هرگز به کام دل در آغوشت نگیرم

توئی آن آسمان صاف و روشن من این کنج قفس،مرغی اسیرم ۱۵؎

I want you ,yet i know that never

Can i embrace you to my heaters content

You are that clear and bright sky

I in this corner of the cage ,am a captive bird

ایک اور جگہ خواھر کے بارے میں یوں فرماتی ہے ۔

Sister rise up after your freedom,

why are you quite ?

Rise up because henceforth

You have to imbibe the blood of tyrannical men

Seek your rights ,sister

from those whose myraid tricks and schems

Keep you seated in a cornor of the house .

Rise up and uproot the roots of oppression .

Give comfort to your bleeding heart.

for the seak of your freedom,

Strive to change the law ,rise up.

دل من ای دل دیوانه من که می سوزی ازین بیگانگی ها

مکن دیگر زدست غیر فریاد خدا را بس کن این دیوانگی ها ۱۶؎

My heart,my crazy heart ,

you are burning with these alienations ,

don't it anymore ,

God forbid ,stop these madnesses

فرخزاد کی تمام تر شاعری عوام کیلئے اور عوام ہی سے متعلق ہے۔اُن کے کلام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ انسان اور انسانیت ایسے دو موضوع ہیں جو مختلف انداز سے ان کے کلام پر حاوی ہیں۔انسان سے ان کی محبت اور انسانیت سے اُن کا والہانہ عشق انہیں موجودہ زمانے کی انسانیت سوز روایت پر تنقید کرنے اور انہیں صراحت سے بیان کرنے پر آمادہ کرتے ہیں ؎

من درمیان توده ی سازنده ای قدم به عرصه ی

هستی نهاده ام

که گرچه نان ندارد ،اما بجای آن

میدان دید بازو وسعی دارد

که مرزهای فعلی جغرافیائی اش ۱۷؎

فرخزاد کی بیشتر شاعری،دردناک احساسات پر مشتمل ہے عام زندگی کی المناکیوں نے ان کے ذھن ودماغ کو شدت سے متاثر کیا تھا۔

براو ببخشائید براو که گاهگاه

پیوند دردناك وجودش را باآب های را کد
و حفرهای خالی،از یاد می برد وابلهانه می پندارد
که خلق زیستن دارد ۱۸؎

فرخزاد کا مذہب انسانیت ہے اور اُن کے مخاطب ساری دنیا کے لوگ، محبت بھرا دل، انسانیت پرست انسان اور فطرت کی حسن کاریوں کا شیدائی، موجودہ دور میں غیر امن پسندانہ رجحانات پر حیران اور فکر مند ہو جاتا ہے ؎

کسی به فکر گل ها نیست کسی به فکرهای نیست
کسی نمی خواهد باور کند که باغیچه دارد میمیرد
حیاط خانه ی ما تنهاست ، تمام روز
از پشت در صدای تکه تکه شدن می آید ۱۹؎

''پنجرہ'' نظم میں شاعر یوں فرماتی ہے ؎

یك پنجره برای دیدن یك پنجره برای شنیدن
یك پنجره که مثل حلقه چاهی در انتهای خود به قلب زمین می رسد
و باز می شود بسوی وسعت این مهربانی مکرر آبی رنگ۔ ۲۰؎

منابع و مآخذات:

۱۔(ادبیات جدید ایران، ڈاکٹر منظر امام، ناشر کتابستان، چندوارہ، مظفر پور بھار، ۱۹۹۶ء ص۔۱۳۴)
۲۔(ایضاً ص۔۱۳۴)
۳۔(ایضاً ،ص۔۱۳۴)
۴۔(ایرانی ادب از ڈاکٹر ظھور الدین احمد، چاپ مرکزی تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۳۷۵ش،ص۔۲۵۸)
۵۔(ادبیات جدید ایران از ڈاکٹر منظر امام، ناشر کتابستان، چندوارہ، مظفر پور بھار، ۱۹۹۶ء ص۔۱۳۵)
۶۔(ایرانی ادب از ڈاکٹر ظھور الدین احمد، چاپ مرکزی تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۳۷۵ش،ص۔۲۵۹)
۷۔(ہمآن مآخذ ،ص۔۲۵۸)
۸۔(ایرانی ادب ،ص۔۲۵۸)
۹۔کتاب درس فارسی (اردو ترجمہ) جلد دوم از پروفیسر شمس الدین۔ چاپ کشمیر بک ڈپو سرینگر کشمیر ۲۰۰۱ء، ص۔۱۰۲، ۱۰۳ اور ویکپیڈیا (آزاد دائرۃ المعارف: فرخزاد، ur.wikipedia.org)
۱۰۔(ادبیات جدید ایران، چاپ کتابستان نئی دہلی ۱۹۹۶ء، ص۔۱۳۸)

۱۱۔ویکیپیڈیا(آزاددائرۃالمعارف:فرخزاد، ur.wikipedia.org)و(سپیہ فروغ (دفترشعراسیر)انترنیت اپلیکیشن)

۱۲۔(حدیث نواز پروفیسر شمس الدین احمد، کپور برادرس بُک سلیز و پبلشرز،سرینگر کشمیر،ص۔۱۹۵)

۱۳۔(حدیث نواز پروفیسر شمس الدین احمد، کپور برادرس بُک سلیز و پبلشرز،سرینگر کشمیر،ص۔۲۰۵)

۱۴۔ حدیث نو، از پروفیسر شمس الدین احمد، کپور برادرس بُک سلیز و پبلشرز،سرینگر کشمیر،ص۔ ۲۰۷،۲۰۸)

۱۵۔اسیر ازفرخزاد، چاپ دی ماہ ۱۳۸۲ھ،تایپ توران ا۔قوچانی ، ص۔۱۴) و ویکیپیڈیا(آزاددائرۃالمعارف
فرخزاد،ur.wikipedia.org

۱۶۔ اسیر ازفرخزاد، چاپ دی ماہ ۱۳۸۲ھ،تایپ توران ا۔قوچانی ، ص۔۷،۸)

۱۷۔جدید فارسی شاعری (ایک مختصر جائزہ) از پروفیسر شریف حسین قاسمی، چاپ پریشن سوسائٹی لال کنواں،کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی،۱۱۰۰۰۶، ۱۹۷۷ء،ص۔۱۴۵

۱۸۔ہمان مآخذ،ص۔۱۴۶

۱۹۔ ہمان مآخذ،ص۔ ۱۴۷، حدیث نواز پروفیسر شمس الدین احمد، کپور برادرس بُک سلیز و پبلشرز،سرینگر کشمیر،ص۔۱۹۵)

۲۰۔ حدیث نو، از پروفیسر شمس الدین احمد، کپور برادرس بُک سلیز و پبلشرز،سرینگر کشمیر،ص۔۲۱۱)

☆☆☆

محمد سعد ظفر
ریسرچ اسکالر، سینٹر فار پرشین اینڈ سینٹرل ایسین سٹڈیز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی

حسنات العارفین کا خصوصی مطالعہ

محمد داراشکوہ ۱۰۲۴ھ مطابق ۱۶۱۵ء میں، خواجہ معین الدین چشتی کے شہر اجمیر کی مقدس سرزمین پر پیدا ہوا۔ اور ۲۲ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ مطابق ۱۶۵۹ء میں نظام الدین اولیاء کے شہر دہلی میں محض ۴۴ سال کی عمر میں اس مادی دنیا سے کوچ کر گیا۔ وہ تیموری دستور کے مطابق شاہجہاں کا ولی عہد مقرر ہوا تھا مگر اس سے پہلے کہ شاہجہاں اس دنیا سے رخت سفر باندھے اور داراشکوہ مالک تخت طاوس ہو، وہ کسی افواہ و بدگمانی کا شکار ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں شاہجہاں کے حصے میں قید و بند اور داراشکوہ کی قسمت میں درد و رنج آیا اور بالآخر نوبت قتل تک پہونچ گئی۔ اس کو ہمایوں کی قبر کے جوار میں دفن کیا گیا اور علم و ہنر، صلح و آشتی کا در ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔

وہ فارسی، عربی اور سنسکرت جیسی قدیم وثروتمند زبانوں کا ماہر، اسلامی اور ہندوئی علوم معقولہ ومنقولہ سے بہرہ ور، فن خطاطی ونقاشی میں ید طولانی رکھتا تھا۔ وہ فلسفہ اسلامی اور فلسفہ ہندوازم کا دانا اور اسلامی صوفیانہ عقائد اور علوم ویدانت میں چیرہ دست تھا۔ جس شد و مد کے ساتھ اس نے ہندوازم کے فلسفہ کو عالم اسلام میں متعارف کرایا اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ وہ چاہتا تھا کہ برادران وطن کے سناتن دھرم کو بھی تلاش حق کی نظر سے مطالعہ کیا جائے کیوں کہ اس کی نظر قرآن کی آیت ''لکل قوم ھاد'' پر تھی، اس لئے اس نے ہندوئں کی کتب کا مطالعہ شروع کیا اور جب اس کو ان کتب کے سمجھنے میں دشواری ہوئی تو اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ان کے فلسفے کو سمجھا۔ اس نے یہیں پر بس نہیں کیا بلکہ اپنیشد جیسی کتاب کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس نے بالآخر اس بات کا اقرار و اعلان کیا کہ اسلام اور ہندومت ایک ہی سرچشمہ کے دو دھارے ہیں، دیگر مذاہب کی طرح اس کی راہ ومنزل بھی ایک ہی ہے اور کعبہ و بتخانہ بھی ایک ہی ہیں۔

داراشکوہ ایک بلند مرتبہ شاعر اور ادیب تھا۔ شاعری میں ''قادری'' تخلص کرتا تھا اس کے اشعار وحدت ادیان اور فلسفہ وحدت الوجود کے علمبردار ہیں۔ اس کی علمی لیاقت اظہر من الشمس ہے. وہ افکار عالیہ وعلوم الہیہ سے مملو تھا اور وہ اپنے معاصرین میں صف اول کا عالم، صوفی، درویش اور فلسفی تھا۔ یہی سبب ہے کہ جب لوگوں نے اس کی باتوں کا غلط فائدہ اٹھانا شروع کیا اور اس پر طعن وتشنیع شروع کی اور اس پر کفر کی تہمت لگی تو وہ اس بات سے پریشان نہ ہوا کہ لوگ اس پر

انگشت نمائی کررہے ہیں بلکہ وہ اس بات پر نوحہ کناں ہوا کہ اس کے عہد میں ان نام نہاد علماء واہل للہ کا علم اتنا سطحی کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اپنے دور کی فکری پستی اور علمی زوال پر شرمسار ہے۔اور کیا ہی خوب ہو کہ اگر ہم اس کو معنوی علوم کی پستی کہیں، کیوں کہ بحث وغوغا، فتوی ودعوی اور روئے ملا کے مقابلہ میں شیدائی کا آنا جیسے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علوم معنوی کی پستی کی بات کررہا ہے۔اسی لئے اس نے اس دور کے علماء کا غزل کے پیرائے میں مرثیہ کہا ہے۔اس کے یہ اشعار بہت ہی خوبصورت اور حقیقت کے عکاس ہیں:

بہشت آنجا کہ ملایی نباشد ز ملا بحث و غوغایی نباشد
جہان خالی شود از شور ملا ز فتوا ہاش پروایی نباشد
خدا خواہی ز دعوی بگذار ای یار ترا باید کہ دعوای نباشد
در آن شہری کہ ملا خانہ دارد در آنجا ہیچ دانایی نباشد
مبین ای قادری تو روی ملا مرو آنجا کہ شیدایی نباشد

داراشکوہ علوم نقلیہ وعقلیہ کے علاوہ عقائد تصوف کا بھی دلدادہ تھا۔اس نے معنوی علوم کی درستگی وتزکیہ نفس کے لئے بہت سے دروں کی خاک چھانی، خانقاہوں کا چکر لگایا اور ان سے استفادہ کیا ہے۔جب معنوی علوم میں اس کو کسی قسم کا جواب نہ مل پاتا تو وہ پریشان ہو جاتا اور اپنے شناساؤں میں اس کا حل ڈھونڈتا۔اگر ان میں نہ ملتا تو وہ خط وکتابت کے ذریعہ حقیقت اشیاء تک پہونچنے کی کوشش کرتا۔چند بار اس نے اپنے اعتراضات وشبہات کو رفع کرنے کے لئے جہاں محبّ اللہ الہ آبادی جیسے صاحب علم اور فلسفی کو خط لکھے، وہیں سرمد شہید جیسے رند مشرب وبرہنہ جسم کو بھی خط لکھے ہیں۔

وہ قادری سلسلے کو دیگر تمام سلاسل سے افضل مانتا اور ان سے علم ومعرفت، بیعت وارشاد حاصل کرتا تھا۔لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ دیگر سلاسل کو برا تصور کرتا تھا بلکہ اس کو قادریہ سلسلہ فی نفسہ پسند تھا اور یہ اس کی شخصی وطبعی پسند تھی۔اس بابت وہ اپنے رسالہ ''حق نما'' میں اپنے طبعی میلان کو ان باوقار کلمات سے بیان کرتا ہے:

۔''شب جمعہ ہشتم شہر رجب المرجب سنہ یکہزار و پنجاہ و پنج ہجری در سر این فقیر ندا در دادند کہ بہترین سلاسل اولیای خدا سلسلہ علیہ و طریقہ سنیہ قادریہ است کہ از سرور عالم، مفخر بنی آدم ، پادشاہ انبیاء، مرشد اولیاء، مہر سپہر محبوبیت، مخاطب بہ رب العالمین احمد مجتبی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ اسلم رسیدہ بہ پیشوای عارفان و مقتدای واصلان برہان حقیقت بحرمعرفت ہادی

اهل الله قائل۔" قدمی هذه علی رقبة کل ولی الله" شیخ الاسلام خلف سید الانام قطب الخافقین غوث الثقلین ابو محمد حضرت شاه محی الدین سید عبد القادر جیلانی الحسنی الحسینی رضی الله عنه"۔ (رسالہ حق نما،ص۲/۳)

اس کے استادوں میں عبداللطیف سلطانپوری کا نام سرفہرست ہے، جنہوں نے اس کو ابتدائی تعلیم دی اور وہ اس کے پہلے استاد تھے۔ چونکہ وہ طبعاً درویش صفت واقع ہوا تھا اسی لئے اس نے اپنی عمر کے ابتدائی ایام میں ہی جب کہ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ تھی ملا شاہ بدخشانی کے دست مبارک پر ۱۰۴۹ھ میں بیعت کر لی۔ ملا شاہ بدخشانی سلسلہ قادریہ کے مشہور مشائخ میں شمار کئے جاتے ہیں، وہ بدخشاں سے ہندوستان آئے اور یہیں پر میاں میر کے مرید ہو گئے، تقریباً تیس سال تک ان کی معیت میں رہ کر عبادت و ریاضت کی اور جب ان کی وفات ہوئی تو ملا شاہ بدخشانی ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ داراشکوہ ان دونوں حضرات کا بہت احترام کرتا تھا۔ کتابوں میں جب بھی وہ ان حضرات کا ذکر کرتا ہے تو اس کا سودائی قلم ان حضرات کی ثنا خوانی کرتا ہوا انتہائے شوق میں رقص کرنے لگتا ہے۔ رسالہ حق نما میں اس نے ان دونوں نفوس قدسیہ کے بارے میں کچھ اس طرح سے رقم طرازی کی ہے:

"و از ایشان با شرف مشایخ زمان اقدس اولیای دوران مخزن اسرار غیبی،مطرح انوار لاریبی،دانای دقایق عرفان، واقف اسرار یزدان، دلیل اهل حقیقت،رهنمای سالکان طریقت، محرم حریم جلال،شاهد بزم وصال،اعظم اولیای ربانی محی الدین ثانی پیر دستگیر شیخ میر قدس الله روحه و از ایشان بلا واسطه منتقل گردیده بشاه محققان، سلطان اهل عرفان،مستغرق بحر توحید ، سیاح بادیه تفرید و تجرید، سالك طریق لقا و اقف مواقف فنا و بقا محرم حریم یزدانی ، گنجور توحید ربانی ، دانای اسرار وحدت،منزه از آفات کثرت،استادی استفادی مولایی و مرشدی حضرت مولانا شاه سلمه الله و ابقاه و از ایشان بیواسطه براقم این حروف" (رسالہ حق نما،ص۳)۔

اس نے پوری زندگی حصول علم و معرفت میں گزاری، یہی سبب ہے کہ تیموری شاہزادوں میں اگر کسی کا نام علم و عرفان کے لحاظ سے یاد کیا جاتا ہے تو وہ داراشکوہ ہے۔ اگر یہ سوال ہو کہ تیموریوں نے ہندوستان کو کیا دیا؟ تو ہم اس کے

جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں سکینۃ الاولیاء، سفینۃ الاولیاء، اپنیشد، مجمع البحرین، رسالہ حق نما، طریقۃ الحقیقت، حسنات العارفین، اکسیر اعظم، جوگ وشسٹ اور بھگوت گیتا جیسی شاہکار کتابیں لکھنے والا شہزادہ محمد دارا شکوہ دیا ہے۔

حسنات العارفین دارا شکوہ کی کاوشوں کا وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر اس کو رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا، یہ رسالہ اپنے منفرد موضوع کی بنا پر ہمیشہ اہل شوق کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور اپنی مخصوص طرز نگارش کی وجہ سے ہمیشہ اہل صفا نے اس سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ حسنات العارفین کا موضوع شطحیات صوفیہ ہے۔ اس میں صوفیائے متقدمین و متاخرین کے ایسے اقوال کی تشریح و جمع آوری کی گئی ہے جو رندیانہ و مسکرانہ حالات میں ان کی زبان سے جاری ہوئے ہیں۔ دارا شکوہ نے اس رسالے کو اڑتیس سال کی عمر میں ۱۰۶۲ھ میں لکھنا شروع کیا اور دو سال کی محنت و مشقت کے بعد ربیع الاول ۱۰۶۴ھ میں مکمل کیا۔ اس کتاب میں ایسے اقوال کی جمع آوری کی گئی ہے جو بظاہر عقائد اسلام کے مخالف معلوم پڑتے ہیں مگر غور و فکر کرنے کے بعد ان اقوال میں جو گیرائی و گہرائی نظر آتی ہے وہ عین اسلام کے مطابق معلوم پڑتی ہے۔

شطحیات:

شطحیات، شطح کی جمع ہے جو بقول سید مخدوم رہین ظاہرا سریانی زبان سے آیا ہے سریانی میں اس کے معنی ''توسعہ یافتن'' و ''توسعہ بخشیدن'' کے ہیں۔ اس کے بعد یہ عربی زبان میں متفرق معنی کے ساتھ وارد ہوا ہے اور پھر یہ لفظ چوتھی صدی ہجری میں صوفیہ کے درمیان خاص معنی میں استعمال کیا جاتا تھا۔ شطح کی تعریف ابونصر طوسی (متوفی ۹۸۸ء) کی کتاب ''اللمع'' میں اس طرح نقل کی گئی ہے:

ــ'' الشطح كلام يترجمه اللسان عن وجد يفيض عن معدنه مقرون بالدعوى الا ان يكون صاحبه مستلبا و محفوظا۔۔۔ و كان بعضهم اذا ساله انسان مسالة فيها دعوى يقول اعوذ بالله من شطح اللسان۔''

(کتاب اللمع فی التصوف، کتاب تفسیر الشطحیات والکلمات التی ظاہرا مستشنع و باطنہا صحیح مستقیم، ص ۳۴۶)۔

ترجمہ: شطح وہ کلام ہے جو حالت وجد میں اپنے معدن اصلی سے زبان پر ظہور پذیر ہوتا ہے اسمیں دعوی بدیہی طور پر ہوتا ہے مگر یہ کہ صاحب شطح مسلوب العقل اور محفوظ ہو اور بعض حضرات سے جب ایسے مسئلے کے بارے میں دریافت کیا جاتا جس میں دعوی ہو تو وہ کہتے اعوذ باللہ من شطح اللسان۔

ابن عربی (۱۱۶۵ء/۱۲۴۰ء) کی فتوحات المکیہ میں شطحیات کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

الشطح دعوی فی النفوس بطبعها لبقية فيها من آثار الهوى
هذا اذا شطحت بقول صادق من غير امر عند ارباب النهى

ان الشطح كلمة دعوى بحق تفصح عن مرتبة التى اعطاه الله من المكانة عنده افصح بها عن غير امر الهى لكن على طريق الفخر بالراء، فاذا امر بها فانه يفصح بها تعريفا عن امرالهى لا يقصد بذالك الفخر،.....فالشطح كلمة صادقة صادرة من رعونة نفس عليها بقية طبع تشهد لصاحبها يبعده من الله فى تلك الحال ، و هذا القدر كاف فى حال معرفة الشطح" (الفتوحات المكيہ ،الجلد الرابع ،الباب الخامس والتسعون ومائۃ فی معرفۃ الشطح ،ص۱۲۴/۱۲۸)۔

صاحب اصطلاحات صوفیہ نے شطحیات کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کی ہے:

''شطح شطحیات: وہ کلمات ہیں جو واصلین کاملین سے حالت مستی اور غلبہء عشق میں بے اختیار نکلتے ہیں اور بظاہر شریعت کے خلاف ہوتے ہیں، جیسے منصور علیہ الرحمتہ سے انا الحق اور بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے سبحانی ما اعظم شانی'' (اصطلاحات صوفیہ،ص۸۳)

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالت وجد وسکر میں جب صوفیہ کو اتحاد کی صدا سنائی دینے لگے اور اسی حالت عدم شعور میں جو کچھ ان پر وارد ہو رہا ہو اس کے بارے میں عوام الناس کے مابین بیان کرنا جو بظاہر خلاف شرع ہو اور اس میں ایک خاص قسم کا دعوی پایا جائے شطحیات کہلاتا ہے۔شطحیات کے وجود کا جو اہم فیکٹر ہے وہ وجد وسکر ہے، وجد انوار الٰہی کا وہ خاص جلوہ ہے جو صوفی پر طاری ہوتا ہے اور جب یہ جلوہ طاری ہوتا ہے تو انسان عالم ناسوت سے عالم لاہوت کی سیر کرتا ہے، خدا و بندہ کے درمیان کا حجاب ختم ہو جاتا ہے اور اتحاد متحقق ہو جاتا ہے اس مدت میں ناسوت درمیان سے کالعدم ہو جاتا ہے اور صرف لاہوت باقی رہ جاتا ہے۔جب یہ حالت ہوتی ہے تو ذکر، ذاکر اور مذکور کا فرق مٹ جاتا ہے اور یہ سب ایک ذات میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

سکر، مستی روح کو کہتے ہیں۔صاحب اصطلاحات صوفیہ نے سکر کی تعریت کچھ اس طرح کی ہے'' سکر وقت مشاہدہ جمال محبوب، مست وبیخود ہو جانا اور عقل کا عشق سے مغلوب ہو جانا اور اس نوبت پر پہونچنا کہ اس کو عاشق ومعشوق کی تمیز نہ رہے'' (،اصطلاحات صوفیہ،ص۹۷)۔اور وجد کے بارے میں لکھتے ہیں'' وجد جذبہ معشوق ہے یعنی کشش کرنا دل عاشق کو اپنی طرف'' (اصطلاحات صوفیہ،ص۱۶۱)۔اور اتحاد کے بارے میں کہتے ہیں کہ'' حق سبحانہ تعالی کی ہستی میں سالک کے مستغرق ہونے کو کہتے ہیں اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وجود مطلق اس طرح پر مشاہدہ ہو کہ تمام موجودات وافراد

عالم حق تعالیٰ کی ہستی سے موجود ہیں اور اس کے عین ہیں اور خود کوئی ہستی نہیں رکھتے'' (اصطلاحات صوفیہ،ص ۹/۱۰)۔ اسی طرح عالم ناسوت و عالم ملکوت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ داراشکوہ نے رسالہ حق نما میں عالم ناسوت وملکوت کے بارے میں قدرے مفصل بحث کی ہے وہ عالم ناسوت کے بارے میں لکھتا ہے:

'' عالم ناسوت عبارت از ہمین عالم محسوس است که بعضی آن را عالم شهادت و عالم ملك و عالم پندار و عالم بیداری نامیده اند''(رسالہ حق نما،ص۵)

اور عالم ملکوت کے سلسلے میں کہتا ہے:

'' و این را عالم ارواح و عالم غیب و عالم لطیف و عالم خواب نامند '' (رسالہ حق نما،ص۶)۔

پھر کہتا ہے:

'' صورت عالم ناسوتی فنا پذیر است و صورت این عالم ملکوت که صورت اصلی ناسوت است ہیچ گاه فانی نشود و ہمیشه باقی ماند'' (رسالہ حق نما،ص۶)۔

بقول حافظ شیرازی:

خیز تا خرقه صوفی به خرابات بریم
شطح و طامات به بازار خرابات بریم

سید مخدوم رہین نے کتاب کے مقدمے میں عبدالقادر جیلانی کا قول بھی اس سلسلے میں نقل کیا ہے اور وہ لکھتے ہیں:'' اگر کلمات شطح از صوفی در حالت صحو صادر شده باشد آن را از شیطان دانست''، یعنی اگر اس طرح کی شطحیات کسی صوفی کی زبان سے حالت صحو(بیداری) میں صادر ہوں تو اس کو شیطان کا مکر سمجھنا چاہئے۔

چونکہ یہ وہ موضوع ہے جس کی وجہ سے بہت سے صوفیہ کو صعوبت ودشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے اور بہتوں کو اس کی وجہ سے دار ورسن پر چڑھا دیا گیا، کئی متہم ہو کر ذلیل وخوار ہوئے اور کئی افراد کفر وفسق کے الزام میں گرفتار ہوئے ہیں۔ کسی کو مہمل گو کہا گیا ہے تو کسی کو مجنون و پاگل، کوئی جامہ دریدہ ہو کر جنگلوں کی طرف بھاگا ہے تو کوئی گالیاں دیتا نظر آتا ہے ،کسی نے نماز وروزہ سے توبہ کی ہے تو کسی نے ان کو شرک تصور کیا ہے، کوئی بے خود ہوا ہے تو کوئی خودی کا پروردہ، کسی نے انا

الحق کی صدا بلند کی ہے تو کسی نے مظہر محمدی کو پردہ ذات حق شمار کیا ہے، کوئی کافری کی تمنا کرتا ہے تو کوئی زنار باندھے ہوئے نظر آتا ہے، ان صدرنگیوں میں بھی ایک ہی رنگ نمایاں ہے اور وہ صبغۃ اللہ ہے۔ سب نے اپنے وجود سے انکار اور وجود واحد حقیقی کا اقرار کیا ہے۔ یہ وہ صوفیاء کرام ہیں جن کی صوفیت و ولایت آج متحقق و یقینی ہے اور بلا شک وشبہ ان کی ولایت کو قبول کیا جاتا ہے بلکہ ان کے قتل پر افسوس جتایا جاتا ہے وہ اپنے انہیں کلمات کے سبب سے اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں قتل کر دئے گئے۔ انہیں موضوعات کی تشریح اس رسالہ کا موضوع قرار پاتا ہے۔ شیخ محبّ اللہ الہ آبادی اپنی کتاب ''مناظر اخص الخواص'' میں لکھتے ہیں:

" بدانکه بعضی عرفاء زمانه سابق را که امروز خاص و عام در بزرگی ایشان متفق اللفظ والمعنی اند اهل آن زمانه مهجور داشته اند، و بعضی ازیشان بر دست اهل زمانه خود کشته شده اند، چنانکه ابو العباس ابن عطا بسبب آن که انکار داشت بر قتل حسین ابن منصور حلاج ، کشته شد- و ابن عطا بسی بزرگ بود چنانکه عارف کامل ، صاحب راز ابو سعید خراز گوید : التصوف خلق و لست انا به وما رایت من اهله الا الجنید و ابن العطا'' (مناظر اخص الخواص، ص۱۰/۱۱)۔

اسی طرح سے شیخ فریدالدین عطار، شبلی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب منصور حلاج کو قتل کیا گیا تو شبلی کو ان کا طرفدار ہونے کے سبب سے بہت سی تکلیفیں اٹھانا پڑیں اور چونکہ شبلی کے بعض خیالات بھی منصور کی طرح ہی تھے اس لئے لوگ ان کے بھی درپئے آزار ہو گئے:

"و از جهال زمانه بسیار رنج کشید و در رد و قبول و غوغای خلق بمانده بود و پیوسته قصد او کردندیتا او را هلاك کنند چنان که حسین منصور را که بعضی از سخنان او طرفی با حسین داشت " (تذکرۃ الاولیاء، ذکر شیخ ابوبکر شبلی، ص۱۳۶)

اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ صوفی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ''ہمہ اوست'' کے درجے پر آ کر خاموشی اختیار کرے اور ان راز ہائے سربستہ کو درون سینہ ہی دفن کر دے۔ یہاں افشائے راز کی کوئی گنجائش نہیں۔ صوفی کو چاہئے کہ جب وہ خودی حاصل کر لے اور خودی میں اس کو خدا نظر آنے لگے تو خودی کو بھلا دے، بہ صورت دیگر شرمندگی و افشاء راز کی سزا متعین و متحقق ہو جاتی ہے۔ لیکن صوفیہ نے اپنی بدنامی ہی میں نیک نامی کو مضمر پایا ہے اسی لئے وہ اس بات کا

خیال رکھنے کے باوجود کچھ نہ کچھ ایسا کہہ جاتے ہیں کہ لوگ ان کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں۔جنید بغدادی کا قول ہے:

ـ" لا یبلغ احد درجة الحقیقة حتی یشهد فیه الف صدیق بانه زندیق، و ذالك لانهم یعلمون من الله ما لا یعلمه غیرهم"(مناظر اخص الخواص،ص۵۶)

تم میں سے اس وقت تک کوئی حقیقت کے درجہ تک نہیں پہونچ سکتا جب تک کہ اس کے متعلق ہزار صدیق یہ گواہی نہ دے دیں کہ وہ زندیق ہے اور یہ اس لئے ہے کہ وہ ان باتوں کو جانتا ہے جن کو عام لوگ یا اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

اسی طرح دوسری جگہ پر شیخ محبّ اللہ،فتوحات مکیہ کے خطبہ سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں اور علم کی تین منزلیں بتائی ہیں پہلی علم العقل،دوسری علم الاحوال اور تیسری منزل کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

ـ" و الثالث علم الاسرارو هو فوق طور العقل و هو علم نفث روح القدس فی الروح یختص به النبی و الولی"(مناظر اخص الخواص،ص۳۴)

یعنی تیسری منزل علم الاسرار ہے اور وہ علم العقل وعلم الاحوال سے افضل ہے اور وہ ایسا علم ہے جس کو روح القدس نے پھونکا ہے جو نبی اور ولی کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ داراشکوہ نے اس نوعیت کا یہ پہلا رسالہ لکھا ہے بلکہ اس کی مثال اس سے پہلے بھی ملتی ہے اور چیدہ چیدہ اس طرح کے موضوعات شطحیات صوفیہ کے تذکروں میں درج کئے گئے ہیں مگر اس طرح کے اقوال کو باقائدہ فارسی زبان میں سب سے پہلے شیخ روزبہان بقلی شیرازی (۱۱۲۸/۱۲۰۹ء) نے ہی ایک رسالہ لکھ کر جمع کیا ہے۔اس میں صوفیاء کے شطحیات کو یکجا کر دیا گیا ہے جو اس قسم کی پہلی کتاب شمار کی جاسکتی ہے،روزبہان بقلی نے اپنی کتاب کے ابتدا میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ جب انہوں نے اس کتاب کو لکھنے کا ارادہ کیا تو متعدد کتب کی مدد لی اور ان کے مطالعہ کے دوران یہ بات صاف ہوگئی کہ لوگوں نے اقوال کو نقل کرنے میں احتیاط نہیں برتی ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے اقوال کو درستگی کے ساتھ لکھا جائے اور ان نفوس قدسیہ کے کلام میں جو معنی کا ایک بحر بے کران پوشیدہ ہے اس میں غواصی کر کے در بہا تلاش کئے جائیں۔اور اس کے لئے ان اقوال کی نصوص قرآنیہ واحادیث نبویہ کی مدد سے شرح کی جائے تا کہ معترضین کو جواب دیا جاسکے:

"علی الخصوص زبان اهل سکر که در لجهء بحر قلزم قدم غرق وحدت بودند ، از شقایق ایشان در وقت زفرات و حقیقت غلبات شطحیات پیدا شده بود ، و بر هر کلمه ی جهانی از اهل علم بهم دیگر بر آمده بود

۔طاعنان شمشیر جہل از غمد حسد بر کشیدہ بودند ، و از نادانی بخود می زدند ۔ غیرت عشق مرا شربت سکینہ داد ، تا از غمرات محبت ساکن شدم ۔ غیوران حق آواز دادنداز بطنان غیب کہ "ای شاھد اسرار و ای مشکاۃ انوار !ارواح مقدسان از طعن این مفلسان برھان، و دھر دھار بر آن قتالان صلاب بگریان بیان کن۔ رمز شطح عاشقان و عبارت شور مستان بزبان اھل حقیقت و شریعت، و ھر نکتہ ی کہ مقرون حالتست آنرا بصورت علم و ادلہ قرآن و حدیث شرحی لطیف عجیب بگوی"(شرح شطحیات،شیخ روزبہان بقلی شیرازی،ص۱۲)

اگر چہ روزبہان بقلی کے معاصرین میں ایک نام شیخ فریدالدین عطار(متوفی ۱۲۲۱ء) کا بھی آتا ہے جنہوں نے تذکرۃ الاولیاء میں صوفیہ کا تذکرہ کرتے وقت جابجا صوفیہ کے ذکر خیر کے ساتھ ساتھ ان کی شطحیات کا بھی ذکر کیا ہے مگر روزبہان بقلی نے اس پر مستقل شرح کے ساتھ رسالہ لکھا ہے جو یقیناً اپنی نوعیت کیا ایک منفرد کام ہے۔شیخ روزبہان بقلی شیرازی نے سب سے پہلے **''منطق الاسرار ببیان الانوار''** کے نام سے ایک کتاب لکھی اوراس کے بعد اس کی شرح **''شرح شطحیات''** کے نام سے مرتب کی ۔اس کتاب کو لکھنے کے لئے انہوں نے بہت سی مشقتیں اٹھائیں،سفر کئے اوراس میں انہوں نے صحت سند کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اس بابت انہوں نے خود لکھا ہے:

"در خاطرم آمد کہ شطحیات مشایخ جمع کنم، و آن را بالفاظ متصوفہ بزبان عربی شرحی بگویم ۔ استعانت از حق خواستم و بر وی توکل کردم در جمع آن ۔ چون در آن علم خوض کردم و دیوان ایشان مطالعہ کردم ، بیشترین شطحیات از آن سلطان عارف بایزید و شاہ مرغان عشق حسین بن منصور حلاج یافتم آن از ھمہ مشکلتر دیدم، علی الخصوص از آن حلاج ۔ برنجانیدن وی غمناک شدم، از برای تخلیص این علم از طعن حاسدان رنج بسیار کشیدم، تا کتابی مفرد در غرایب علم شطح بفضل حق جمع کردم و آن را۔" منطق الاسرار ببیان الانوار " نام نہادم "۔(شرح شطحیات،شیخ روزبہان بقلی شیرازی،ص۱۲/۱۳)

شرح شطحیات کے مطالعہ کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کا ادبی مقام بھی بہت عالی ہے۔

انہوں نے اس کتاب کو بہت ہی خوبصورت عبارت میں لکھا ہے۔عبارت پر تکلف جملات وکلمات سے آراستہ کی گئی ہے اور اس میں الفاظ کی مقدمہ چینی کو بہت واضح دیکھا جا سکتا ہے مگر اس کی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ عبارت کو پر پیچ اور مغلق نہیں ہونے دیتے۔دوسرے یہ کہ جیسا عبارت بالا میں بیان بھی کیا گیا ہے کہ ان کی کتاب میں بایزید بسطامی اور شیخ منصور حلاج کو خاص جگہ دی گئی ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ یہ کتاب شیخ منصور کی شطحیات کو بیان کرنے کے لئے ہی لکھی گئی تھی۔ کیوں کہ کتاب کا بہترین حصہ بایزید وحلاج کے بارے میں ہی لکھا گیا ہے۔انہوں نے پہلے نبی ﷺ ،خلفاء وصحابہؓ اور پھر مشائخ صوفیہ کی شطحیات کا ذکر کیا ہے، روزبہان شاعر بھی تھے اور ایک صوفی باصفا بھی، اس لئے انہوں نے جا بجا اپنے اشعار کے ذریعے کتاب کی تزئین کاری کی ہے۔

لیکن ''**حسنات العارفین**'' کی عبارت میں اگر چہ تصنع اور الفاظ کی وضع داری کا اتنا خیال نہیں رکھا گیا ہے جتنا کہ روزبہان کی **شرح شطحیات** میں ہے مگر پھر بھی داراشکوہ کی عبارت بے مزہ نہیں ہے اس کے یہاں سادہ عبارت کا التزام کیا گیا ہے۔شاید اس نے اس لئے سادہ زبان کا انتخاب کیا ہو کہ اس سے زیادہ سے زیادہ افراد استفادہ کر سکیں اور چونکہ شطحیات خود بھی محتاج تشریح ہوتی ہیں اس لئے اس کو آسان سے آسان تر زبان میں لکھنا زیادہ مناسب ہو۔دوسرے یہ کہ اقوال کو نقل کرنے میں عبارت کو زیادہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے ورنہ معنی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اس لئے وہ مجبور تھا کہ ان کو اسی طرح لکھے جیسے کہ وہ وارد ہوئے ہیں۔اور روزبہان بقلی چونکہ ایک مستقل شرح لکھ رہے تھے اس لئے انہوں نے اقوال کی تشریح کرتے وقت اپنی عبارات کو صنائع وبدائع سے آراستہ کر دیا اور دوسری طرف شہزادہ جب اقوال نقل کرتا ہے تو بہت ہی مختصر اور نپے تلے الفاظ میں اس کے معنی بیان کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے پہلے ان اقوال کی شرح کی جا چکی ہے۔وہیں جب اپنے عہد کے صوفیہ کی شطحیات بیان کرتا ہے تو قدرے مفصل بیان کرتا ہے اور وہاں اس کی بات بھی گنجلک وپیچیدہ ہو جاتی ہے ورنہ اگر دارا کی عبارت کی خوبصورتی دیکھنا ہو تو اس کی دیگر کتب میں دیکھی جا سکتی کہ وہ الفاظ و معنی کو کس خوبصورتی کے ساتھ برتتا ہے اور صناعت وبداعت کو کس چابکدستی سے استعمال کر سکتا ہے اس کی عبارات کے کچھ نمونے اوپر قوسین میں درج کئے گئے ہیں ان کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اس کو ہر طرح کی عبارت لکھنے پر قدرت حاصل تھی۔اس نے ان ساری باتوں کا اشارتاً ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے:

> ''و چون شطحیات کہ عاشق عارف روزبہان بقلی، رحمہ اللہ، جمع نمودہ، مشتمل بر تشبیہات و استعارات بودہ خوانندگان را موجب ملال می باشد، مختصری بہ عبارت راست و اشعار مناسب چہ از مشائخ و چہ از خود ترتیب داد''۔(حسنات العارفین،ص۳)

داراشکوہ بھی روزبہان کی طرح شاعر تھا اس لئے وہ بھی دوران کلام جابجا متقدمین ومتاخرین شعرا کے اشعار کی گرہ لگاتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور نہ صرف دیگر شعرا کے اشعار نقل کرتا ہے بلکہ وہ خود اپنے اشعار سے گل کاری کر دیتا ہے، اس کے اشعار صوفیانہ عقائد کے حامی اور وحدت ادیان ووجودیت کے علمبردار ہیں اس لئے ان کی پیوندکاری کلام میں چار چاند لگا دیتی ہے۔اس نے جب یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو اس کو بھی بہت سی دشواریوں کا سامنا اور دقیق مطالعہ کرنا پڑا اس کے لئے اس نے ابوطالب مکی کی قوۃ القلوب سے لیکر ابونصر طوسی کی کتاب اللمع ،قشیری کی سرالہ قشیریہ، ہجویری کی کشف المحجوب، عطار کی تذکرۃ الاولیا، رومی کی مثنوی معنوی، رازی کی مصباح الہدایہ، غزالی کی احیاءالعلوم، محمود بن عثمان کی فردوس المرشدیہ، روزبہان بقلی کی شرح شطحیات اور جامی کی نفحات الانس من حضرات القدس جیسی کتب کا مطالعہ کیا۔ جب اس نے یہ رسالہ لکھا تو اس کے معتقدین ومداحین نے اس بات کا اصرار کیا کہ اس کتاب میں وہ اپنی شطحیات کو بھی بیان کرے۔ اس نے جواب دیا:

"چون بعضی طالبان صادق خواهش نمودند که به جهت موافقت این گروه والا شکوه از خود هم داخل رساله باید نمود، گفتم که شطح من اینست که من می گویم که: همه شطح ها شطح من است"۔ (حسنات العارفین،ص۷۹)

یعنی میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ یہ ساری کی ساری شطحیات، میری شطحیات ہیں۔

جب اس نے اس کتاب کو لکھنے کا ارادہ کیا تو اس کے ذہن میں بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں۔اسی لئے اس نے ان باتوں کا ذکر کتاب کے ابتدائی حصے میں کیا ہے وہ اس کے ابتداء کے سلسلے میں لکھتا ہے:

" می گوید فقیر بی حزن و اندوه محمد دارا شکوه : چون در این ایام که سال یك هزار و شصت و دو هجری و سال سی و هشتم است از ولادت این فقیر ، خاطر بالکلیه از کتب اهل سلوك و طریقت ملول گردیده بود و جز توحید صرف منظور نظر نبود و از روی وجد و ذوق اکثر کلمات بلندحقایق و معارف سر بر می زد و پست فطرتان دون همت و زاهدان خشك بی حلاوت از کوتاه بینی در صدد طعن و تکفیر و انکار می شد ؛ بنا بر آن خاطر این فقیر (رسید) که آنچه از کبراء موحدان و بزرگان عارفان که بهترین مخلوق و راست بازان در

معاملت اند، سخنان بلند که آن را متشابهات و شطحیات نامند صادر شده و در کتب و رسایل این قوم متفرق است، بآنچه از عارفان این وقت خود شنیده ، جمع نماید تا حجت قاطع و برهان ساطع بر دجاجلهء عیسی نفسان و فراعنهء موسی صفتان و ابو جہلان محمدی مشربان باشد"۔ (حسنات العارفین،ص۳/۲)

داراشکوہ نے اس کتاب کا نام حسنات العارفین رکھا ہے تا کہ ان لوگوں کو یہ جواب بھی دیا جا سکے جو اس طرح کے کلمات کو لغویات شمار کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے ایک دلیل قائم ہو جائے جو صوفیہ کے اس طرح کے کلمات کے طرفدار ہیں اور اس بات کو اس نے بہت ہی وثوق کے ساتھ کتاب میں کہا ہے:

" و آن را حسنات العارفین به اشاره قرآن مبین نام نهاد تا صادقان سلوك را حجت و سند باشد و زبان طاعنان از سرزنش کوتاه گردد و افتتاح آن به کلام الهی و احادیث نبوی و اقوال صحابه کبار که دلایل واضحه اند بر اثبات این مطلب نمود"۔(حسنات العارفین،ص۳)

ذکر شطحیات متقدمین:

داراشکوہ بھی اپنی کتاب کو پہلے قرآن کی آیات متشابہات سے شروع کرتا ہے اور پھر نبیؐ کی شطح سے برکت حاصل کرتا ہے۔ بظاہر اس کا ایک مقصد یہ بھی معلوم پڑتا ہے کہ وہ ان لوگوں کا منہ بند کرنا چاہتا ہے جو صوفیانہ شطحیات کو جنون و پاگل پن سے تعبیر کرتے ہیں، اس لئے اس نے سب سے پہلے قول نبیؐ ذکر کیا ہے کہ نبی نے فرمایا" انا احمد بلا میم " یعنی احدم" اس کا مطلب ظاہر ہے کہ میں احد ہوں یعنی میں خدا ہوں۔ یہ وہی قول ہے جس کو شیخ منصور حلاج نے ''انا الحق'' کہہ کر ظاہر کیا ہے۔

توحید نبی گفت و ولی گفت خدا
جز وحدت ذات نیست حاشا کلا
ہر گاہ خدا و انبیا می گفتند
من حوصله از کجا بیارم تلا

اس کے بعد وہ صحابہ کرامؓ کی شطحیات کی طرف مراجعت کرتا ہے اور خلفائے راشدینؓ کے اقوال کا ذکر کرتا ہے پھر تابعین و تبع تابعین کے، اسی ضمن میں اس نے حضرت امام زین العابدین کا ذکر کیا ہے اور کہتا ہے زین العابدین علیہ

السلام فرماتے ہیں کہ میں اپنے خاص قسم کے علم کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتا ہوں تا کہ جہلا مجھ پر حملہ نہ کر دیں۔ میرے پاس ایک خاص علم ہے کہ اگر میں اس کو لوگوں پر ظاہر کر دوں تو لوگ مجھ پر بت پرستی کا الزام لگا دیں اور وہ میرا خون حلال سمجھ کر جو زیادتی مجھ پر کریں گے اس کو باعث ثواب سمجھیں گے، یہ علم مجھے میرے دادا نے وصیت کیا تھا اور امام حسن و حسین نے بھی وصیت کی تھی کہ اس کو کسی پر ظاہر نہ کروں۔ اس کے بعد دارا شکوہ نے اس کی تشریح کی ہے اور بہت ہی خوبصورت فلسفیانہ انداز اور بہت ہی کم لفظوں میں بات کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ کہتا ہے:

" ازین عبارت دو چیز ظاهر می شود ۔ یکی آن که خلاصه علم ، علم توحید است ؛ چه از ظاهر ساختن علم شریعت و طریقت کسی خون کسی نمی ریزد ۔ دوم آن که مرا بت پرست می گویند ، یعنی چون حق در من است بت وجود خود را خود خواهم پرستید"۔

(حسنات العارفین، ص ۷)

ایک جگہ پر وہ فضیل عیاض کی شطح گوئی کے بارے میں ذکر کرتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے "عرش و کرسی و لوح و قلم منم و جبرئیل و میکائیل و اسرافیل و عزرائیل منم و ابراہیم و موسی و عیسی و محمد منم" اب ظاہر ہے کہ جب کوئی اس طرح کا دعوی کرنے لگ جائے تو لوگ اس کے درپے آزار ہو ہی جاتے ہیں اور عوام کس طرح سے اس طرح کے کلمات و دعوے کو برداشت کر سکتی ہے اسی لئے جب جب لوگوں نے اس طرح کے دعوے کئے تب تب علماء نے ان کو اپنی گرفت میں لیا ہے کیوں کہ علماء ظاہر پر فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔ جبکہ اس طرح کے دعوے کو سمجھنے کے لئے ایک خاص قسم کی فہم و ذکا کی ضرورت ہے جو اہل اللہ و کاملین کو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ دارا نے اس کی شرح اس طرح سے کی ہے جو واقعی بہت ہی خوبصورت شرح ہے وہ کہتا ہے " یعنی هر که در مقام کلیت رسید او عین همه اوست و همه عین او۔" (مصدر سابق، ص ۸)

اسی لئے حضرت جنید بغدادی (۲۲۰/۲۹۸ھ) فرمایا کرتے تھے کہ جب تک کہ تجھ کو ہزار صدیق زندیق نہ کہہ دیں اس وقت تک تو صدیقیت کے مرتبے کو نہیں پہونچ سکتا (مصدر سابق، ص ۸) اور جب یہ مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ کائنات میں تصرف کا حقدار ہو جاتا ہے، جس سے چاہتا ہے بات کرتا ہے اور جب چاہتا ہے پیر کے سامنے اور جب چاہتا ہے مرید کو نظر آنے لگ جاتا ہے۔ اسی لئے بایزید بسطامی فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے میرے رب نے فرمایا ہے کہ تمام کائنات مجھ میں ہے (مصدر سابق، ص ۱۰) یعنی اگر خود شناسی حاصل ہو جائے تو خدا و کائنات اور خود بندہ ایک ہو جاتے ہیں۔ خود شناسی یا خودی ہر انسان کے لئے ضروری امر ہے اس لئے جب تک اس کو اپنے وجود کا یقین نہ ہو جائے اس وقت

تک وہ کسی دوسرے کے وجود کا کیوں کر اعتراف کر سکتا ہے۔ اور جب انسان خود کی ذات کو پہچان لے گا تو اس کو بیخودی حاصل ہو جائیگی اور جب بے خودی حاصل ہو جائے گی تو اس وقت خدا کی ذات بھی اس کے سامنے واضح و متحقق ہو جائیگی۔ اسی لئے بہت سے لوگوں نے عرفان ذات پر زیادہ توجہ دی ہے اور فنائیت سے پہلے عرفان ذات کو لازمی قرار دیا ہے۔ شیخ عبداللہ ملتانی فرمایا کرتے تھے ''نبی ﷺ نے فرمایا'' من عرف نفسه فقد عرف ربه" جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا گویا کہ اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔'' نفرمود ہر کہ خود را فنا کرد ، خدا را شناخت '' دارا کہتا ہے کہ عرفان خود کی شناخت کا نام ہے نہ کہ خود کو فنا کر دینے کا، دارا نے اسی مضمون کی ایک رباعی میں خودی و خود شناسی کو بہت ہی خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے:

کی کار تو درشمار حق می آید　　کی قلب تو در عیار حق می آید
باید که تو عین خویش دانی خود را　　فانی شدنت چه کار حق می آید ؟!

(مصدر سابق، ص ۴۱)

اسی مضمون کا ایک شعر مولانا روم کا ہے جس میں وہ خود شناسی کی تعلیم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

در بشر رو پوش گشته آفتاب
فهمم کن والله اعلم بالصواب

(مصدر سابق، ص ۴۱)

جب انسان کی عبادات و ریاضات اس قدر ہو جائیں کہ جب وہ چاہے معراج کر سکے تو اس مرتبے کو سیر فی اللہ کہتے ہیں اس مقام میں جستجو اور قرب الٰہی کی کثرت ہوتی ہے اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک سیر بہ آسانی کی جا سکتی ہے۔ استاد الموحدان حضرت ابوسعید خراز فرمایا کرتے تھے ''مدتی او را می جستم ، خود را می یابم ۔ اکنون خود را می جویم ، او را می یابم '' (مصدر سابق، ص ۱۲) اور جب اس کو خودی حاصل ہو جاتی ہے تو وہ خدا کو پا لیتا ہے اور جب خدا کو پا لیتا ہے تو اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خود کو فراموش کر دیتا ہے اس بے فراموشی اس قدر حاوی ہوتی ہے کہ جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کون ہو تو وہ کہتا ہے کہ میں خدا ہوں، امیر حسرو نے اس سلسلے میں کیا ہی خوب بات کہی ہے ۔

عشقت خبرز عالم بیهوشی آورد　　اهل صلاح را به قدح نوشی آورد
رخسار تو که توبه صد پارسا شکست　　نزدیك شد که رو به سیه پوشی آورد

(گنجور، دیوان امیر خسرو، شمارہ غزل ۸۶۶)

اس سلسلے میں ابوسعید خراز فرماتے ہیں:

" بنده چون به حق پیوندد و در قرب رسد، خود را فراموش کند، تا به حدی که اگر پرسند: تو از کجائی، به کجا می روی؟ جواب گویند : الله۔ ۔"(مصدر سابق،ص۱۲)

دارا اس کی شرح میں کہتا ہے کہ وہ جواب دیتے ہیں کہ میں اللہ ہوں اور اللہ ہی میں جارہا ہوں۔کہتا ہے کہ اسی کو سیر فی اللہ کہتے ہیں۔ اسی طرح سے ابوسعید خراز (متوفی ۲۸۶ھ) اپنی کتاب درجات المریدین میں فرماتے ہیں کہ اسی طرح کے لوگوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی لذت نفسانی کو بھی فراموش کر بیٹھتے ہیں،ان کو کسی چیز کی حاجت محسوس نہیں ہوتی،ان کو یہ تک نہیں پتا ہوتا ہے کہ ان کو چاہئے کیا،وہ کیا کہہ رہے ہیں،وہ کیا ہیں اور کہاں ہیں،کہاں کے رہنے والے ہیں وہ بے نام وہ نشان ہوتے ہیں بے علم و بے جہل اور مشتاق ہوتے ہیں آگے فرماتے ہیں:

" اگر پرسند که چه خواهید ؟ گویند الله۔ گویند چه گوئید ؟ گویند الله۔ گویند چه دانید ؟ گویند الله۔ ، و اگر هر موی از ایشان زبانی پیدا ، گوید الله۔ پای تا سر پر باشند به نور الله ۔ و از غایت قرب نتوانند گفت الله۔و از خدا جدا نیستند که گویند الله و درین حال حیرت نگنجد۔" (ص۱۲/۱۳)

گویا یہ لوگ اس شعر کے موافق ہوتے ہیں:

مردان خدا خدا نباشند لیکن ز خدا جدا نباشند

اور پھر وہ اس کارخانہ قدرت میں تصرف کے حقدار ہوجاتے ہیں جن کے بارے میں مولانا روم فرماتے ہیں:

اولیاء را هست قدرت از اله تیر جسته باز آرندش ز راه

(مثنوی معنوی،دفتر اول،گنجور)

مگر اس طرح کا مقام حاصل کرنے کے لئے محنت ومشقت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر فرد بشر کے بس کی بات نہیں اس لئے کہ ریاضت ومجاہدہ کوئی کار آسان نہیں ہے،لوگوں نے سالہا سال پتے کھا کر زندگی بسر کی ہے،کسی کو سالوں پانی میں کھڑے رہنا پڑا ہے،کوئی ٹہنی پکڑ کر سالوں تک ایک ہی حالت میں کھڑا رہا ہے،کسی نے خاک کھا کر ان مراتب کو حاصل کیا ہے تو کوئی قبر میں زندگی بتا کر اس مقام تک پہونچا ہے۔اس لئے اہل ظاہر کو چاہئے کہ پہلے ان مقامات کی سیر کریں اسکے بعد اگر ان کا دل چاہے تو انگشت نمائی کریں مگر ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے اس راہ پر مشقت میں بادیہ پیمائی

کے لئے بہت سے آئے اور اس راہ کی ابتدائی منزل طے کی اور واپس پھر گئے۔ داراشکوہ ابوحمزہ خراسانی (متوفی ۲۹۰ھ) کی ایک حکایت نقل کرتا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ جب احد احد کی صدا سنائے دینے لگے اور ہمہ اوست کی کیفیت اس کے اندر جانگزیں ہوجائے تب اس کو ہر آواز خدا کی آواز معلوم پڑنے لگتی ہے۔

" ابو حمزه خراسانی در خانه حارث محاسبی آواز گوسفند شنید ، در وجد آمد و گفت :۔" لبیك جل جلاله" حارث کاردی کشیده، گفت : این چه حالت است ؟ اگر بیان نکنی ترا بکشم۔ گفت : ای بیچاره برو چندین سال خاکستر و سبوس و آرد باہم آمیخته، بخور تا این مسئله بر تو روشن شود۔" (حسنات العارفین،ص۱۴)

یہ اسی طرح ہے جیسا کہ مولانائے روم کے ساتھ پیش آیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بازار سے گزر رہے تھے کہ ان کے کانوں میں لوہار کے ہتھوڑے کی آواز پڑی اور ان پر حالت وجد طاری ہوگئی اور وہ مثنوی سرائی کرتے ہوئے رقص کرنے لگے۔

ہمہ اوست وہ صفت ہے جو فنائیت کے بعد حاصل ہوتی ہے جہاں پر عابد و معبود کا فرق ختم ہوجاتا ہے اور اس پر الوہیت کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو بندہ خود کو خدا کی ذات میں ضم پاتا ہے اور چونکہ خودی کا احساس مٹ جاتا ہے تو صرف اور صرف خالص خدا رہ جاتا ہے اور جب وہ اس مقام پر پہونچتا ہے تو وہ شیخ ابومحمد رویم (متوفی ۹۱۵ء) کی طرح کہتا ہے " توحید دور کردن آثار بشریت است و ثابت کردن الوہیت بر خود" (مصدر سابق،ص۱۷) یعنی خود کو معبود کی حیثیت سے دیکھتا ہے نا کہ عابد کی حیثیت سے۔ یا پھر حسین بن منصور حلاج ثقفی (۳۰۹/۲۴۴ھ) کی طرح اگر کوئی پوچھے کہ اے منصور تم خدائی کا دعوی کرنے کے باوجود روزانہ ہزار رکعت نماز کس کے لئے پڑھتے ہو؟ یہ کہہ اٹھے " مرا غیر من کیست کہ بپرسد" (مصدر سابق،ص۲۲) یا پھر حالت اس طرح ہوجائے، یک دن منصور حلاج، جنید بغدادی کے گھر گئے اور دق الباب کیا اندر سے جنید نے پوچھا کون؟ تو عرض کیا "حق"۔ یا پھر یہ کہتا ہوا نظر آئے کہ " عارف ایمان نیاورد ، تا وقتی کہ کافر نشود" (مصدر سابق،ص۲۲) یا پھر اس منکر کو جواب کی طرح ہوجائے، جس نے حلاج سے پوچھا تھا کہ سنا ہے کہ آپ نبوت کا دعوی کرتے ہیں؟ جواب دیا" وای بر تو۔ قدر مرا کم کردی" (مصدر سابق،ص۲۲) داراشکوہ تشریح کرتا ہے ' یعنی من دعوی خدای می کنم و تو نام نبوت می گیری" (مصدر سابق،ص۲۲)۔

صوفیہ کی شطحیات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے فلسفے کو سمجھا جائے کیوں شطحیات نہ صرف حالت وجد و

سکر کا ایک حصہ ہیں بلکہ قوت متخیلہ کی تندی وعیاری بھی اس میں شامل ہوتی ہے اور وہ شدت ضبط کے باوجود غیر ارادی طور پر ظاہر ہوتے ہیں اور جب ظاہر ہو جاتے ہیں تو پھر کسی کی پروا کئے بغیر صوفی اس پر قائم رہتا ہے شیخ ابوبکر شبلی (۹۴۶/۸۶۱ء) سے کسی نے دریافت کیا کہ تصوف کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ''شرك است'' (مصدر سابق، ص ۲٤) اسی طرح ایک باران سے شیخ رویم نے پوچھا کہ توحید کیا ہے؟ جواب دیا ''کسی کہ جواب از توحید بدهد او ملحد است، و کسی که تعریف توحید بکند او مشرك است، و کسی که توحید را نداند ، او کافر است، و کسی که اشارت کند به توحید ، او بت پرست است، کسی که سوال کند از توحید ، او جاهل است'' (مصدر سابق، ص ۲۴)۔ اس طرح کے اقوال متعدد صوفیہ کے یہاں ہمیں مل جائینگے ایک بار ابوعبداللہ خفیف نے ابوجعفر خلدی سے پوچھا کہ معائنہ بہتر ہے یا مشاہدہ؟ انہوں نے جواب دیا: ''معاینه زندیقی است و مشاهده حیرت '' دارا نے اس قول کی تشریح اس طرح فرمائی ہے '' یعنی کار ازین هر دو بالا تر است که آن عینیت است '' (مصدر سابق، ص ۲۵)۔ اسی لئے دارا شکوہ صوفیہ کے مذہب کو ایک رباعی میں اس طرح بیان کرتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہم رند مشربوں کا کوئی خاص مذہب نہیں بلکہ جہاں کے سارے مذاہب ہمارے ہیں، کہتا ہے:

کافر گفتی تو از پی آزارم — این حرف ترا راست همی پندارم
پستی و بلندی همه شد هموارم — من مذهب هفتاد و دو ملت دارم

(مصدر سابق، ص ۲۷)

جب ایک صوفی عینیت کے درجے پر پہونچ جاتا ہے تو دوئی ختم ہو جاتی ہے اور صرف ذات واحد باقی رہ جاتی ہے اس کو ہر طرف اور ہر جگہ دیدار یار ہوتا ہے جب یہ حالت ہوتی ہے تو صوفی اپنی عبادات کو ترک کر دیتا ہے کیوں کہ وہ خود بھی اس میں لین ہو جاتا ہے۔ ہشام بن عبدان شیرازی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو دوران نماز کبھی مشرق، کبھی مغرب کبھی شمال وجنوب، کبھی اوپر تو کبھی نیچے دیکھتے تھے اور نماز چھوڑ کر چلے جاتے تھے جب مشائخ نے ان سے پوچھا کہ آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے ہیں تو جواب دیا '' مرا عارضی چند روی می نماید و مانع من می شود از نماز '' (مصدر سابق، ص ۲۷)۔ یعنی جب وہ نماز پڑھتے تو ان کو ہر طرف دیدار خدا وندی ہوتا تھا اس لئے کس طرف کو نماز پڑھیں اس میں وسوسہ ہوتا تھا۔ دارا شکوہ نے ایک واقعہ اس کی تائید میں خود اپنے زمانے کا بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ میرے پیر میاں میر کا ایک مرید تھا جس کا نام شیخ شہا تھا جب وہ نماز میں کھڑا ہوتا تو اتنی دیر کھڑا رہتا کہ لوگ نماز پڑھ پڑھ کر فارغ ہو جاتے اور اپنی اپنی جگہ سے اٹھ بھی جاتے تھے مگر وہ پھر بھی کبھی دائیں دیکھتا تو

کبھی بائیں، کبھی مشرق کبھی مغرب، کبھی جنوب کبھی شمال کبھی اوپر تو کبھی نیچے دیکھتا رہتا تھا۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی بے تکی باتیں صوفیہ کے یہاں مل جائین گی اب دیکھنے والا اس کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے یہ اس کی صواب دید پر محمول کرتا ہے مثلا ابوالحسن خرقانی فرماتے تھے کہ " بہ دو سال خرد ترم از پروردگار خود " (مصدر سابق، ص ۲۸) اب خدا سے دو سال چھوٹے ہونے کا مطلب ہر ایرے غیرے کو تو سمجھ میں آنہیں سکتا اس لئے اس جیسے کلمے کو وہ کفر پر ہی محمول کرے گا ہاں اگر دارا شکوہ جیسا کوئی وسیع النظر اور کشادہ ذہن ہو تو اس کی صحیح توضیح ہو سکتی ہے، وہ اس کی تشریح کچھ اس طرح پیش کرتا ہے "یعنی مرتبہ عبودیت پست تر است از مرتبہ ربوبیت و ہویت" اب اس قول میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ اسی طرح احمد غزالی (۴۵۲/۵۲۰ھ) محمد غزالی کے چھوے بھائی کے بارے میں آتا ہے کہ ایک دن انہوں نے نماز کی نیت کچھ اس طرح سے باندھی کہ ہر صاحب ہوش استغفار پڑھنے پر مجبور ہو جائے الفاظ یہ تھے " کافر شدم زنار بستم الله اکبر" (مصدر سابق، ص ۳۱) دارا اس کی شرح ان الفاظ سے کرتا ہے " یعنی از الوہیت نزول کردم و به عبودیت آمدم" اس کے بعد اس قول کو تقویت بخشنے کے لئے دارا شکوہ اپنے پیر محترم ملا شاہ بدخشانی کے قول کو بطور دلیل لا رہا ہے کہ "انہوں نے فرمایا کہ میں بالائے عرش تھا اذان کی آواز سنی خود کو زمین پر پایا اٹھا اور نماز ادا کی" یعنی ادائے نماز کے لئے عبدیت شرط ہے عالم بے ہوشی و وجد و سکر میں احکام شرعی چونکہ ادا نہیں ہوتے اس لئے صوفیہ اس طرح کے عمل کیا کرتے تھے جیسا کہ احمد غزالی نے نماز پڑھنے کے لئے کیا کیوں کہ کافری اور زنار دونوں ہی ہوش دار کے لئے ہیں نہ کہ صوفی سرمست کے لئے۔ احمد غزالی کے اور بھی اقوال ہیں کہ جن کی وجہ سے ان کو طرح طرح کے طعنے سننے پڑے ایک بار انہوں نے فرمایا" هر که تعلیم توحید از ابلیس نگرفت ، زندیق است" اب ابلیس سے وحدانیت کا پاٹھ پڑھنا عجب بات ہے مگر دارا توضیح پیش کرتا ہے کہ " در یگانگی باید ملامت را مثل ابلیس باید برداشت و مردود خاص و عام گشت" (مصدر سابق، ص ۳۲)

عین القضات ہمدانی نے تو یہاں تک کہہ دیا " از دیدن نور محمد ﷺ رسول الله ، جمله مومنان کافر شدند و هیچ کس را از آن خبر نیست" (مصدر سابق، ص ۳۲) یہ ایسی شطحیات میں سے ہے جس کے بارے میں خود دارا جیسا صوفی باصفا انسان یہ کہنے پر مجبور ہے کہ " این شطح بسیار بلند است" اور اس کی شرح میں صرف اتنا کہتا ہے کہ " نبوت حجاب وحدت شده"۔

پیران پیر حضرت دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں " مرد آن است که منازعت کند با قضا و قدر نه آنکه موافقت نماید با قضا و قد" (مصدر سابق، ص ۳۳) اسی طرح سے ایک اور شطح جو بہت

ہی معروف اور زبان زد خاص و عام ہے جس کے بارے میں دارا خود کہتا ہے کہ یہ شطح عظیم ہے اور اکثر و بیشتر حضرت عبد القادرؒ کے مناقب میں اس کا ورد ہوتا رہتا ہے کہ آپ نے فرمایا " قدمی هذه علی رقبة کل ولی الله" یعنی میرے قدم تمام اولیاء کی گردنوں پر ہیں۔ مگر دارا نے اس شطح کی شرح میں اپنی طرف سے کوئی کمینٹ کرنے سے گریز کیا ہے اور اس کی جگہ پر اس نے اپنے پیر کے پیر میاں میر کی توضیح کو ترجیح دی ہے اور وہ کہتا ہے کہ میرے پیر فرمایا کرتے تھے کہ قدم سے مراد طریقہ ہے اور یقینی طور پر عبد القادر رضی اللہ عنہ کا سلسلہ تصوف تمام طرق پر بھاری اور افضل ہے۔ اس کو ذکر کر کے وہ یہ بھی بتانے کی کوشش کر رہا ہے کہ سلسلہ قادریہ کو میں اس لئے بھی پسند کرتا ہوں کہ وہ دیگر تمام طرق پر افضل ہے۔ اسی طرح سے بلند و پر مغز شطح محی الدین عربی سے بھی نقل ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے " ایکاش می دانستم مکلف کیست ؟ اگر مکلف بنده است ، بند خود ، نیست محض است۔ اگر مکلف رب است ، رب را چه تکلیف؟!" (مصدر سابق، ص ۳۷) ۔ ابن عربی کی یہ شطح فلسفیانہ مباحث پر مبنی ہے جو قضاوقدر کے مبحث میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح سے خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ سے منقول ہے کہ ایک بار کسی نے ان سے کہا کہ شیخ میں آپ کا مرید ہونا چاہتا ہوں انہوں نے کہا کہو "لا الہ الا اللہ چشتی رسول اللہ" اس نے ایسا ہی کیا اس کو اپنا مرید بنالیا۔ یہ شطح بھی نہایت بلند ہے اس لئے کہ مرید کے لئے سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ پیر جو بھی فرمائے مرید اس کو بلا چون و چرا قبول کرے اس میں سوال و جواب کی گنجائش نہ نکالے اسی لئے تو خواجہ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

به می سجاده رنگین کن گرت پیر مغان گوید
که سالك بی خبر نبود ز راه و رسم منزل ها

معاصر ہندوستانی صوفیہ کی شطحیات:

داراشکوہ نے نہ صرف ان اقوال کی بات کی ہے جو اس سے پہلے درج کئے جا چکے تھے بلکہ اس نے ہندوستان کے صوفیہ کبار کی شطحیات کو بھی جگہ دی ہے، اس نے اگرچہ بعض موقع پر اختصار سے کام لیا ہے بلکہ بعض لوگوں کو چھوڑ بھی دیا ہے۔ اسی طرح سے اس نے اس میں متعدد شعرا کو بھی شامل کیا ہے جن کے اشعار میں فلسفیانہ مضامین یا صوفیانہ رنگ نظر آتا تھا، ہندوستان کے صوفیہ کبار میں سے وہ شیخ شرف الدین پانی پتی معروف بہ شاہ قلندر کو بھی ان لوگوں میں جگہ دیتا ہے اور ان کے شطحیات کا ذکر کرتا ہے۔ اس نے ان کے کئی اقوال ذکر کئے ہیں یہاں صرف چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے:

به بد نامی بر آوردیم نامی — دگر ناموس را از ما سلامی
نمازی می گذارم در خرابات — که نی در وی سجودی نی قیامی
براقی کردم از وحدت چو برقی — خدایی را به رو کردم لگامی

مرا چون نام زندیقی بر آمد چو مستم نیست ننگ از ہیچ نامی
شرف! زنار و تسبیحت یکی شد تو خواہی خواجه شو خواہی غلامی

اسی طرح سے عراقی کے اشعار بھی پیش کئے ہیں:

دعوی عشق مطلق، مشنو ز نسل آدم
آنجا کہ سر عشق است انسان چہ کار دارد
معشوق و عشق و عاشق ہر سہ یکی ست اینجا
چون وصل می نگنجد ہجران چہ کار دارد

پھر **باباپیارے** کا ذکر کیا ہے اور ان کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں بہت سے صوفیہ کرام موجود تھے مگر میرے عقیدے کے مطابق ان جیسا کوئی نہیں تھا اور وہ سب پر غالب اور صاحب تصرف تھے وہ ان کے طریقے کے بارے میں بھی بات کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ ان لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا تھا ہزار یا پانچ سو مریدوں کے درمیان ایسے رہتے تھے کہ اگر کوئی شیخ کو تلاش کرتا تو تلاش نہ کر پاتا اس لئے کہ وہ جس سے بھی پوچھتا کہ شیخ کون ہیں وہی بول اٹھتا تھا کہ آپ ہی ہمارے پیر ہیں یہ لوگ ایک دوسرے کے سامنے اپنا نام کبھی نہیں لیتے تھے اور نہ اپنا نسب ظاہر ہونے دیتے تھے اگر ان میں سے کوئی ایک اٹھ کھڑا ہوتا تو سارے کھڑے ہو جاتے تھے اور اگر بیٹھ جاتا تو سب بیٹھ جاتے تھے۔

اسی طرح وہ شاعر نامدار **کبیر داس** کی شطحیات پر بھی بات کرتا ہے جو بابر کے عہد سے پہلے کے شاعر ہیں اور کہتا ہے کہ وہ ہندوستان کے کامل عارف ہیں اور یہ کہ وہ خود اپنے طریقے کی ہی پیروی کرتے تھے (جو بعد میں کبیر پنتھی کہلایا) ان کا طریق موندیہ کی طرح تھا۔ داراشکوہ کہتا ہے کہ **کبیر اگرچہ نساج تھے لیکن خیر النساج** تھے اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ نساجوں (بنکروں) کو اس دور میں بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ وہ ایسے صوفی تھے کہ مسلمان ان کو مسلمان سمجھتے اور ہندو ہندو سمجھتے تھے اگرچہ خود کبیر داس ان دونوں سے مبرا تھے یہ بھی لکھتا ہے کہ حالت نزع میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو دفن کیا جائے یا جلایا جائے؟ انہوں نے ہندوں کو جواب دیا کہ اگر میری نعش ملے تو جلا دینا اور مسلمانوں سے کہا کہ اگر نعش ملے تو دفنا دینا اور یہ کہہ کر حجرے میں چلے گئے اور حجرہ اندر سے بند کر لیا جب دروازہ کھولا گیا تو ان کے حجرے میں چند پھول دیکھے گئے کبیر داس موجود نہیں تھے۔ یہاں پر ان کے دو اشعار نقل کئے جاتے ہیں تا کہ ہمیں کبیر کو جاننے کا موقع مل سکے اگرچہ دارا نے کبیر کا کوئی شعر نقل نہیں کیا ہے پھر بھی ان کا ایک دوہا ہے جس میں وہ اذان کے بارے میں کہتے ہیں:

کنکر پتھر جوڑ کے مسجد لئی بنائی

تا چڑھ ملا بانگ دے کا بہرہ بھیا خوداءِ

یعنی کبیر یہ کہنا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو یہ کیا ہوگیا ہے جو روز اذان کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں ارے جس کو عبادت کا شوق ہوگا وہ خود بخود آئیگا۔ یا خدا کو یاد کرنے کے لئے اذان کی کیا ضرورت ہے ہم تو اس خدا کو پوجتے ہیں جو ہر جگہ، ہر وقت موجود رہتا ہے، جو ہماری شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، اس لئے اذان دیکر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ خدا کو اونچا سنائی دیتا ہے یا بہرا ہے۔

پاتھر پوجیں ہری ملیں تو میں پوجوں پہاڑ
گھر کی چاکی کوئی نا پوجے جا کا پیسا کھائے

وہ کہتا ہے کہ جو لوگ پتھر کی پوجا واپاسنا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو خدا مل جائے گا اگر ایسا ہے تو میں پورے پہاڑ کو پوجونگا۔ پھر کہتا ہے کہ گھر کی چکی اس پتھر سے زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پوجا کی جائے۔ اس لئے کہ اسی میں ہم روزانہ اناج پیس کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔

اس میں اس نے اپنے پیر کے پیر کا بھی ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ حضرت **شیخ میر** میرے بھی پیر تھے اور میرے پیر کے بھی پیر تھے وہ ان کے بارے میں کہتا ہے کہ جس طرح سے طریقت میں حضرت جنید بغدادی سب متقدمین کے استاد ہیں اسی طرح متاخرین میں حضرت میاں میر سب کے استاد ہیں۔ اور کئی ساری ان کی باتیں نقل کی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ شہاب الدین سہروردی اور بہاء الدین ملتانی اگر میرے فقر کے بارے میں جان جائیں تو وہ لوگ اپنے فقر پر شرمندہ ہونگے۔ کہتا ہے کہ جب ہمارے مرشد گرامی جناب مولا شاہ کشمیر کی طرف ہجرت کر گئے تو جب کوئی کشمیر سے آیا ہوا انسان ان سے ملتا تو وہ اس سے پوچھتے کہ ''خدای کشمیر چہ حال دارد''۔

اس نے اس میں اپنے **پیر ملا شاہ** کے بارے میں بھی بات کی ہے اگر چہ وہ کہتا ہے کہ ان کے احوال میں ایک مستقل کتاب ''**سکینۃ الاولیاء**'' لکھ چکا ہوں مگر برکت کے لئے ان کا ذکر کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ میرے پیر، میاں میر کے مریدوں کے درمیان ایسے تھے جیسے شبلی، جنید کے مریدوں کے درمیان، اور بھی بہت کچھ لکھا ہے ان کی ایک غزل کے چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شکر کہ امروز شد، دولت فردای ما — رتبہء اعلی گرفت، ہمت والای ما
رشتہء تسبیح ما، رشتہء زنار شد — رہ سوی میخانہ داد، مرشد دانای ما
اول و آخر نداشت، وصل ترا ہر کہ یافت — آدم و حوا نبود، بی بی و بابای ما

سرمد شہید:

عمریست کہ آوازہ ی منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

داراشکوہ نے سرمد شہید کا ذکر نہیں کیا ہے جو اس کے معاصرین میں ایک اہم مقام رکھتے تھے اور اس کے ہم مشرب بھی تھے اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے اپنی اس کتاب کو جس زمانے میں ترتیب دیا تھا اس وقت تک سرمد سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور اس کے بعد اس نے اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیوں کہ وہ اپنی توجہ کہیں اور مرکوز کر چکا تھا۔

داراشکوہ کے ذکر کے ساتھ اگر سرمد کا ذکر نہ کیا جائے تو ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے اس لئے مناسب معلوم پڑتا ہے کہ اگر چہ دارا کی اس کتاب میں سرمد کا ذکر نہیں ہے مگر اس کا ذکر کر دیا جائے تا کہ یہ معاصر محروم حق نہ رہ جائے۔ کیوں کہ سرمد کی شہادت پولیٹکل رنگ میں رنگی ہوئی ایک خونچکاں داستان معلوم پڑتی ہے جس نے منصور ثانی بن کر اس داستان میں روشنی بھری ہے۔ ہم یہاں پر مولانا ابوالکلام آزاد کے مضمون ''سرمد شہید'' جس کو انہوں نے خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر ۱۹۱۰ء میں لکھا تھا اور جو بعد میں حیات سرمد کے نام سے حمیدیہ کتب خانہ دہلی سے شایع ہوئی تھی سے اور کچھ دیگر جگہ سے اطلاعات فراہم کرینگے، تا کہ سرمد کی شطح گوئی کو بھی ہم جان اور سمجھ سکیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سرمد برہنہ جسم صوفی تھے اور وہ بھی دارا کی طرح وحدت ادیان کے علمبردار تھے۔ ان کی رباعیات چند بار تصحیح و ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں جن کی تعداد ۱۲۸ سے ۱۳۱ تک پہونچتی ہے ان کی رباعیات کو بال مکند عرش ملسیانی اور جناب منشی سید نواب علی صولت لکھنوی نے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی گویا کہ ان کے پورے فلسفے کا خلاصہ ہے:

عاشق و معشوق و بتگر و عیاری کیست
کعبہ و دیر و مساجد ،ہمہ جا یاری کیست
گر در آیی بہ چمن وحدت یکرنگی بین
غور کن عاشق و معشوق و گل خاری کیست

دارا اور سرمد میں جو مماثلت تھی وہ جگ ظاہر تھی دونوں وحدت ادیان کے علمبردار تھے اسی لئے دارا، سرمد کو اپنے مرشد کی حیثیت سے احترام کی نظر سے دیکھتا تھا ایک خط میں اس نے سرمد کو ''پیر و مرشد'' کہا ہے۔ اور سرمد نے دارا کو دوست عزیز کہہ کر پکارا ہے۔ اسی خط میں دارا، سرمد سے چند سوالات کرتا ہے:

۔'' اگر وجود ما است پس ارادہ ما چرا با مراد نیست؟ و اگر من ہیچ چیز نیستم پس قصور ما کیست؟ اگر قتل حسین بہ رضائی الہی

شودپس یزید کیست؟ و اگر به رضای خدا نمی شود پس این چه معنا دارد که هر چه خدا خواهد می کند و حکم می دهد ۔ پیغمبر اسلام ﷺبه خلاف کفار لشکر کشی می کند مگر سپاه مسلمان شکست خورد، چرا؟ علماء می گویند که این یك درس بود پس هر که در ذات خود کامل شود برای وی درس چه معنی دارد؟ ''

سرمد نے صرف اتنا جواب دیا ''میرے دوست جو بھی پڑھا تھا سب بھلا دیا ہے اب تو صرف محبوب کا ذکر یاد رہ گیا ہے جسے دم بہ دم لئے جا رہا ہوں۔

سرمد ہمیشہ ننگے رہتے تھے اس لئے اورنگزیب نے قاضی القضاۃ ملا قوی کو سرمد کے پاس بھیجا کہ ان سے وہ پوچھیں کہ برہنگی کی وجہ کیا ہے انہوں نے سرمد سے پوچھا کہ باوجود کمال علم وفضل برہنہ ومکشوف العورۃ رہنا کس عذر پر مبنی ہے ؟ سرمد نے جواب دیا'' شیطان قوی شد '' ملا قوی خجل ہو گئے ۔اس کے بعد اورنگزیب کے دربار میں جب ان پر مقدمہ چلایا گیا تو سب سے پہلا سوال یہی تھا کہ آپ شرعی احکام کی پابندی کیوں نہیں کرتے جس کے جواب میں سرمد نے کہا کہ شریعت میں لباس کی پابندی نہیں ہے، خود پیغمبر بنی اسرائیل حضرت اشعیا علیہ السلام ننگے رہا کرتے تھے۔ سرمد نے اپنے ننگے ہونے کے بارے میں بھی کئی رباعیات کہی ہیں، کبھی وہ کہتے ہیں ۔ع

دزدی عجبی برهنه کرد مرا

اور کبھی کہتے ہیں:

بی عیان را لباس عریانی داد

وہ کبھی کبھی فخریہ کہتے ہیں:

گشت چهل سال که پوشیدمش

کهنه نه شد جامهء عریانئم

اور جب ان سے دوسرا سوال کیا گیا کہ آپ جب کلمہ پڑھتے ہیں تو پورا کیوں نہیں پڑھتے صرف'' **لا اله** ''ہی کیوں کہتے ہیں''**الا الله**'' کیوں نہیں کہتے اس سے تو انکار لازم آتا ہے جس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ابھی مجھے مشاہدہ ذات نہیں ہوا ہے اس لئے میں جھوٹ کیوں بولوں جس دن ہو جائیگا اس دن ''**الا اللــه**'' بھی کہوں گا۔ تیسرا سوال یہ تھا کہ آپ نے معراج جسمانی کا انکار کیوں کیا ہے یہ اعتراض سرمد کی درج ذیل رباعی پر ہے:

هر کس که سر حقیقتش پا در شد او پهن تر از سپهر پهناور شد

ملا گوید کہ بر فلك شد احمد سرمد گوید فلك به احمد در شد

آخر میں دارا کے ان اشعار پر بات کو ختم کیا جاتا ہے:

یك ذره ندیدیم ز خورشید سوی هر قطره آب هست عین دریا

حق را به چه نام کس نتواند خواندن هر اسم که هست، هست ز اسمای خدا

کتابیات:

چشتی، خواجہ شاہ محمد عبدالصمد فخری فریدی، **اصطلاحات صوفیہ**، مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۲۹ء۔

شکوہ، شہزادہ محمد دارا، **رسالہ حق نما (منتخبات آثار)**، بہ اہتمام سید محمد رضا جلالی نائینی ۱۳۳۵ش۔

الہ آبادی، شیخ محبّ اللہ، **مناظر اخص الخواص**، بہ تصحیح حافظ محمد طاہر علی، انتشارات تحقیقات دانشگاہ وشوابارتی شانتی نکیتن ۱۹۹۳ء۔

بقلی شیرازی، شیخ روزبہان، **شرح شطحیات**، بہ تصحیح ہنری کربین، انجمن ایرانشناسی فرانسہ تہران ۱۹۸۱ء۔

شکوہ، شہزادہ محمد دارا، **حسنات العارفین**، بہ تصحیح ومقدمہ، سید مخدوم رہین، موسسہ تحقیقات وانتشارات ویسمن تہران ۱۳۵۲ش۔

الہ آبادی، شیخ محبّ اللہ، **مکتوبات شاہ محبّ اللہ الہ آبادی**، بہ تصحیح ومقدمہ پروفیسر اخلاق احمد آہن، بنیاد ہند وافغانستان دہلی نو ۲۰۱۹ء۔

شیرازی، حافظ، **دیوان حافظ**، مترجم مولانا قاضی سجاد حسین، پروگیسو بکس، اردو بازار لاہور، بی تا۔

عطار، شیخ فریدالدین، **تذکرۃ الاولیاء**، با مقدمہ میرزا محمد خان قزوینی، چاپ منجم، انتشارات مرکزی خیابان شاہ مقابل مسجد سجاد، ۱۳۳۶ ش۔

ابن عربی، الشیخ الامام محی الدین، **الفتوحات المکیہ، الجزء الرابع**، بہ تصحیح احمد شمس الدین، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۹۹۹ء۔

الطّوسی، ابی نصر عبداللہ بن علی السراج، **کتاب اللمع فی التصوف**، بہ تصحیح رنولد الن نیکلسون، مطبعۃ بریل فی مدینۃ لیدن، ۱۹۱۴ء۔

آزاد، ابوالکلام، **حیات سرمد**، حمیدیہ کتب خانہ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۱۹۱۰ء۔

روم، مولانا، **مثنوی معنوی**، دفتر اول، گنجور، https://ganjoor.net

خسرو، امیر، **دیوان امیر خسرو**، شمارہ غزل ۸۶۶، گنجور، https://ganjoor.net

☆☆☆

ڈاکٹر محمد یاسین کمبے
دانشگاہ کشمیر،
کشمیر

میر غلام رسول نازکی بحیثیت فارسی شاعر

قصبۂ سوپور کو تاریخ کشمیر میں ایک اہم علمی، اقتصادی اور ثقافتی مرکزی حیثیت حاصل ہے اور قدیم زمانے سے ہی یہاں کے لوگوں میں علم وادب کا ذوق وشوق بھی پایا جاتا ہے۔ اگر چہ آج کل یہ قصبہ سیب کی پیداوار میں خاصی شہرت رکھتا ہے مگر کشمیر کے علم وادب میں یہاں کے لوگوں کا خاص حصہ رہا ہے اور اسی مٹی سے بیسوی صدی عیسوی کی ابتدائی دہائی یعنی ۱۹۱۰ء میں میر غلام رسول نازکی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی محنت وذہانت سے کشمیر کے ادبی سرمایہ میں خاص اضافہ کیا ہے۔ ان کے والد محترم غلام نازکی اپنے زمانہ کے فاضلوں، ادیبوں اور شعراء میں خاص مقام رکھتے تھے۔ بلکہ عربی وفارسی زبان کے بہترین استاد شمار کیے جاتے تھے۔ انہی کی زیر تربیت میر غلام رسول نازکی نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میر غلام رسول نازکی کو کم سنی میں ہی محکمہ تعلیم نے بحیثیت استاد تعینات کیا۔[۱] اور دوران ملازمت ہی انہوں نے پھر اپنی تعلیمی شوق کو اُبھارا اور منشی عالم، منشی فاضل وادیب اور بی۔ اے کی ڈگری امتیازی پوزشن کے ساتھ حاصل کی۔

محکمہ تعلیم میں میر غلام رسول نازکی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ریڈیو کشمیر کا قیام عمل میں آیا تو آپ نے ریڈیو کشمیر میں ملازم اختیار کی۔ اور پروگرام ایکزیکٹیو عہدے پر رٹائر ہوئے[۲]۔ موصوف کشمیری ہفتہ وار روزنامہ ''چمن'' کے ایڈیٹر بھی رہے جو ۱۹۷۲ء میں شایع ہوتا تھا۔ شاعری کے لحاظ سے نازکی ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے جیسا کہ ذکر ہوا اُن کے خاندان میں شاعری روایت ابتداء سے چلی آرہی تھی اور نازکی کو بھی شعروشاعری کا شوق وذوق وراثت میں ملا تھا۔ اگر چہ میر غلام رسول نازکی چہار لسانی شاعر تھے جیسے عربی، فارسی، اردو اور کشمیری مگر انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز فارسی شاعری سے ہی کیا۔ جب انہوں نے اپنے والد محترم کی زیر نگرانی فارسی شاعری شروع کی۔ اس وقت انکی عمر تقریباً ستارہ (۱۷) سال کی تھی۔ بقول عبدالقادر سروری ''میر غلام رسول نازکی کشمیر کے کہنہ مشق شاعر ہیں''۔[۳]

کشمیر زبان میں پہلا شعری مجموعہ ''نمبرود نامہ'' ۱۹۲۴ء میں دوسرا مجموعہ آواز دوست ۱۹۸۵ء اور تیسرا مجموعہ ''کاوینہ وول'' ۱۹۹۶ء میں شائع کئے۔ چنانچہ زمانے کے گردش کے ساتھ ساتھ تینوں کتابیں نایاب ہوئیں اور اُن کے فرزند نے والد صاحب کے مرنے کے بعد ۲۰۱۴ء میں 'کلیاب نازکی' شائع کی۔[۴] جس میں مذکورہ تینوں مجموعوں کے علاوہ

''لالہ طور'' کا ترجمہ بھی شامل ہے اور ساتھ ہی فارسی زبان کی غزلیں اور نوحہ اقبال بھی شامل ہیں۔

عہد شباب میں نازکی نے فارسی شاعری میں غزل، رباعی، نوحہ، قطعات اور نظم کے ساتھ ساتھ نعت ومنقبت رسول اکرمؐ اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں فارسی کا رواج کم ہوتا گیا تو نازکی نے بھی اپنا رجحان اردو اور کشمیری شاعری کی طرف مرکوز کیا۔ اس طرح سے اکثر لوگ انہیں کشمیر میں انہی زبانوں کے کلام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں نازکی نے اپنا پسندیدہ اور نادر کلام فارسی شاعری میں چھوڑا ہے جو ابھی تک پردہ اخفا میں ہے۔ اُن کے فارسی کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تعداد کے لحاظ سے کم عبارت کے لحاظ سے سادہ لیکن معنی کے لحاظ سے بلند پایہ اور قابل توجہ ہے۔ یا یوں کہیے کہ سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے۔ جو نہایت ہی مفید اور قابل داد وتحسین ہیں جس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا تھا اور بیرون ممالک میں بھی پذیرائی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر جب ایران کے قریبی ملک سابقہ سویت روس جہاں پر بعض ریاستوں میں فارسی زبان کا رواج تھا۔ وہاں ایک مشاعرہ ہوا بعد میں جس پر ''ماسکو مشاعرہ'' کے نام کتاب چھپی۔ اس کتاب میں کچھ اہم شعراء کا کلام شامل کیا گیا جن میں علامہ اقبالؒ، یکتا بھوپالی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور میر غلام رسول نازکی کا کلام شامل کیا گیا۔ جس سے نازکی صاحب کے فارسی شاعری میں دوسترس اور رسائی کا اندازہ عیاں طور پر ہوتا ہے۔ اور وہ کلام پیش خدمت ہے۔

از تو قائم گرمئی ھنگامہ بود و نبود
خیز و کم کن شکطہ ھائی گردش چرخ کبود
روز گاری در خم ابروُی دلبر باختم
زان سبب پیشِ خداوندی نیا ورم سجود
مرغکی دیشب بگواری بشاخی می سرود
شاھدِ گل راثباتی نیست دِل دادن چہ سُود
ھر کہ راحسن عطا کردند اوقاتش کم است
بلبل از گل، گل زِ شبنم، شبنم از انجم شُنود
جنت کشمیر رانازم کہ حسنِ این دیار
عشوہ گرد و دل شیرازیان با خودر بود ۵؎

نازکی کے فارسی غزلیں اجتمائی معنی ومطالب کی آئینہ دار ہیں۔ چُونکہ انسانی زندگی میں مسرب اور شادمانی ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ اس میں پائیداری نہیں ہے اس کے برعکس انسانیت غم سے سنورتی ہے۔ انسان فکر وفہم اور غم کا علیٰ

محرک ہے۔ایسے ہی مضامین نازکی کے کلام میں ملتے ہیں۔انکے نزدیک دنیا مصیبتوں کا گھر ہے۔اس لئے غم اور ارمان دونوں دل میں جنم لیتے ہیں۔وہ دنیا سے شکوہ کم کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور فرماتے ہیں عشرت، خوشی اور مسرت ایک سراب ہے۔اُن کی یہ غزل بے پناہ روانی، سلاست اور تاثیر پیدا کرتی ہے۔

هیچکس در بزم درد آشام نیست — باده ها درخم بکف ها جام نیست
تشنگان راتشنگی افزوده اند — درصراحی بادۂ گلفام نیست
هر فنس زیر و بم تار حیات — تا نفس باقی بود آرام نیست
شکوه کم از گردشِ ایام کُن — زندگی جُز گردشِ ایام نیست
آبروئی خود مریز از بهرِ نان — کم نِگارهی بختِ نا فرجام نیست
تا کفن دُزدی کُند پیرِ هرم — در نصیبش جامه احرام نیست
دیده ام وارفتگان رادرنماز — وقتِ شان پابندِ صبح و شام نیست
کوسِ رحلت می وزدامے مستِ خواب — این نوای مرغِ بی هنگام نیست ۶؎

نازکی کی شاعری کا معیار عصر حاضر کے شعراء میں بہت قابل قدر اور بلند پایہ کا ہے۔اور اس میں انسانی اور فطری فضا کا احساس ہوتا ہے۔انفرادی اور اجتماعی شعور کا حسین امتزاج بھی ملتا بھی ملتا ہے۔ان کی غزل زمانہ کا ردعمل ہے۔اس لیے اس میں اصلیت، واقفیت، حقیقت اور خلوص کے وہ پہلو نظر آتے ہیں جو بہت سے شعراء کے یہاں پیدا نہیں ہوتے۔غزل میں انہوں نے انفرادی اور سماجی زندگی کے اتار چڑھاو سے آشنا کیا ہے۔اسی طرح تربیت، ماحول، حالات اور تجرباتی زندگی نے ان کو فارسی میں اہم مقام بخشا ہے۔یہ غزل نمونے کے طور پیش کی جاتی ہے۔

پابندِ رسم وارہِ جہاں نیستم ازان — همچو مُسافری سرراهی نشسته ام
در اضطراب صرف نمودم تمام عمر — کاهی بپا ستاده و گاهی نشسته ام
آیا بود که جلوه دهد یوسفی چوماه — درانتظار برلب چاهی نشسته ام
روزی نشسته ام بمیانِ تونگران — گوئی بقعرِ چاهِ سیا هی نشسته ام
بزمِ نجوم، بزمِ گدایان میکده — من درمیانه صورتِ ماهی نشسته ام
محروم التِفات نیم گرچه گُل نیم — باگُل مثالِ برگِ گیا هی نشسته ام
تا زخم تازه تر شود و ناله پُر اثر — امید وارِ تیر نگاهی نشسته ام ۷؎

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ نازکی کا حسن وتخیل مشاہدے کی دولت سے مالا مال ہے۔۱۹۸۹ء میں جب نازکی

بمقام ''تجر زینہ گیر'' سوپور میں متعین تھے۔تو وہاں کے پُر فضا ایک گاؤں کے نزدیک ''لالہ کول'' کا نالہ ہے جو نہایت خوبصورت ہے۔ نازکی اس کو دیکھ کر متاثر ہوئے اور نظاروں کو دیکھتے قادالکلامی سے ''لالہ کول''۸؎ کے عنوان سے ایک نادر نظم کہی جو بہت مشہور ہوئی۔نظم ملاحظہ ہو۔

حبذا رفتارِ نارِوار لالہِ کول
هست چون فرشِ زمرد جویبارِ لالہ کول
هست مصُروف خرامِ ناز چون جانانۂ
غالباً باشد کسی در انتظارِ لالہ کول
از برائی انتظام نزہت بینند گان
قدِ آدم شیشۂ شد آبشارِ لالہ کول
کیست آن کودستِ افراز دذ خوفت جانبی
اَی چنارِ لالہ کول ای چوبدارِ لالہ کول
نالۂ پہروبگرید زار چون بیند کہ هست
مولد مافوق فوق ۹؎ اندر جوارِ لالہ کول
باغ خادِم آنکہ یکتا هست در اندازِ خویش
هست چون باغِ نشاط وشالہ مار لالہ کول ۱۰؎

نازکی نے رباعی اور قطعات میں بھی طبع آزمائی کی۔اور بہت سارے تاریخی قطعات بھی لکھے ہیں۔نمونہ کلام ملاخط ہو۔

خار گیسوی خلد چون دیدۂ خونبار را
در کمند آرد گفاهم اهوئی تاتاررا
سد راہِ خود نہ دانم وادی و کہسار را
وقفِ در دِتو همی سازم دل بیمار را ۱۱؎

نازکی نے مولوی غلام محمود کی تاریخ وفات (۱۳۵۷ھ) ایک قطعہ کے ذریعہ بیان کی ہیں۔

جہان باکس وفاداری نہ ورزد بدان دلبستگی کاری است بی سود
کسی اندر جہان باقی نماند سوائی ذات پاک حقِ معبود

ز جهت سر کشید می گفت وفاتش دران ز داغ مرگ محمود

کشمیر کے فارسی شعراء نے نعت کو ایک صنف سخن کی حیثیت سے اپنایا ہیں۔ ہمارے شاعر ناز کی نے بھی اس فن میں جو ہر قلم خوب دکھایا ہے۔ انہوں نے اپنی فارسی شاعری کا دامن نعت ومنقبت اور مناجات کے بیش بہا موتیوں سے بھر دیا۔ چنانچہ ان کا نعتیہ کلام زیادہ تر کشمیری شاعری میں ہے مگر فارسی شاعری نعت ان کی مقبول صنف سخن رہی ہے۔ ان کے موضوعات نعت میں حضرت محمد مصطفیٰ کی ذات قدیم ہونا، عظمت پیغمبر خدا، بے ساختگی اور والہانہ وابستگی انکی نعت کی خوبیاں ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی مدح وتوصیف میں یوں رطب اللسان ہیں۔

اللہ اللہ این عنایت یا رسولِ هاشمیؐ
سرنهادم زیرِ پایت یا رسول هاشمیؐ
کاروانِ نسلِ آدم خفته و آشفته بود
خاست از بانگِ درایت یا رسولِ هاشمیؐ
ناز هادرام برین دلِ کاندرو ساکن نشُد
هیچ محبوبے سوایت یا رسولِ هاشمیؐ
یك نگاهِ کیمیا سازی که گردد مستنیر
جانم از شوقِ لِقایت یا رسولِ هاشمی
ارمغان آوردۂ از حق که ماند تا ابد
نسخۂ رشد و ہدایت یا رسولِ هاشمی ۱۲؎

اسی طرح استعارہ کا استعمال جذبے کی طہارت اور شفاعت طلبی اور انکساری کے ساتھ ناز کی صاحب کہتے ہیں۔

نازها دارم که دل دارم توئی یا رسول الله مدد گارم توئی
از غم دنیا و از فکرِ معاد غافلم ، دانم که غم خوارم توئی
از نِگاهم لَرزه گیرد آفتاب جلوه فَرما درشبِ تارم توئی
کعبۂ تعمیر کن از خاكِ من پُورِ ابراهیم ! معمارم توئی
عشقِ بی پرَوائی من گرمِ سفر کشتی و گرداب و طوفانم توئی
تومرا آموختی رمزِ حیات جسم و جانم دین وایمانم توئی
لا و اَلا را نمیدانم که چیست هر چه آید در نظر دانم توئی ۱۳؎

جب ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال لاہوری نے انتقال کیا تو نازکی نے اُن کے فراق میں ایک پُر درد نوحہ لکھا۔ چند شعر ملاحظہ ہو۔

ای کـه دادی قـوم را درسِ حیـات وانـمـودی مـلك را راهِ نـجـاب

داغِ دِل دادی زفـکـر عـرش سـا لالـه زارِ خـطـهٔ کشـمیـر را

خـضـر راهـی بـودهٔ اقـوام را نـغـمـهٔ تـو قـوم را بـانگِ درا

رسـم شـاهیـن شـار را آمـوختـی کـرمِك بـی مـایـه را آمـوختـی

دیـده را هـت عـزیـزان بستـه انـد درغـمت از هر دو عالم رسته اند ۱۴ ۔

نازکی کے ہمعصر شعراء کی فہرست بہت لمبی ہے۔ اُن میں سے چندیوں ہیں۔ میر شمس الدین حیرت، مولانا ت فطرت کشمیری، محمد امین، عبدالحق برق، حسن کاملی، خاموش کریری، طیب شاہ صدیقی ضیغم وغیرہ۔ انہی معاصرین کے ساتھ اکثر سماع کی محفلوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز کی طرف سے میر غلام رسول نازکی کی فارسی، کشمیر اردو اور انگریزی ادب پر گہری دسترس کو دیکھ اُن کے بحرِ علم و بلند خیالی کو مدنظر رکھتے ہوئے خصوصی شمارہ ''شیرازہ'' نکالا۔ بقول پروفیسر ایاز رسول نازکی موصوف کو فارسی زبان کے حوالے سے جب بھی کوئی فاضل، عالم، ادیب یا ریسرچ اسکالر اُن سے کچھ پوچھتے تو فی البدیہ تفصیلاً جواب دیتے تھے اور علم و تحقیق پر اسقدر وسیع مطالعہ تھا کہ جب کوئی اُن کے سامنے فارسی شعراء کا کوئی کلام پڑھتا تھا تو متن سے ہی پہچانتے تھے کہ فلانی شاعر کا کلام ہے۔ بیسوی صدی کا یہ عظیم المرتبت شاعر، ادیب، محقق اور صوفی ۱۷/اپریل ۱۹۹۸ء ۱۵ میں وفات کر گئے۔ نازکی صاحب شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ نازکی صاحب شعر و ادب کا ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور فارسی زبان و ادبیات کے محافظ بھی تھے۔ موجودہ زمانے میں ان کی تصانیف کے مطالعہ کرنے سے نوجوان نسل کو اس حوالے سے آگاہ کرنے کی اشد ضرورت ہیں۔ یہی آپ جناب کے مشن کی صحیح ترجمانی اور آبیاری ہے اور یہی ان کے تئیں سچی عقیدت اور محبت کا اظہار ہے۔

حوالہ جات و کتابیات:۔

۱۔ کاشر زبان تہِ ادبک تاریخ، مصنف، ناجی محمد منور شفیع شوق ص ۳۷۲۔ سال اشاعت ۲۰۱۴ عیسوی، مطبع علی محمد اینڈ سنز سرینگر۔

۲۔ ایضاً ص ۳۷۲

۳۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، از عبدلقادر سروری، ص ۳۲۸، مطبع شیخ محمد عثمان اینڈ سنز سرینگر۔

۴۔ کلیات نازکی مصنف غلام رسول نازکی ترتیب وپیشکش ایاز رسول نازکی، ص۶ تا۱۱

۵۔ نغمہ توحید، مطبوعہ، ص۴۵، جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہے۔

۶۔ کلیات نازکی، ص۳۴۷۔

۷۔ نغمہ توحیدی، ص۵۰۔۵۱

۸۔ ''کول''، کشمیری میں چھوٹے نالہ کو کہتے ہیں جہاں سے قلیل تعداد میں پانی بہتا ہے۔

۹۔ فوق منشی محمد الدین کا آبائی وطن جو ''تاریخ اقوام کشمیر'' کا مصنف بھی ہے۔

۱۰۔ قلمی نسخہ راقم نے ان کے فرزند جس کے پاس مصنف کا اکثر و بیشتر قلمی نسخہ جات موجود ہے سے استفادہ کیا۔

۱۱۔ قلمی نسخہ ترتیب ایاز رسول نازکی غیر مطبوعہ، ص۵۹۔

۱۲۔ نغمہ توحید، ص۵۲۔۵۳

۱۳۔ ایضاً، ص۳۹۔۴۰

۱۴۔ کلیات نازکی غلام رسول نازکی، ص۳۵۵ تا۳۵۸، سال۲۰۱۴عیسوی بترتیب وپیشکش ایاذ رسول نازکی

۱۵۔ کاشر زبان تہِ ادبک تواریخ، ص۳۷۳

☆☆☆

ڈاکٹر احمد حسن ندوی
شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

نعت محمدیؐ: (ضیاء الدین برنی)

ز پای تا بہ سرش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

نعت محمدیؐ ضیاء الدین برنی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ کتاب سیرت طیبہؐ کے موضوع پر ہندوستان میں لکھی جانے والی اولین کتاب ہے، دوسری خاص بات یہ ہے کہ اس کے مصنف ہندستان کے نہایت بالغ نظر مؤرخ مانے جاتے ہیں، اس کتاب میں بھی ان کی تاریخی مہارت دیکھی جاسکتی ہے، لیکن حیرت ہے کہ یہ نہایت اہم کتاب صدیوں تک معرض ذہول میں پڑی رہی، اس کتاب کی دریافت کا سہرا پروفیسر عزیز الدین حسین صاحب کے سر ہے جن کے حسن نظر نے وقت کی دھول میں دبی ہوئی اس کتاب کو اشاعت کے لئے منتخب کیا۔ ضیاء الدین برنی جیسے بالغ نظر مؤرخ کی کتاب کی صحیح قدر و قیمت کا تعین پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی جیسا بالغ نظر مؤرخ ہی کرسکتا تھا۔ میری دعا ہے کہ جس طرح صاحب کتاب نے اس کتاب کو اجر آخرت کی امید پر لکھا اسی طرح اس کتاب کے شائع کرنے پر اللہ رب العزت پروفیسر عزیز الدین صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں ان کا خصوصی طور پر اس لیے بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کو ایڈٹ کرنے کا موقع مجھے عطا فرمایا۔

یہ کتاب سیرت طیبہ پر ہے۔ سیرت نگاری زمانہ رسالت مآبؐ سے ہی ایک اہم فن سمجھا جاتا ہے سیرت کی سب سے پہلی باضابطہ کتاب حضور اکرم ﷺ کے بھانجے حضرت عروہ بن زبیرؓ نے لکھی جس کا نام المغازی تھا۔ بعد میں اور لوگوں نے بھی المغازی کے نام سے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ابن اسحاق نے سب سے پہلے اپنی کتاب کا نام السیر ۃ رکھا اس کے بعد سے یہ پورا موضوع ہی سیرت طیبہ کہلاتا ہے۔

سیرت نگاری کا آغاز پہلی ہی صدی میں ہوگیا تھا تیسری اور چوتھی صدی ہجری تک سیرت نگاری میں روایات کی اسناد پیش کرنا ایک لازمی طریقہ نگارش تھا تاکہ بیان کردہ روایات میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ عرصۂ دراز تک سیرت نگاری میں یہ اسناد بطور استدلال پیش کی جاتی رہی۔ اس کے بعد سند کے طویل سلسلہ کو ختم کر کے صرف آخری راوی

کا حوالہ دیا جانے لگا۔قرون وسطی میں یہ طریقۂ استدلال ترک کر دیا گیا اور اس کے بجائے ان اولین سیرت نگار حضرات کے حوالہ سے روایات بیان کی جانے لگی اور اس کو کافی ووافی سمجھا جانے لگا۔

برصغیر ہندو پاک میں عربی اور فارسی میں سیرت مبارکہ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں صرف عہد شاہجہانی میں حضرت محدث دہلویؒ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ''مدارج النبوۃ'' دو جلدوں میں اپنی یادگار چھوڑی۔حقیقت یہ ہے کہ دور مغلیہ جو برصغیر ہندو پاک میں علوم وفنون کی ترویج کا ایک مثالی دور کہا جاتا ہے، علمی موشگافیوں کا دور تھا۔اس میں خاص اسلامی علوم اور سیرت پر بہت کم کام ہوا البتہ بعد میں سیرت طیبہ پر اردو میں بہت کام ہوا۔

اردو زبان میں سیرت طیبہ کے موضوع پر سب سے پہلے سرسید احمد خان نے مستقلا تو نہیں البتہ ولیم میور کے جواب میں سیرت رسول اکرم ﷺ کے بعض گوشوں اور پہلوؤں پر زبردست دلائل کے ساتھ قلم اٹھایا اور ولیم میور کی لایعنی باتوں کا مسکت جواب دیا۔سرسید کے بعد علامہ عنایت رسول چریاکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بشریٰ'' کا تکملہ تصنیف فرمایا جو سرور کونین ﷺ کی نبوت کے سلسلہ میں تورات اور زبور کی بشارتوں پر ایک گرانقدر تصنیف ہے۔

''بشریٰ'' کے بعد سیرت النبی ﷺ پر محققانہ کام کا آغاز علامہ شبلی نعمانی نے کیا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اپنے قلم سے اس کا تکملہ نہ کر سکے۔اس کا تکملہ ان کے فاضل شاگرد سید سلیمان ندوی نے کیا۔سیرت النبی ۶ جلدوں پر مشتمل ہے۔بعد ازاں سیرت النبی ﷺ پر قاضی سلیمان منصور پوریؒ نے ''رحمۃ للعالمین'' ۳ جلدوں میں لکھی۔یہ تصنیف بہت مقبول ہوئی اور آج بھی اس کی مقبولیت کا وہی عالم ہے۔اردو زبان میں مولانا عبدالرؤف دانا پوریؒ کی ''اصح السیر'' دو جلد بھی ایک گرانقدر اضافہ ہے۔موجودہ زمانہ میں سیرت پر بے شمار کتابیں لکھی گئی۔ہندوستانی علماء نے نہ صرف اردو بلکہ عربی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی کتابیں تصنیف کی، لیکن ہندوستان کے اندر سیرت نگاری کے اعتبار سے اولیت کا شرف عہد سلطنت کے عظیم مؤرخ ضیاءالدین برنی کے حصہ میں آیا۔

ضیاءالدین برنی جو ضیاء برنی کے نام سے مشہور ہیں، سلاطین دہلی کے مؤرخ اور نظم ونسق حکومت پر لکھنے والے ہیں۔ان کی پیدائش ۱۲۸۵ء کے آس پاس کی تھی۔

ضیاء برنی تقریباً سترہ سال محمد بن تغلق کے دربار میں رہے۔سیر الاولیا میں انہیں ایک دلچسپ اور خوش بیان ندیم اور امیر خسرو وامیر حسن کا دوست بتایا گیا ہے۔فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸ء) کے آغاز حکومت میں برنی کو دربار سے برطرف کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد جیسا کہ اس کتاب نعت محمدیؐ کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے وہ کچھ عرصہ بھٹنیر کے قلعہ میں مقید رہے۔

برنی نے اپنی باقی عمر کسمپرسی اور عسرت میں گذاری اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔۱۳۵۷ء کے کچھ

عرصہ بعد اس کا انتقال ہوگیا اور وہ غیاث پور (موجودہ نظام الدین) میں نظام الدین اولیا کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ برنی کی تصانیف میں چار کتابیں اہم ہیں: تاریخ فیروز شاہی، فتاوای جہانداری، نعت محمدی اور برمکیوں سے متعلق حکایات کا ترجمہ بعنوان اخبار برمکیان۔

ہندوستان کے مسلم مفکرین میں برنی کی حیثیت ممتاز اور اہم ہے۔ تاریخ اسلام میں صرف خلفائے راشدین کو معیاری حکمران تسلیم کرتے ہوئے برنی نے فتاوای جہانداری اور تاریخ فیروز شاہی کے ذریعہ اپنے عہد کے سلاطین کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی جانب سے ان کے فرائض کیا ہیں۔ برنی نے فتاوای جہانداری میں سلاطین کو شریعت نافذ کرنے، بدعات خصوصاً گمراہ کن فلسفیانہ خیالات کے ختم کرنے، صاحب زہد لوگوں کو ملازم رکھنے وغیرہ کی تلقین کی ہے اور شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ ساتھ خوف خدا اور عجز و نیاز پر بھی زور دیا ہے۔

ضیاء برنی کی اہم کتاب ''نعت محمدیؐ'' ایک ایسی کتاب ہے جو صدیوں تک پردہ خفا میں رہی اور کسی نے اس پر توجہ نہیں دی یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس کتاب کے صرف نام اور موضوع کا تذکرہ کیا ہے مگر جس طرح ضیاء برنی کی دوسری کتابوں پر کام ہوا اس پر کام نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ یہ نسخہ صرف رضا لائبریری میں موجود ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں۔

''نعت محمدی'' کی وجہ تصنیف سے متعلق ضیاء برنی لکھتے ہیں کہ جب میری عمر ستر سال ہوگئی، قویٰ ضعیف ہوگئے، حواس میں سستی آگئی، ملک الموت کی ملاقات کا خوف دل میں آنے لگا سوچا کہ ایک ایسی دستاویز تیار کروں جو اس دنیا سے جاتے وقت کام آئے۔ آگے لکھتے ہیں جب ماضی کی سیئات اور خطایات کو یاد کرتا تھا زیادہ نا امید ہوتا تھا اور بغیر کسی دستاویز کے اس دنیا سے جانے کے خوف میں زندگی گذار رہا تھا۔ یہ پانچ ماہ کا عرصہ قصبہ بھٹنیر میں قلعہ بند ہوکر اس طرح اضطراب و پریشانی میں گذار رہا تھا کہ اگر صبح ہوتی تھی نہیں جانتا تھا کہ شام ہوگی اور اگر شام ہوتی تھی صبح ہونے کی امید نہیں رہتی تھی۔ اس مشکل حالت میں دل میں خیال آیا کہ سیرت پر ایک صحیفہ لکھوں اور اس تالیف کو آخرت کی دستاویز بناؤں۔ اس خیال سے میں نے یہ تالیف فرمائی اور اس کا نام ''نعت محمدیؐ'' رکھا۔ اور اس کے ذریعہ میں نے اپنے کو مداحین محمدؐ کے زمرہ میں داخل کرلیا۔

''نعت محمدی'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سیرت کی فارسی اور اردو کی زیادہ تر کتابوں میں ابتدائی چار کتابوں سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی، سیرت ابن اسحاق کا حوالہ ملتا ہے مگر اس کتاب (نعت محمدیؐ) میں قرآن وحدیث سے استدلال کیا گیا ہے سیرت کی ان مشہور کتابوں کا حوالہ زیادہ نہیں ملتا جن پر دوسری کتابوں کے مصنفین کا انحصار ہے۔ اسی طرح مصنف کی عربی زبان پر قادر الکلامی بھی اس کتاب سے ثابت ہوتی ہے۔ مصنف نے

قرآن کی آیات اور احادیث کو فارسی جملوں میں جگہ جگہ خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

صحیفہ ''نعت محمدیؐ'' پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں چند فصل ہیں۔ پہلا باب عقل، علم و معرفت اور مکارم اخلاق کے بیان میں ہے۔ یہ باب پندرہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ ہر فصل میں تاریخی حقائق کا بیان ہے اور ان کی تائید میں قرآن کی آیات اور احادیث پیش کی گئی ہیں۔ ضیاء برنی چونکہ فارسی کے ساتھ ساتھ عربی میں بھی دسترس رکھتے تھے اس لئے بیچ بیچ میں قرآن کی آیات اور احادیث بہت اچھے اسلوب میں پیش کی ہیں۔

ان پندرہ فصلوں میں علم وصبر، عفو، آپؐ کے بذل وسخاوت کے کچھ واقعات، شجاعت، خلق، حیاء، اعضائے مصطفیٰ علیہ السلام، فطری نرمی ومحبت، حسن عہد اور صدق وعدہ، آپ کی امانت داری، عفت، عدل، تواضع، ہمنشینوں اور ساتھیوں کے ساتھ معاملات کا بیان ہے۔

دوسرے باب میں گیارہ فصل ہیں، ان میں آپؐ کے زہد، تعبد، قرأت و بکا، روزۂ نفل، نماز چاشت وزوال، طعام وشراب، لباس، مزاح، تبسم وضحک، حلیہ و جمال، سر اور ڈاڑھی کے بال، سرمہ، کنگھی، آیینہ، انگوٹھی، اسلحہ، نعرہ، جھنڈا، سواری اور خیمہ وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

تیسرے باب میں نو فصلیں ہیں پہلی فصل میں وہ خطوط ہیں جن میں آپؐ نے مختلف بادشاہان کو اسلام کی دعوت دی اور بعض وہ خطوط بھی شامل ہیں جن میں مسلم امرا کو احکامات دیے گیے۔ دوسری فصل فال لینے اور فال کی حیثیت کے بیان میں ہے۔ تیسری فصل ان ایام کی تعیین کے بیان میں ہے جن میں آپؐ نے سفر فرمایا اور جب آپؐ واپس آئے تو کس طرح آئے۔

چوتھی فصل آپؐ کے ہاتھ اور پیروں کو چومنے اور مصافحہ وقیام کے سلسلہ میں ہے۔

پانچویں فصل میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ نے احترام کی اجازت دی اور امت کو اکابر کے احترام کی تاکید فرمائی۔

چھٹی فصل ہاتھ دھونے، ٹیک لگانے اور چھینکنے کے طریقہ کے بیان میں ہے۔

ساتویں فصل شفاعت، مریض کی عیادت اور نماز جنازہ کے متعلق آپ کے اقوال وافعال کے بیان میں ہے۔

آٹھویں فصل ایسے کلمات کے بیان میں ہے جو آپؐ کی تعظیم کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ نے کہے یا آپؐ نے ارشاد فرمائے۔

نویں فصل ان منکرات کے بیان میں ہے جو آپؐ سے تحریم وکراہت یا تنزیہ وشفقت کے طور پر صادر ہوئے۔

چوتھا باب: اکیس فصلوں پر مشتمل ہے۔ ان فصلوں میں، اعجاز قرآن، سورج اور چاند کا معجزہ، پانی کا معجزہ جو ضرورت کے وقت آپؐ کی انگلیوں سے چشمہ کی طرح نکلا، کم کھانے کے زیادہ ہونے کا معجزہ، جمادات کا بات کرنا اور آپؐ کی رسالت کی گواہی دینا، غیر ناطق حیوانات کا بولنا اور آپ کی رسالت کی گواہی، مُردوں کا زندہ ہونا اور بات کرنا، نابینا کا بینا ہونا، ناامید

مریض کا صحت یاب ہونا، قطع ہوئے اعضا کا جڑنا، تازہ زخم کا اسی وقت صحیح ہونا، دعا کا قبول ہونا، آپؐ کے ہاتھ اور جسم کے چھو جانے کے اثرات کا ظاہر ہونا، غیب کی خبروں کا معجزہ، عصمت خاص، نبوت کی علامتوں کا معجزہ، بعض متفرق معجزے جو صحابہ کرام سے مروی ہیں، معراج کا معجزہ، مشہور معراج کے علاوہ دوسری معراج جو حضرت علی مرتضی اور انس مالکؓ سے مروی ہے، رویت باری تعالیٰ، عرفا و علماء نے آپؐ کے بارے میں نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے، آپؐ کے علو مرتبہ، علو نسب، آپؐ کی شفاعت عام، مقام محمود اور شریعت و طریقت کا معجزہ وغیرہ۔

پانچویں باب میں سات فصل ہیں جو آپؐ کی رسالت کی تصدیق اور اطاعت، امر و نہی کے وجوب، امت پر آپؐ کی تعظیم، محبت، اتباع سنت، درود پڑھنا، مسجد نبوی کی تعظیم اور روضۂ اقدس کی زیارت وغیرہ کے بیان میں ہیں۔

کتاب کے ابواب و فصول پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے سیرت طیبہ کے جملہ گوشوں پر کلام کیا ہے۔ یہ صرف تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ اسوہ رسولؐ کی کتاب بھی ہے کہ رسول خداؐ کی ذات میں امت کے لئے کیا اسوہ ہے اور امت کا رسول خدا سے کیا تعلق ہونا چاہئے اس کی تفصیلات اس کتاب میں ہیں۔ جیسا کہ مصنف نے خود تذکرہ کیا ہے یہ کتاب بنیادی طور پر توشہ آخرت کے لئے لکھی ہے اس کے باوجود مصنف کا زور قلم ہر جگہ نمایاں ہے۔ زبان اعلیٰ درجہ کی ہے، ہندوستان کے لوگوں نے سیرت طیبہ پر بہت کام کیا ہے اس سب کاموں کی اگوائی کا مقام دست قدرت نے ضیاء الدین برنی کو عطا کیا تھا۔ ہندوستان میں سیرت کی پہلی کتاب ہونے کا شرف بھی اس کو حاصل ہے۔ ایک عظیم مؤرخ کے قلم سے خاص سیرت کے موضوع پر یہ ایک دستاویز ہے۔

☆☆☆

یاورعباس میر
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

امام خمینی کے اشعار میں بعض سیاسی پیشنگوئیاں

خلاصہ: زیرنظر مقالہ میں رہبر انقلابِ اسلامی ایران آیت اللہ سید روح اللہ خمینی کی شاعری میں موجود بعض سیاسی پیشنگوئیوں کا جائزہ لیا گیا ہے راقم الحروف نے ان پیشنگوئیوں کو تاریخ اور واقعات کی روشنی میں صحیح ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ پیش بینی امام خمینی کی بصیرت اور دوراندیشی کی غماز ہے۔ امام خمینی کی اسی بصیرت اور دوراندیشی نے انقلاب ایران کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ مقالہ کے ابتدا میں پیشنگوئی کے بارے میں مختصر سی تمہید اور پھر اصل موضوع کو پیش کرتے ہوئے امام خمینی کے منظوم کلام میں موجود پانچ اہم پیشنگوئیوں کو بیان کیا گیا ہے، جو سیاست کے موضوع پر مبنی ہیں۔ جس میں حکومت اسلامی کی پایداری، دشمنوں کی ناکامی، ملک کی تعمیر وترقی، صدام حسین کی گرفتاری وغیرہ جیسے موضوعات شامل ہیں۔

کلیدی الفاظ: امام خمینی، اشعار، پیشنگوئی، جمہوری اسلامی

تمہید:

پیشن گوئی کرنا اور اس کا سچ ثابت ہونا پیشنگوئی کرنے والے کی بصیرت اور دوراندیشی کی دلیل ہے۔ ایسا پیش گو شخص اپنے علم و بصیرت اور دوراندیشی کی وجہ سے ایسی چیزیں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتیں۔ یہاں پیشنگوئی سے مراد کسی نجومی یا کراماتی شخصیت کی پیش بینی نہیں ہے بلکہ یہ ایک علمی و منطقی عمل ہے۔ لہذا پیشنگوئی جس درجے کی ہو اس کے لئے اتنے ہی درجے کا علم و ادراک اور منطق درکار ہے۔ اس نازک مسئلے کو ہم ایک عام سی مثال کے ذریعے پیش کر سکتے ہیں کہ کوئی میکانیک اگر کسی گاڑی کی جانچ پڑتال کر کے یہ پیشنگوئی کرے کہ اگر اس گاڑی کو مزید دوڑایا جائے تو یہ حادثے کا شکار ہو سکتی ہے، تو اس طرح کی پیشن گوئی ایک ماہرانہ تخمینے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

راقم کی نظر میں ہر عاقل و سمجھدار انسان اپنی زندگی میں چھوٹی یا بڑی پیشنگوئیاں انجام دیتا ہے۔ خواہ وہ اپنی پیشنگوئی کا اظہار کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ چنانچہ جب انسان کبھی کسی کام کی انجام دہی میں تذبذب کا شکار ہوتا ہے تو وہ اس

بارے میں مشورہ اور غور وفکر کر کے کام کے انجام دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پس یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے فیصلہ کی بنیاد درحقیقت اس کے مشورے اور غور وفکر پر مبنی ہے جو دراصل ایک قسم کی پیشنگوئی ہی شمار ہوگی۔

چنانچہ لوگ مختلف طریقوں سے اپنے علم وادراک یا پیش بینی کا اظہار کرتے ہیں۔ شعروادب ہمیشہ اظہارِ خیال کا ایک موثر ذریعہ رہا ہے لہذا اس میں بھی اس عمل کا جگہ جگہ عکس نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر جس میں جوانان عجم کو خطاب کر کے ایک نجات دہندہ کے آنے کی خبر دی گئی ہے:۔

می رسد مَردی کہ زنجیرِ غلامان بِشکند دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما [۱]

بعض دانشمند حضرات اس شعر کا مصداق امام خمینی کو قرار دیتے ہیں کہ جس نے ایران میں اسلامی انقلاب برپا کر کے ایران کو استعمار اور مغرب کی غلامی سے نجات دے دی۔ اسی طرح فارسی ادب کا ایک مشہور قصیدہ گو شاعر انوری ابیوردی نے بھی ایک زبردست طوفان کے آنے کی پیشنگوئی کی تھی جو وقت مقررہ پر غلط ثابت ہوئی اور شاعر کو بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ (۲)

امام خمینی کے اشعار میں پیشنگوئی:

ادبیات فارسی میں ایک اور شخصیت جسے لوگ امام خمینی کے نام سے جانتے ہیں کے اشعار میں بھی کچھ پیشنگوئیاں ملتی ہیں جن کا ہم اس مقالہ میں جائزہ لیں گے۔ امام خمینی (1902-1989) بیسویں صدی عیسوی کے ایک مذہبی اور سیاسی رہنما تھے جو انقلاب اسلامی ایران کے بانی اور رہبر مانے جاتے ہیں۔ فارسی اور عربی زبان میں ان کی ستر سے زائد کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں ان کا فارسی شعری دیوان بھی شامل ہے۔

امام خمینی کی شاعری کا بیشتر حصہ یوں تو عشق وعرفان پر مشتمل ہے لیکن بعض جگہوں پر سیاسی وسماجی موضوعات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ انہیں موضوعات پر امام کے بعض اشعار ایسے ہیں جن کو امام خمینی کی دوراندیشی اور دوررس فہم وادراک پر ایک محکم دلیل قرار دیا جاسکتا ہے۔ گو کہ امام خمینی نے اپنی پیشنگوئیوں کا کہیں پر دعویٰ نہیں کیا ہے لیکن ان کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے پر کچھ پیشنگوئیاں بعض جگہوں پر واضح نظر آتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک پیش خدمت ہیں:۔

۱۔ ''جمہوری اسلامی ایران زندہ اور دیرپا رہے گا''

امام خمینی نے اپنی ایک رباعی میں جمہوری اسلامی ایران کی جاودانی کا ذکر کیا ہے اور اس کے زندہ وجاوید رہنے کی پیشن گوئی کی ہے۔:

جمہوری اسلامی ما جاوید است
دشمن ز حیات خویشتن نومید است

آن روز کہ جہان ز ستمگر خالیست
مارا و ہمہ ستم کشان را عید است (۳)

امام خمینی اس رباعی کے پہلے مصرعے میں اسلامی جمہوریہ ایران کے نہ صرف باقی رہنے کی بات کر رہے ہیں بلکہ اس بات پر مطمئن بھی نظر آتے ہیں، اس لئے کہ آپ نے 'جاوید رہے گا' نہیں بلکہ 'جاوید ہے' کہا ہے۔ جمہوری اسلامی ما جاوید است۔

چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ امام خمینی انقلاب اسلامی کے بعد صرف دس سال بقید حیات رہے اور یہ دس سال بھی ایران کے لئے بہت سخت اور گونا گون آزمائشوں سے پُر تھے۔ شروع میں ہی عراق کی طرف سے مسلط کردہ آٹھ سالہ جنگ اس انقلاب کے لئے بہت بڑا خطرہ بن کر نمودار ہوا۔ ایران کا انقلاب اُس وقت ایک نوزاد بچے کے مانند کمزور اور ناتجربہ کار تھا۔ ایران کے خلاف نہ فقط عراق لڑ رہا تھا بلکہ ایران کے سبھی داخلی و خارجی دشمن عراق کی پشت پناہی کر رہے تھے اور پسِ پشت صدام کے یہ حمایتی ممالک بھی جمہوریہ اسلامی ایران کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ ایسی صورت حال میں اسلامی انقلاب کے مخالفین کو ہی نہیں بلکہ حامیانِ اسلامی انقلاب کو بھی یہ لگ رہا تھا کہ ایران کے اسلامی جمہوریہ کو بہت جلد ختم کر دیا جائے گا۔ عراق نے تو ایران کی اس نئی حکومت کو چند دنوں میں ختم کرنے کی ٹھان لی تھی جبکہ نتیجہ کسی سے پنہاں نہیں ہے کہ جو حاکم ایران کو چند دنوں میں شکست دینے کا سوچ رہا تھا اسے آٹھ سال تک جنگ لڑ کر بھی بالآخر پیچھے ہٹنا پڑا اور جنگ بندی کرنی پڑی۔

جمہوری اسلامی ایران کو ختم کرنے کے لئے ایک اور خطرناک اور بڑا حربہ مالی و معاشی بحران کی شکل میں اپنایا گیا۔ آغازِ انقلاب سے ہی امریکہ کی طرف سے ایران پر معاشی و تجارتی پابندیاں عاید کر دی گئیں تا کہ ایران مالی و معاشی فشار میں آ کر خود ہی دم توڑ دے۔ لیکن یہ سارے مشکلات ایران نے بخوبی برداشت کئے اور اتنے کٹھن مراحل طے کئے جن سے گزرنا عمومی طور پر کسی بھی نظام کے لئے ناممکن دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ آج اس انقلاب کو چالیس سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے اور یہ اب بھی جوں کا توں باقی ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط و مستحکم نظر آتا ہے۔ اتنے سخت حالات کے باوجود انقلاب ایران اور اسلامی حکومت کا باقی رہنا یقیناً حیران کن ہے اور یہ سب دیکھ کر امام خمینی کی یہ پیشن گوئی سچ ثابت ہوتی دکھائی دیتی ہے کہ ''ہمارا اسلامی جمہوریہ زندہ و جاوید ہے''

۲۔ '' ہمارا اسلامی جمہوریہ 'اسلام' کا نشان ہے''

امام خمینی ایک اور رباعی میں یوں فرماتے ہیں:۔

جمہوری ما نشان گر اسلام است

افکار پلید فتنہ جویان خام است
ملت بہ رہ خویش جلو می تازد
صدام بہ دست خود در صد دام است (۴)

غور سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس رباعی میں چار طرح کی پیشن گوئیاں پائی جاتی ہیں۔

پہلی: ''ہماری اسلامی جمہوریت 'اسلام' کا نشان ہے''۔ دوسری: ''فتنہ گروں کے افکار کمزور ہے''۔ تیسری: ''قوم ترقی وفلاح کی راہ پر گامزن رہے گی''۔ چوتھی: ''صدام حسین کی گرفتاری''

ہماری اسلامی جمہوریت 'اسلام' کا نشان ہے:

امام خمینی نے یہ اشعار ظاہر ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد کہے ہیں۔کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اُس وقت ایران پوری دنیا میں اسلامی انقلاب اور حکومت کی وجہ سے توجہ کا مرکز بن گیا تھا لہذا ہر باشعور انسان یہ کہہ سکتا تھا کہ ایران کی اسلامی حکومت، اسلام کا نشان ہے، اس میں کوئی بڑی بات نہیں۔لیکن آج جب ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ دور میں جبکہ انقلاب کو بیالیس سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، اور حکومت ایران ہی وہ واحد اسلامی حکومت ہے جو عصر حاضر کی بڑی بڑی اسلام دشمن طاقتوں سے نڈر ہو کر ٹکر لیتی ہے اور آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرتی ہے۔اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کی نمائندگی اور اس کی عزت وعظمت کی ترجمانی آج اگر کوئی اسلامی ملک کر رہا ہے تو وہ فقط ایران ہے۔دیگر اسلامی ممالک یا تو طاغوت کے آلہ کار بن چکے ہیں یا اپنی خیر منانے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔اس صورتحال سے دوست ودشمن سب آگاہ ہیں۔تو معلوم ہوا کہ ایسے حالات میں بھی امام خمینی کا یہ قول کہ'' جمہوری اسلامی مانشان گر اسلام است'' ایک ایسی حقیقت کا راز ہے جو برسوں بعد پورے عالم پر آشکار ہوا۔لہذا ماننا پڑتا ہے کہ اس قول میں امام خمینی کی دوراندیشی صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے اور یہ پیشنگوئی آج کے دور میں صحیح ثابت ہو رہی ہے۔

۳۔ '' فتنہ گروں کی چال بازیاں خام ہیں''

اس رباعی میں دوسری پیشنگوئی یہ ہے کہ ایران کے خلاف دشمنان ایران کی خام خیالی اور ان کی سازشیں کمزور ہیں۔اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے انقلاب ایران کی چالیس سالہ تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔جس سے پتہ چلے گا کہ انقلاب ایران کو ختم کرنے کے لئے دشمنان ایران بالخصوص امریکہ نے جتنی کوششیں کیں وہ اب تک ان میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔اگرچہ ایران کو نقصان کا سامنا ضرور کرنا پڑا لیکن ایران ایسے سخت ترین حالات میں بھی اپنے انقلاب کی حفاظت کرنے میں کامیاب رہا ہے۔انقلاب کا برقرار رہنا دشمن کی غلط فکر اور کمزور سازشوں کا پتہ دیتا ہے۔اب انقلاب اپنے اندر چالیس سالہ تجربہ رکھتا ہے، جواب پہلے سے کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ایران کی صورتحال

یہ ہے کہ اس کے سامنے دشمن کا ہر حربہ اب ناکام دکھائی دیتا ہے۔اس سے امام خمینی کا یہ قول کہ ''افکار پلید فتنہ جویان خام است''، مبنی برحق وصداقت معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ **''قوم اپنی راہ پر آگے بڑھے گی''**

اس رباعی میں اگلی پیشنگوئی ملت کی ترقی اور اپنی راہ پر آگے بڑھنے کے سلسلے میں ہے۔اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ ایران نے انقلاب کے بعد دشمنوں کے ہاتھوں بہت مشکلات کا سامنا کیا جس کا نتیجہ ظاہراً یہ نکلنا چاہئے تھا کہ ایران ترقی کی راہ میں اقوام عالم سے پچھڑ جاتا۔اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے اگرچہ ایران اتنی ترقی نہیں کر پایا جتنی کہ اسے کرنی چاہئے تھی،لیکن اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ اقتصاد مملکت کی جان ہوتا ہے اگر کسی ملک کا اقتصاد ختم کیا جائے تو یہ ملک کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے،ایران کا گلا گھونٹنے کی بے حد کوششوں کے باوجود ایران نہ صرف یہ کہ زندہ رہا بلکہ کئی میدانوں میں ترقی کر کے خود کفیل ہو گیا ہے۔آج ایران کی خودمختاری کا یہ عالم ہے کہ امریکہ جیسا طاقتور ملک ایران کے سامنے کوئی پیشکش رکھتا ہے تو ایران اس پیشکش کو ٹھکرا کر اپنی طاقت کا کھلم کھلا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔حال ہی میں امریکہ کی طرف سے ایٹمی معاہدہ کے بارے میں یہ بیان جاری ہوا کہ اگر ایران اس معاہدہ کی پاسداری کرے تو امریکہ بھی اس معاہدہ میں از سر نو شامل ہوگا لیکن ایران نے اس پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ''جب تک ہماری اقتصادی پابندیاں اٹھائی نہیں جاتیں ہم اس پیشکش کو قبول نہیں کریں گے''(۵)۔ایران اتنا کمزور ہوتا تو امریکہ جیسا طاقتور ملک اس طرح جھکتا ہوا نظر نہ آتا اور ایران بھی امریکہ کی طاقت سے مرعوب ہو کر غلامی قبول کرتا،جبکہ ایسا نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ایران مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

۵۔ **''صدام کی گرفتاری''**

اگلی پیشنگوئی جو مزکورہ رباعی کے آخری مصرعے میں پائی جاتی ہے وہ صدام حسین کی گرفتاری ہے۔**''صدام بہ دست خود در صد دام است''** صدام حسین عراق کے سابق صدر تھے،جس نے ایران پر آٹھ سالہ جنگ مسلط کر دی تھی۔اسی جنگ کے دوران غالبًا امام خمینی نے یہ رباعی لکھی ہے،جنگ کے بعد امام خمینی صرف ایک سال بقید حیات رہے جبکہ صدام حسین امام خمینی کے بعد تقریباً سولہ سال یعنی ۲۰۰۶ تک زندہ رہا۔جس وقت امام خمینی نے یہ رباعی لکھی ہے تب صدام حسین عراق کے صدارتی منصب پر فائز تھا اور یہ گمان کرنا بھی محال لگتا تھا کہ اسے گرفتار کر کے مارا جائے گا۔لیکن تاریخ گواہ ہے کہ امام خمینی کے انتقال کے سولہ برس بعد صدام حسین کو اپنے ہی خیر خواہ امریکہ نے مختلف جرائم کے الزامات میں پھنسا کر قید کروا دیا اور بالآخر اسے پھانسی کی سزا دے کر مارا گیا(۶)۔صدام حسین بے گناہ تھا یا قصوروار؟ یہ ہماری بحث سے خارج ہے،ہم یہاں صرف تاریخی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔اس سے زیادہ واضح اور روشن پیشنگوئی اور کیا ہو سکتی ہے کہ

تقریباً بیس سال قبل امام خمینی نے صدام حسین کی زندگی کا جائزہ لے کر یہ نتیجہ حاصل کرلیا تھا کہ صدام کے عیار حمایتیوں (امریکہ اور دیگر طاغوت نواز ممالک) نے اس کے اردگرد ایسا جال بچھا دیا ہے کہ جو خود صدام کی آنکھوں سے بھی اوجھل تھا۔ کسے خبر تھی کہ صدام کی ہر رنگ پشت پناہی کرنے والے ہی اس کے جانی دشمن بن جائیں گے۔ جن کی دوستی پر صدام حسین اتراتے نہیں تھکتے تھے بالآخر وہی اسکی زندگی کا خاتمہ کریں گے۔ وہ جنہیں اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا وہی اس کے سب سے بڑے بدخواہ نکلے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بجا ہے کہ صدام حسین نے خود ہی اپنی موت کو حلقہ یاراں میں شامل کیا تھا اور یوں اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی کا پروانہ رقم کیا۔ ممکن ہے تب کسی نے اس بات پر توجہ نہ دی ہو لیکن امام خمینی نے دشمن کی چالبازیوں کو قبل از وقت بھانپ کر ہی شاید ایسا کہا تھا کہ ''صدام بہ دست خود در صدد دام است'' اور آج یہ بات ایک حقیقت بن کر سب کے سامنے واضح اور عیاں ہے۔

مندرجہ بالا چند پیشنگوئیوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امام خمینی جیسے لوگ بھلے ہی ایک معمولی اور سادہ زندگی گزارتے ہوں لیکن ان کا کلام اور پیام عام لوگوں سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ اسی لئے ایسے کلام کو سرسری نگاہ سے دیکھنے کے بجائے اگر اس کا دقت نظری سے مطالعہ کیا جائے تو شاید مطالعہ کرنے والا بھی ایسے اسرار و رموز سے واقف ہوکر اپنی فکر و فراصت کو بلندیوں تک لے جاسکتا ہے۔ امام خمینی کی ان چند پیشنگوئیوں کا سچ ثابت ہونا آپ کی سیاسی بصیرت اور دوراندیشی پر دلالت تو کرتی ہی ہیں ساتھ ہی آپ کے کلام و پیام کی اہمیت و افادیت کو بھی مزید جلا بخشتی ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ گنجور آنلائن ،اقبال لاہوری۔کلیات اقبال، زبور عجم۔چون چراغ لالہ سوزم در خیابان شما

۲۔ مفلس کیمیا فروش، شفیعی کدکنی، سخن،۱۳۷۴دوم،ص۳۳

۳۔ دیوان امام خمینی، چاپ موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ص ۱۹۳

۴۔ دیوان امام خمینی، ایضاً،ص۱۹۵

۵۔ ویب سایٹ: https://www.bbc.com/news/world-middle-east-55177586

۶۔ ویب سائٹ:https://en.wikipedia.org/wiki/Execution_of_Saddam_Hussein

☆☆☆

شازیہ بانو
ریسرچ اسکالر،شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی

غنی کشمیری کی رباعیات

کشمیر قدیم زمانے سے ہی علم و ادب کا مرکز رہا ہے بڑے بڑے عالموں ، ادیبوں اور صوفیوں نے اس سرزمین پر پرورش پای ٔاور ھمیشہ کامیاب اور سرفراز ہوگیے ۔لیکن جس زبان کے ذریعہ انھوں نے کامیابی اور سرفرازی حاصل کی وہ فارسی زبان ہے کشمیر میں قدیم زمانے سے ہی فارسی زبان ایک خاص اہمیت کی حامل رہی ہے کشمیر کے لوگوں نے اسی زبان کے بدولت علم ودانش،ھنر وفن اور مختلف کسب وکار سے آشنایی پایی اوران سب سے بڑھ کر دین مبین اسلام کو قبول کیا۔ قدیم ایران کے مختلف مناطقوں جیسے ہمدان ،خراسان ،تبریز ،اصفہان سے بڑے بڑے علماء ،صوفی کرام ،شعراء اس سرسبز اور شاداب سرزمین پر قدم رکھتے گئے اور پورے کشمیر میں اسلام کی تبلیغ وترویج کرتے رہے اور اسطرح لوگ اسلام کے ساتھ ساتھ فارسی زبان سے بھی متاثر ہوتے گئے ۔ان میں سے بعض اس قدر اس سرزمین کے ساتھ جڑ گیے کہ یہیں پر سکونت اختیار کر کے،اپنے ادبی آثار چھوڑ کر اس دارالفنا سے کوچ کیا۔ یہ زبان ستارہ کی مانند لوگوں کے دلوں کو روشن کرتی رہی علماء وصوفیوں نے اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ فارسی نثر ونظم کی بھی خوب آبیاری کی ۔اس زبان نے کشمیر کے فرھنگ وتمدن پر عمیق نقش ڈال دیے جو نقش آج بھی نظر آرہے ہیں ۔اسطرح فارسی زبان تقریباً سات سوسال پہلے ہی کشمیر میں داخل ہوگئی تھی ۔

کشمیر کی تاریخ کا مطالعہ کر کے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے زیادہ تر سلاطین فارسی زبان کو ہی پسند کرتے تھے یہاں تک کہ ان میں سے کچھ سلاطین فارسی شعر بھی کہتے تھے جیسے سلطان زین العابدین اور یوسف شاہ چک ۔لیکن مغل بادشاہوں کے دور میں فارسی شعروشاعری کا فن عروج تک پہنچ گیا۔ایران سے بڑے بڑے شعراءھندوستان تشریف لایے ،سیر وتفریح کے لیے کشمیر آتے رہے اور یہاں کے خوبصورت اور دلکش مناظر کو دیکھ کر شعر کہتے رہے جیسے صائبؔ،کلیمؔ،قدسیؔ، ظہیرؔ وغیرہ۔

کشمیر کی سرزمین سے بھی ایسے منفرد شعراء اور باکمال صوفی کرام پیدا ہوئے جنھوں نے نامور اور باھنر شاعروں کی صف میں ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل کیا مثال کے طور پر شیخ یعقوب صرفیؔ ،حبیب اللہ حبیبؔ، ملا محسن فانی، ملا

طاھر غنی وغیرہ بعض ایرانی شاعر اس قدر ان شاعروں سے متاثر اور مجذوب ہوئے کہ ایک شعر کے برابر اپنا پورا دیوان دے دیا۔ کشمیر کے شاعروں نے ہر صنف سخن جیسے غزل ،قصیدہ ، رباعی ،مثنوی ، مرثیہ میں طبع آزمائی کی اور پوری طرح سے کامیاب ہوگئے۔

کشمیر کے بڑے اور برجستہ شاعروں اور صوفیوں میں ایک ملا طاھر غنی تھا جنھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ تصوّف میں بھی ایک مقام حاصل کر کے فارسی ادب کو ایک قیمتی سرمایہ عطا کیا۔ غنی آشایی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور علم و دانش کے لحاظ سے یہ خاندان بہت شہرت کا حامل تھا اکثر مورخین اس بات پر اتفاق راے رکھتے ہیں کہ غنی ۱۰۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر چہ ان کی حالات زندگی کے بارے میں زیادہ اطلاعات فراہم نہیں ہے۔ لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ غنی کی زندگی فقر اور تنگدستی میں گذری ہے۔ غنی اکثر گوشہ نشینی کو ہی پسند کرتے تھے اور اپنی سکونت کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ انتخاب کیا تھا اور جب اس کمرے سے باہر نکلتا تھا تو دروازہ کھلا چھوڑتا تھا اور جب واپس لوٹ کر آتا تو دروازہ بند کرتا ہے جوں ہی اس کا سبب چو چھا گیا تو آپ نے کہا کہ اس گھر کا سرمایا صرف میں ہوں اور اگر میں نہیں تو دروازہ کس لیے بند کیا جائے۔ غنی نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے اور کبھی مال و دولت کی تمنّا نہیں کی بلکہ اس کو گدائی سے تشبیہ دیتے تھے اور اسطرح کہتے تھے:

غنیؔ از ننگ نام زر نگیرد که نام زر گرفتن هم گدایی است

علاّمہ اقبالؔ لاہوری نے غنی کی اس صوفیانہ زندگی سے متاثر ہوکر یوں بیان کرتے ہیں:

شاعر رنگین نوا طاهر غنی

فقر او باطن غنی ،ظاهر غنی

غنی نے اپنی ساری زندگی غربت اور تنہائی میں گزاردی اور علیل ہوکر کم عمری یعنی ۱۰۷۹ھ میں ہی اس دنیاے فانی سے رخصت ہوگئے۔

غنی مغل بادشاھوں کے دور میں زندگی بسر کر رہا تھا اس وقت شعر و شاعری کا بازار گرم اور پر جوش تھا۔ غنی کو بھی اس فن سے کافی رغبت تھی۔ غنی نے اس دور کے بلند پایہ شاعر ملا محسن فانی کی شاگردی کی اور ان کے محضر سے فیضیاب ہوتا گیا اور ان کے مواعظ اور عرفانی مجالس سے بھرپور فائدہ اٹھا کر تزکیہ نفس اور تھذیب اخلاق میں کافی جدوجھد کر کے تصوف اور شعر و شاعری میں ایک منفرد مقام پالیا۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ غنی نہ صرف شعر و شاعری، علم فن میں غنی تھا بلکہ معنویت کے لحاظ سے بھی وہ بے نیاز تھا۔ غنی نے تمام اصناف سخن غزل ،قصیدہ ،مثنوی اور رباعی میں شاعری کی اور کامیاب ہوا۔ علاّمہ اقبال اپنی کتاب جاوید نامہ میں اس شاعر کو اس طرح یاد کرتا ہے:

غنی آن سخن گوی بلبل سفیر نواسنج کشمیر مینو نظیر

اگر چہ عمر خیام وسرمد رباعی کے استاد ہے لیکن غنی بھی اس فن میں رباعی گوشاعروں سے پیچھے نہیں رہے اور تقریبا سو سے زیادہ رباعیات کہیں ہیں غنی نے زیادہ تر اپنی رباعیات میں جو موضوعات بیان کیے ہیں ان میں اخلاق، انسان شناسی، اخوت و برادری، علم کی ارزش، قرب الٰہی، ریا کاری سے پرہیز، فقر اور تنگدستی وغیرہ ہیں اور ہر موضوع کو بڑے دلکش اور خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ غنی چونکہ دنیاوی خواہشات اور تجملات سے دور تھا اپنی زندگی فقیری اور غریبی میں بسر کی اور کبھی بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ صرف فارسی شاعری ہی ان کو مسرت اور سکون بخشتی تھی۔ غنی نے بہت سی رباعیات میں اس تنگدستی کا بھی ذکر کیا:

تا فقر شده مقیم کاشانه ما
از گرد امل تهی است ویرانه ما
رفتن به در خانه مردم عیب است
امروز که فاقه است در خانه ما

حضرت علیؑ فرماتے ہیں " اُنظُر اِلیٰ مَا قَال، و لا تَنظُر اِلیٰ مَن قَال "(غرر الحکم ص۱۶۲)' 'یعنی یہ دیکھو کہ کیا کہا ہے یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے' 'انسان کو چاہیے کہ جس سے بھی اور جہاں سے بھی صحیح اور مفید معلومات مل جائے اسے اپنا لے کیونکہ انسان کی زندگی کا مقصد صرف کمال حقیقی تک پہنچنا ہے اور بغیر علم اور عمل کے انسان اس منزل کو طے نہیں کر سکتا۔ غنی نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوے انسان کو علم حاصل کرنے کی تلقین کی اور یہ بھی کہا ہے کہ مفید اور صحیح علم جہاں سے بھی، جس سے بھی ملے اسے لے لو اور یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ بولنے والا کون ہے، کس خاندان سے ہے، کون سے فرقے سے تعلق رکھتا ہے وغیرہ۔

ای در طلبِ کمال سر گرم شتاب
درصورت کس مبین ومعنی دریاب
هر چند عقیق است با آتش همرنگ
دارد بدهان تشنه خاصیت آب

غنی ہمیشہ اپنے کلام کے ذریعہ خدا پرستی اور توحید کا درس دیتا ہے اس کی نظر میں جو بھی انسان دنیا کی عیش وعشرت، چمک دمک سے لو لگائے رہتا ہے اور اسی عیش وعشرت میں ڈوبا ہوتا ہے وہ کبھی اس کمال اور مرتبہ کو حاصل نہیں کر سکتا جس کے لیے اس کو پیدا کیا گیا اور نہ ہی وہ اس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے بلکہ عقلمند اور ہوشمند انسان وہ ہے جو دنیا کو

آخرت کی کھیتی تصوّر کرتا ہے اور اس کی ظاہری چمک و دمک سے بے خبر رہتا ہے اور ایسا شخص اپنی حقیقی منزل تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہوتا ہے اور اللہ کی بارگاہ میں ایک خاص مقام بھی حاصل کرتا لیتا ہے غنیؔ نے اس مطلب کو بڑی خوبصورتی سے اس رباعی میں سمیٹ کر پیش کیا ہے:

هوش است که سرمایه صد دردسراست
فارغ بال آنکه از جهان بی خبر است
در بیضه نمی کند مرغان فریاد
هر چند که بیضه از قفس تنگتراست

خداوند عالم کے کلام پاک میں برے اور سیاہ دل انسانوں کے بارے میں ارشاد ہے: **اُولٰئِکَ کَالاَنعَامِ بَلْ هم اَضَلّ** (سورہ اعراف ۱۷۹) یعنی یہ لوگ چرواہے بلکہ ان سے بھی بدتر۔ جن لوگوں کے دل گناہوں سے سیاہ ہو جاتے ہیں ان کے دلوں پر کسی صحبت اور نصیحت کا اثر نہیں ہوتا غنیؔ چونکہ ایک صوفی شاعر تھا اس کو قرآن کی آیات کا بھی پورا علم تھا اس نے بھی اپنی رباعی میں ان سیاہ دل انسانوں کے بارے میں اشارہ کیا ہے کہ ایسے لوگ چاہے کتنا بھی نیک اور صالح لوگوں کی صحبت میں رہیں۔ ان پر کسی خطاب، نصیحت یا صحبت کا اثر نہیں پڑتا ہے:

بد گرچه دمی چندبه نیکان بنشست
سررشته نیکیش نیفتاد بدست
از تیره دلی پاك نشد خاکستر
هر چند که با آتش و آئینه نشست

انسان اخلاص کے ذریعہ اللہ سبحان کی قربت کو حاصل کر سکتا ہے اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے سارے کام اور اعمال محض اللہ کی خشنودی اور رضایت کے لیے انجام دے کیونکہ جو عمل خالص اللہ کی خشنودی کے لیے انجام نہ دیا جایے بلکہ ریا اور دکھاوے کے لیے ہو، وہ عمل ضائع اور بے فائدہ ہو جاتا ہے غنیؔ نے بھی اس مطلب کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے انسان کو دوسروں کو دکھانے کے لیے عمل انجام دیتا ہے 'خشک زاھد' ہونے سے تعبیر کیا ہے جو لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتا اور اسطرح کہتا ہے:

در فصل بهار پارسا نتوان شد
هم صحبت ارباب ریا نتوان شد
هم فیضی نبردهیچکس از زاهدخشك

سیـراب ز مـوج بـوریـا نتـوان شـد

کشمیر ''رش وار'' یعنی صوفیوں اور عارفوں کی سرزمین کے نام سے مشہور ہیں دنیا کے گوشوں، ہندوستان سے بڑے بڑے صوفی کرام، ریاضت کشوں نے اس پرسکون اور سرسبز سرزمین کی پناہ لی اور عبادت، ریاضت میں محو ومشغول رہیں۔ کئی صوفیوں نے اسی پرسکون جگہ کو اپنا وطن بنا دیا۔ غنیؔ چونکہ خود کشمیری تھا کسی کی جگہ کو کشمیر سے مقایسہ نہیں کر سکا اور کشمیر کو تمام جگہوں سے زیادہ پسند کرتا تھا تمام زندگی یہیں گزاری اگر چہ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے غنیؔ نے ہندوستان کا سفر بھی کیا ہے لیکن سکون نہیں ملا اور اپنی دلگیری کو اپنی رباعی میں اسطرح بیان کیا:

کـرده اسـت هـوای هـنـد دلـگیـر مـرا
ای بـخـت رسـان بباغ کـشـمیـر مـرا
گشتـم ز حـرارت غـریبـی بیتـاب
از صبـح وطـن بـده طبـاشیـر مـرا

غنیؔ نے اپنے کلام میں بیداری اور ہوشیاری کا بھی درس دیا تا کہ انسان فریبکار اور چاپلوس دوست سے امان میں رہیں چونکہ کچھ لوگ ظاہر میں دوست نظر آتے ہیں لیکن ان کا دل کدورت اور دشمنی سے بھرے ہوتے ہیں ایسے لوگ حسد، کینہ اور تکبّر سے لبریز ہوتے ہیں:

ای دل نـخـوری فـریـب اربـاب دغـا
غـافـل نشـوی ز دشـمـن دوسـت نـمـا
هـر چـنـد کـه آستیـن نـمـایـد فـانـوس
در کشتـن شـمـع بـاشـدش دسـت رسـا

غنیؔ نے اگر چہ گوشہ نشینی اور تنہایی میں ہی اپنی ساری زندگی گزاری لیکن اس کے باوجود وہ قدرت کے دلکش اور دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہوتے تھے اور عمیق اور دقیق معنی میں بڑی خوبصورتی سے اس بات کو اشعار کے لباس میں پیش کیا اور دوسرے شاعروں کی طرح موسم بہار دلکش اور دلچسپ انداز میں منظر کشی کی:

بـرخیـز غـنـیؔ هـوای فـرودین اسـت
مـی نـوش کـه وقت بـاده خوردن این است
فـصـلـی اسـت کـه آشیـان مـرغـان چـمـن
از کثـرت گـل چـون سبد گـلچین اسـت

غنیؔ نے اپنی رباعیات میں بھی مہارت دکھائی اور شاعری کے فن کو خوش اسلوبی سے بیان کیا۔ استعارات ،تلمیحات اور تشبیہات کو بڑے جذّاب اور دلنشین انداز میں پیش کیا:

از بس کہ گلی نبود در گلشن ما
خاری نزد است دست در دامن ما
از چشم بد برق نترسیم کہ سوخت
مانندہ سپنددانہ در خرمن ما

غنیؔ کے اشعار پورے جہان میں پھیل گئے اگر چہ غنیؔ خود لوگوں سے بے تعلق تھا۔ ایران کے مشہور شاعر صائبؔ نے جب غنیؔ کے اشعار سنے تو غنیؔ کا مرید بن گیا کیونکہ غنیؔ کے اشعار میں اسقدر حلاوت اور طراوت تھی شاعروں نے غنیؔ کو اپنا استاد مانا اور آج بھی شعراء ان کے اشعار کی داد دیتے ہیں اور ان کے اشعار کی پیروی بھی کرتے ہیں لیکن تعجب کی بات ہے کہ غنیؔ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

از خلق بگوشہ نشستم نہان
میگردد ازاین رہ سخنم گرد جہان
ترسم دیگر سخن شود گوشہ نشین
از خانہ برون آیم اگر ہمچو زیان

غنیؔ قادرالکلام اور سحرالبیان شاعر ہے ان کے ہر شعر سے ایک کیفیت طاری ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر نہیں کہتے بلکہ افکار کے دھاگے میں جزبات سے تر الفاظ کے نگینے جڑتے ہیں۔ ان کی شاعری میں افکار کی گہرائی، جذبات کی فراوانی اور الفاظ کی روانی کا ایسا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے کہ زبان سے بے ساختہ یہ شعر جاری ہو جاتا ہے کہ کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ غنی کی شاعری کو اگر پرکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ ہر صورت کامیاب شاعر نظر آئیں گے۔ غنیؔ محض شاعر نہیں بلکہ اپنی بلند شعری افتاد نے ان کے نام کو سند بنا دیا ہے۔ وہ اپنی کسوٹی آپ ہے۔ ان کے اشعار ہی شاعری کی تعریف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاعری اسے کہتے ہیں جو غنیؔ نے لکھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ غنیؔ کے شعر دل و دماغ میں کچھ اسطرح پیوستہ ہو جاتے ہیں کہ انسان ان اشعار سے ایک دیرینہ لطف اٹھاتا ہے۔ انسان جس قدر بھی اس شاعر کے افکار اور اشعار پر تبصرہ کرے کم ہیں۔

کتابیات:۔

۱۔ پارسی سرایان کشمیر، گ ل تیکو، انتشارات انجمن ایران وھند تھران، ۱۹۲۲ء
۲۔ تذکرہ شعراء کشمیر، پیر حسام الدین راشدی، زین آرٹ پریس ریلوے روڈ لاہور۔ اقبال اکیڈیمی پاکستان ۱۱۶، ۱۳۴۶ء

۳۔دیوانِ غنی کشمیری،غنی کشمیری،سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز،۱۹۸۴ء
۴۔غررالحکم،عبدالواحد احمدی، باشرح وترجمہ رسول محلاتی،دفتر نشر فرھنگ اسلامی قم ایران،۱۳۷۸ش
۵۔فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹر محمد ریاض وصدیق شبلی، نیو بسمہ کتاب گھر،۲۰۱۶ء
۶۔قرآن کریم،انتشارات آیین دانش،قم ایران، ۱۳۹۷ش
۷۔کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ،عبدالقادر سروری،مجلس تحقیقات اردو کشمیر سرینگر۱۹۶۸ء
۸۔کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ،م۔م۔مسعودی، بک میڈیا انڈین پرنٹنگ پریس ڈلگیٹ سرینگر،۱۹۹۳ء
۹۔کشمیر کے فارسی شعرا،محمد صدیق نیاز مند،اویس وقاص پبلشنگ ہاوس،۱۳۳۴ھ

☆☆☆

تنویر حسین ڈار
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
کشمیر یونیورسٹی، کشمیر

کشمیری تہذیب کے سیر وسلوک کی ارتقاء میں حبّی کا کردار

خلاصہ مضمون: مذہب وروحانیت سے وابستگی اور عالم غیب کے اسرار معلوم کرنے کی چاہت انسان کی جبلت میں شامل ہے اللہ کی جانب اس کشش اور احساس کو سمجھا جا سکتا ہے جو انسان کو مقام لاہوت کی طرف راہنمائی کرتی ہے یہ کشش اور احساس ایک مقناطیسی قوت کی طرح ہے جس کو مختلف ناموں سے پکارا جا سکتا ہے مثلاً حقیقت الحقائیق ،اصل قدیم ،مبداء وجود وغیرہ، اس بات میں ذرا بھی شک کی گنجائیش نہیں ہے کہ بنی نوع انسان جب سے اس دہرتی پہ رہنے لگا وہ حقیقت ،اصل وجود، غایۃً الکمال کی تلاش اور جستجو میں تھا تاریخ میں ایک ایسا زمانہ بھی گزرا ہے کہ جب انسان ہر لحاظ سے مجبور تھا نہ کھانے کے لئے کچھ تھا نہ پہنے کے لئے لباس تھا نہ رہنے کے لئے مناسب جگہ، نہ دوا نہ ڈاکٹر اور نہ ہی دیگر سہولیات میسر تھیں لیکن اس کھٹن اور سخت گھڑی اور درپیش گوناگون مشکلات میں بھی وہ اپنے مالک حقیقی کو نہیں بھولا کیونکہ بنی نوع انسان آغاز سے ہی تلاش وجستجو میں سرگرم عمل تھا وہ کسی چیز کی تلاش میں تھا تو اسی لئے وہ کبھی چاند وسورج ،ستاروں، بتوں، سانپ، چوہے، آگ، گوسالہ پرستی وغیرہ کی پرستش اور پوجا کرتا تھا یا مشرق ومغرب کی طرف رخ کر کے اپنی روحانی پیاس کی چارہ جوئی کرتا تھا۔

کلیدی الفاظ: خدا، تصوف، روحانیت، سیر وسلوک، رہبر، تربیت۔

"ریشیت" کشمیری سیر وسلوک کا روپ ہے لفظ "ریشی" ایک ایسا لفظ ہے کہ جس کا زکر کرتے ہی ہر کشمیری کے زہن میں ایک ایسے آدمی کی تصویر آجاتی ہے کہ جو مادی چیزوں سے بے نیاز رہتا ہے وادی کشمیر میں عشق ومعرفت کی روایت صدیوں پرانی ہے جس کی وجہ سے اس کا ماضی نہایت درخشاں اور تابناک رہا ہے اسی بنیاد پر کشمیر کو ریش وار (یعنی سیر الی اللہ کرنے والوں کی وادی) کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے لیکن وادی کشمیر میں ظہور اسلام اور تبلیغ اسلام کے زمانے تک یہ بزرگان غیر منظّم اور زیادہ تر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے دور ویرانوں اور جنگلوں میں ریاضت اور تزکیہ نفس کی مشق میں مشغول رہے حتا کہ کہا جاتا ہے کہ پیر کامل شیخ العالم نے بھی لوگوں سے ارتباط منقطع کر کے کافی وقت ویرانوں میں گزارا تھا

مفت میں تلف ہوئے وقت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ زمانہ برباد ہوا ہے لیکن جب وادی میں باضابطہ طور پر تبلیغ اسلام کا دور شروع ہوا تو ان غیر منظّم ریشی بزرگوں نے آگے آکر اس تحریک کو بام عروج تک لے جانے میں کافی سختیاں اور مشکلات کا سامنا کیا اور بالخصوص شیخ نورالدین ولی نے اس کو دیگر پرانی کشمیری روایتوں سے بالکل جدا کیا اس میں نئی جان اور نیا روح پھونک دیا۔۱

خواجہ حبیب اللہ حبّی جو شمس گنائی کے لقب سے مشہور ہیں وادی کشمیر کے ایک نامی گرامی تاجر خواجہ شمس گنائی کے فرزند ارجمند تھے۔۲ یہ خواجہ شمس گنائی نمک کا بیوپاری تھا حبّی نے جب ابتدائی تعلیم مکمل کی تو والد نے اپنے ساتھ دکان پر بٹھا دیا لیکن خواجہ حبّی اس کام سے مطمئن نہ تھے اور کام میں دل نہ لگاتے تھے کہا جاتا ہے کہ خواجہ حبّی نے کبھی بھی ترازو کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ گاہک سے کہتا تھا کہ جتنا پیسا لایا ہے اتنا سودا لے لو۔

"آنچه ذر آوردی در غلطان بگذار و نمك را وزن كرده ببر"۔۳

کشمیری سیر وسلوک کی ترقی میں حبّی کی خدمات بیشمار ہیں اس کے علاوہ اپنے ایک خاص سبک میں پیروں کاروں کی تربیت کرنا ان کا طرز ہی کچھ اور ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خواجہ حبّی کے عقیدت مندوں میں اضافہ ہونے لگا روزانہ آپ کی خدمت اقدس میں وادی کشمیر کے گوش وکنار سے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا آپ نے سلسلہ کبرویہ کی اشاعت وپھیلاؤ میں جو کارہای نمایاں انجام دیے وہ ناقابل فراموش ہیں۔

خواجہ حبّی کی شہرت کا ایسا دور دورہ تھا کہ بادشاہ وقت جہانگیر شاہ گورکانی بھی ان کے دیدار کے مشتاق ہو گئے اور مع امراء ووزراء کے ہمراہ خواجہ حبّی کی خدمت میں ملاقات کے لئے حاضر ہو گئے:

۔گفت باید به دیدنش رفتن شاید اورا از خاص حق گفتن۔۴

کہا جاتا ہے کہ جب بادشاہ جہانگیر خواجہ حبّی کے پاس پہنچے تو اس وقت خواجہ حبّی کی خدمت میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی اور محفل سماع زوروں پر تھی اور خود خواجہ حبّی پر وجد کی کیفیت طاری تھی اس محفل کو دیکھ کر بادشاہ وقت جہانگیر شاہ نہایت ہی متاثر ہوئے اور خواجہ حبّی سے اپنے حق میں دعا کی گزارش کی اس کے بعد بادشاہ جہانگیر نے خواجہ حبّی کی خدمت میں بہت سارے قیمتی تحائف پیش کئے لیکن خواجہ حبّی نے ان سب کو ٹھکرایا دیا اور کہا یہ ساری چیزیں ضرورت مندوں میں بانٹ دو مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے شعر ملاحظہ ہو:

؎ خواجهؒ گفت این نه در کار مرا نیست که نیست اضطرار مرا

من فنی ام ز خلق مستغنی حاجتم نی به مال و نه به دنی ۵

جب جہانگیر نے اس طرز زندگی اور اس طرز سلوک کو دیکھا تو ان کی طبیعت بہت متاثر ہوئی خواجہ حبّی پیر کامل

،صاحب کرامات، عارف بے بدیل تھے تو دوسری طرف فصیح بیان شاعر بھی تھے اور کشمیر کے نامی گرامی فارسی شعراء میں بھی شمار کیے جاتے ہیں:

خواجہؒ کہ حبیب موسیٰ بود آفتاب سپہر معنا بود
زبدہ عارفان بخوش نسبی ہم محب و حبیب و ہم حبیؒ
متخلص اگر بہ حبی بود شہرہ در عشق و در محبی بود۶

خواجہ حبیؒ پر اکثر و بیشتر وجد وسماع، سکر وحال، شوق وذوق اور عشق کا غلبہ رہتا تھا اکثر قوالوں کی رقص وسماع کی محفل میں وقت گزارا کرتے تھے اور اس شوق کثرت کے زیر اثر نظم واشعار کی طرف مسلسل رجوع کرتے تھے جس کے نتیجے میں خواجہ حبیؒ نے درد سے پر اور سوز وگداز سے لبریز غزلیں کہی ہیں اور کبھی کبھی عشق الٰہی کے اس آتش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے صوفیانہ نغموں اور سماع کا بھی سہارا لیتے تھے۔

۱۰۲۷ء کے آغاز میں شہر سرینگر کو ایک وبائی مرض نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بڑی سرعت کے ساتھ چار سوں پھیلنے لگی اس سے تمام شہر کے لوگ متاثر ہوئے اور لوگوں کی ایک کثیر تعداد موت کے منہ میں چلی گئی اس دہشت اور خوف کے عالم میں کافی لوگ مل کر خواجہؒ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور پوری صورت حال کا جائیزہ پیش خدمت کیا یہ حال سنکر خواجہ صاحب نے کچھ مدت کے لئے اپنا سر جھکا لیا اور خاموش ہوئے خواجہ صاحبؒ نے جب اپنا سر اوپر اٹھایا تو یہ کلمات ان کے منہ سے جاری ہوئے "امشب صبر کنید من در بدل شما می روم" اسی رات کے اندر خود خواجہ صاحبؒ اسی وبائی مرض میں مبتلا ہوکر 19 ذی الحجہ 1027 ،دن منگلوار بعد از نماز عصر 63 سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔نوشہرہ سرینگر میں آپ کا آستان عالیہ زیارتگاہ ہر خاص وعام ہے۔ ۷

خواجہ صاحبؒ نے تصوف اور سیر وسلوک کے موضوع پر بہت ساری کتابیں تصانیف کیں ہیں جن میں کتاب مراۃ القلوب، تنبیہ القلوب، رسالہ تصوف، مقامات حضرت ایشان وغیرہ کے علاوہ اس میں عرفانی اشعار کا ایک بڑا مجموعہ بھی شامل ہے۔آغاز میں حبی ملا محمد حسین آفاقی کے حلقہ شاگردوں میں داخل ہوئے اور ان سے عربی وفارسی زبان سیکھی ۔بعد میں وہ شیخ یعقوب صرفی کی خدمت میں چلے گئے اور صرفی کو اپنا پیر طریقت اور روحانی پیشوا تسلیم کیا اور اپنے روحانی پیشوا کی فرمایشات کے بموجب تن من سے راہ سلوک کے منازل طے کرتے گئے تو صرفی نے انھیں خرقہ ارشاد بخشا اور سالکان راہ حقیقت کی راہنمائی پر انھیں معمور کیا اور صرفی نے حبی کے بارے میں کہا تھا "مشعلی کہ از خوارزم آوردم درنوشہرہ گذاشتم" ۔۸خواجہ صاحبؒ کی خدمات کشمیری سیر وسلوک کی تہذیب کی ترقی اور پیشرفت میں ایک نمایاں اور درخشندہ حیثیت رکھتی ہیں۔جن کو عاشقان عشق الٰہی اور معرفت رہتی دنیا تک اپنا کر خود کو اور اپنے مریدوں کی تربیت کرتے رہیں

گے۔خواجہ حبیؔ نے یہ نکات بڑی ہنرمندی اور مہارت سے شعر کے قالب میں پیش کیئے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو:

ولیکن تکبر کرد شیطان بسجده سر فرو ناوردشیطان
شده مردودی از آن تکبر که تصدیقش نکرد آبی تصور
که مذهب نا مریدی شد بشیطان از آن بر نا مریدان گشت سلطان
پناه از نامریدی از تو گیرم به بی وصف مریدی تا نه میرم
بگفت ابلیس راضی با تو هستم کمر در خدمت غیرت ببستم
ز مشت خاك آدم آفریدی مرا از آتشی هم آفریدی
چرا آتش کند سجده باین خاك که آتش شد بلند از خاك بی باك
ولی شیطان ز عرفان بود مردود ز وصف آن خلیفه دورتر بود
خلیفه مظهر اسمای حق است خلیفه مخزن اشیای حق است
خلیفه مطلع انوار مولیٰ است خلیفه مجمع اسرار مولیٰ است
خلیفه منظر حسن و جمال است خلیفه مظهر عز و جلال است
نه منظر بلکه عین ناظر است او نه مظهر بلکه عین ظاهر است او(۹)

مندرجہ بالا مسطورا شعار میں خواجہ حبیؔ نے خلیفہ کے صفت و اوصاف، ان کی اہمیت وافادیت اوران کے مقام و منزلت کی طرف اشارہ کر کے دراصل پیر و مرشد کے مقام و منزلت اور معرفت و مریدی کی طرف ہماری راہنمائی کی ہے خواجہ صاحبؒ نے شیطان کا ذکر کر کے کہا کہ اس نے تکبر کیا، اپنے رب سے بحث کیا، امرالٰہی کو ٹھکرا کر خلیفہ برحق کو سجدہ کرنے سے انکار کیا، کیوں ایسا ہوا وہ اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شیطان معرفت، اصل وجود، سرچشمہ کمال اور عشق حقیقی سے نابلد ہونے کے ساتھ ساتھ خود پسند اور نہایت درجہ مغرور تھا شاعر مشرق علامہ اقبال نے بھی اس کی طرف ان اشعاروں میں ذکر کیا:

نوری نادان نیم که سجده به آدم برم او به نهاد است خاك من به نژاد آذرم
می تپد از سوز من خون رگ کائنات من به دو صرصرم، من غو تندرم
آدم خاکی نهاد دون نظر و کم سواد زاد در آغوش تو پیر شود در برم

اس کے علاوہ وہ مریدی کے وصف سے بھی عاری تھے یعنی اپنا مرشد اور رہبر کسی اور کو تسلیم کرنا ان کی سرشت میں شامل نہ تھا یہی سب سے بڑی وجہ ہے خواجہ حبیؔ اللہ تعالیٰ سے نامریدی کی برائی سے پناہ مانگتے ہیں اس کے بعد خواجہ حبیؔ نے

خلیفہ کے ان تمام صفات کو گنا جن سے شیطان بے خبر تھا مثلاً خلیفہ اسمای حق کو آشکار اور شرح کرنے والا ،خدائی اشیاء کا خزانہ اور خلیفہ مخزن اسرار ہوتا ہے اس کے علاوہ نور خدا کے طلوع ہونے کی بھی جگہ ہے۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ ہر کسی سے یہ معرفت کا بوجھ نہیں اٹھ سکا بلکہ یہ بھی بامعرفت لوگوں کے حصے میں ہی آیا۔شعر ملاحظ ہو:

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بوجھ اٹھا کہ یہ بلا بھی تیرے عاشقوں کے سر آئی

خواجہ حجی نے دیگر نفسانی برائیوں کا بھی زکر نہایت ہی دلکش انداز میں کیا ہے اسی طرح خود پسندی کی مزمت میں خود کو خود پسندی سے دور رہنے کی دعا کرتے ہیں:

ے ز کرد خودپسندی کن دلم پاك که شد برباد عمر توده خاك

خواجہ صاحب خدا سے علم ودانش کے علاوہ اپنی معرفت کا طلب کرتا ہے۔شعر ملاحظ ہو:

ے بمن کن ذره ذره روشن از نور زمن کن دفعه دفعه ظلمتم دور

آنکھوں اور کانوں کی برائیوں اور قساوت قلبی سے نجات مانگتے تھے۔شعر ملاحظہ ہو:

ے غشاوت دور دور از سمع و بصر کن قساوت از دل و جانم بدر کن

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اے اللہ اگر آپ نے مجھے انسانی شکل وصورت میں خلق کیا لیکن تو مجھے انسانی صفات سے آرائستہ بھی فرما۔شعر ملاحظہ ہو:

ے چو بخشیدی مرا صورت ز آدم بکن از سیرت آدم تو شادم

خواجہ صاحب اللہ تبارک وتعالی سے کس طرح التماس کرتا ہے دعا کرتا ہے کہ مجھے حقیقی راہ دین وشریعت دکھا اور مجھے شریعت،طریقت،حقیقت اور درست راہ سیر وسلوک کی طرف راہنمائی کر۔شعر ملاحظہ ہو:

تن من از شریعت کن تو روشن دل من از طریقت کن تو گلشن
دلم کرد چو آباد از طریقت روانم کن منور از حقیقت
ره از علم لیقینم توشئه دل با این توشه کنم قطع منازل

مندرجہ بالا مذکور اشعار میں راہ سیر وسلوک کے منازل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خواجہ حجی اللہ سے دعا مانگتا ہے کہ مجھے علم الیقین عطا کر۔تا کہ میں عرفان کے مقام ومنازل کو بخوبی طے کرسکوں اور علم الیقین کے بعد عین الیقین پھر اس کے بعد حق الیقین کا بھی مطالبہ کرتا ہے شعر ملاحظہ ہو:

ے چو از عین الیقینم دل شود شاد پس از حق الیقینم شد جان باد

شراب ناب اور عشق ومعرفت کے شراب کی تمنا کرتے ہوئے خواجہ حجی فرماتے ہیں:

می خمخانه عالم بنوشم هم از هل من مزید میخروشم
به ملك دل نشینم فارغ البال کشم من کاسئه کاسئه باده آل

خواجہ صاحبؒ شراب سے مطلق وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ میرا شراب سے مراد دنیاوی شراب نہیں ہے بلکہ یہ عشق ومعرفت کے علم سے آگاہی، رموز واسرار الٰہی اور راہ سیر وسلوک کی شراب ہے وغیرہ۔شعر ملاحظہ ہو:

مراد از می مرا جز معرفت نیست
می رز را بجز حرمت صفت نیست

شیطانی نفس کی مزمت میں خواجہ جیؒ کہتے ہیں:

مکن چون آن مرید نفس شیطان نماید شیخی خود بهر یك نان

پیر کامل، مرشد، رہبر اور ولی اللہ کی صفات بیان کرتے ہوئے خواجہ جیؒ فرماتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو:

نداند هر زمان پیران که هستند همیشه مست از جام الستند
امانت دار این دین رسولند مقیم مسند صدر قبولند
گهی در گریه گهی در خنده باشند گهی در حلّه گه در ژنده باشند

عشق ومعرفت کی حقیقت اور گمنامی کی وصف میں خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو:

ز قید این و آن آنکه باشند نه هرگز شاد و نی ناشادباشند
نشانی شان در اینجا بی نشانی است درون آشکاری هم نهانی است
چو ماهی همدم اهیم هر دم ولی غافل ز آب معنیش هم

خواجہ صاحبؒ اپنے پیر کامل، راہ سیر وسلوک کے رہبر خواجہ شیخ یعقوب صرفی کی وصف میں، اس کی اہمیت، مقام ومنزلت کے بارے میں اور ان کو پیر کے لقب سے کس طرح یاد کرتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو:

بیا حبیؒ مگو دیگر فسانه بگو اوصاف آن پیر زمانه
شهنشاهی به ملك مرشدی کیست ازو نام و نشانی هم بگو چیست
زهی پیری که ایزد راست محبوب بود نام شریفش شاه یعقوب
به اوج رهبری چون آفتاب است برج رهروی چون ماهتاب است
عجب قطبی که برروی زمین است به قطب آسمان زینت ازین است
الهی کاش می بودم سگ او همیشه بودمی تا در تك او

بفرمانش شوم اندر تگ و پو نگردانم ز فرمانش گہی رو
بود مہری درون امر پیران بود زہری در امر نفس و شیطان(۱۰)

خواجہ صاحبؔ ایک برہمن کی داستان نقل کرتے ہیں کہ جو ہمیشہ خلاف نفس عمل کیا کرتا تھا۔جس کے سبب وہ ایک اعلیٰ وار بلند مقام تک پہنچے ہوئے تھے۔خواجہ جیؔ کہتے ہیں کہ ایک دن ان کے پاس ایک صاحب کرامت اور بلند پایہ کے ایک ولی کا گذر ہوا۔ان سے ان کا حال پوچھا تو انھوں نے اپنی داستان سنا دی یہ سنکر اس مسلمان بزرگ نے ان کو دعوت اسلام دی اس برہمن نے کہا کہ آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں میں اس پر غور وفکر کروں گا جب اس برہمن نے اپنی نفس کی طبیعت دیکھی تو وہ ناخوش تھی جب انھوں نے دیکھا نفس اس دعوت کو قبول نہیں کرنا چاہتا ہے تو اس نے نفس کے برخلاف کر کے دعوت اسلام کو قبول کر کے کلمہ لا الہ اللہ پڑھا۔شعر ملاحظہ ہو:

شنیدم یك برهمن گوشه نشین بود بقهر نفس چنینش بر جبین بود
از آنرو صاحب اسرار بوده که بر نفس خودش قهار بوده
رسید آنجا بزرگی مرشد دین خدا ترس و خدا دان و خدا بین

اس کے بعد خواجہ صاحبؔ نے چند ایک صفات رزائیل مثلاً بخل،غصہ،لالچ،کینہ،شہوت،فخر وغیرہ وغیرہ کے علاج ومعالجہ کا بھی طریقہ بتا دیا۔شعر ملاحظہ ہو:

بود داروی بخل از جود لازم دوای خشم باشد حلم دائیم
دوای حرص باشد ترك و تجرید دوای حقد از ترس و تهدید
دوای شهوت آمد خوردن کم جدا بودن زآنکه نیست محرم

بنی نوع انسان کو خدا کے تئیں جو غفلت اور عدم آشنائی کے جو پردے پڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے خدائی طاقت،قدرت کے کرشمے،احسانات،خدائی قہر،لطف وعنایت،درگذر وبخشش کے علاوہ دیگر کتنی ساری نعمتیں ہیں جن کو انسان فوراً فراموش کرتا ہے۔اس ضمن میں خواجہ جیؔ انسان کی اس غفلت کو ایک داستان کے ذریعے ہمیں سمجھانا چاہتے ہیں کہتا ہے کہ ایک جاہل اور غافل انسان نے بیٹے کو اپنے کندھے پر سوار کیا اور تھوڑی مدت کے بعد ہی وہ بھول گیا اور بیٹے کو ڈھونڈنے لگا۔وہ مارا مارا کوچہ وبازار اور گلیوں میں دیکھنے لگا اسی اثنا میں وہ بازار میں ایک مرد سے مخاطب ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا آپ نے میرے بیٹے کو نہیں دیکھا ہے؟اس مرد خدا نے جواب دیا کہ اس کی شکل وصورت،رنگ وقد کے بارے میں بھی تو بتاؤ،انھوں کہا قد اس طرح ہے چہرے کا رنگ ایسا ہے اور کپڑے اس طرح سے پہنے ہیں یہ سنکر اس مرد نے کہا کہ جو بچہ آپ کے کاندھے پر ہے کیا ایسا ہی ہے؟

خواجہ جتی اس حکایت سے ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس مرد کی طرح خدا ہمیشہ انسان کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے یہ ہماری لاعلمی اور جہالت ہے یہ ہماری روح کی پستی ہے کہ جو ہم اس کو احساس نہیں کر پاتے ہیں اور کسی اور جگہ ڈھونڈنے چلے جاتے ہیں۔اور اس حوالے سے تو حدیث قدسی میں بھی اشارہ ہوا ہے کہ "نحن اقرب الیہ من حب اللورید" ہم آپ کے رگ جان سے بھی قریب ہیں۔اس کے علاوہ رہبر کی ضرورت کو بیان کرتے ہوئے خواجہ جتی ایک داستان "ذبدۃ الاولیاء" حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانی سے نقل کرتے ہیں کہ ان کی خدمت میں ایک دفعہ ایک شخص نے رہبر کی ضرورت کو جھٹلایا تھا۔کہتے ہیں کہ کچھ مدت کے بعد ہی اسی شخص کو ایک سفر درپیش آیا اور اپنی منزل تک پہنچنے کا راستہ ان کو معلوم نہ تھا ابھی زیادہ دور تک نہیں چلا تھا کہ وہ گم ہو گئے اس کے بعد ان کا گھوڑا پیاس لگنے کی وجہ سے زیادہ دیر تک ٹک نہ سکا اور وہ مر گیا اور اس کے پاس جو مال و منال تھا وہ بھی چوروں نے لوٹ لیا اب تھکا اور خستہ حالت میں ایک جگہ بڑا اداس اور غمگین بیٹھ گیا سوچتے سوچتے ان کو خیال آیا کہ اگر مجھے اپنی منزل تک پہنچنا ہے تو ایک رہبر کے بغیر میں نہیں پہنچ پاؤں گا۔یہ رہبر ہی ہے کہ جو مجھ کو اپنی منزل مقصود تک بغیر کسی تکلیف کے اور صحیح وسالم پہنچائے گا، پھر اس کے بعد ایک نزدیکی گاؤں کا رخ کرتے ہیں اور اپنے لئے ایک رہبر منتخب کرتا ہے اس کے بعد رہبر کے ساتھ چل کر وہ اپنی منزل تک بغیر کسی تکلیف کے پہنچ جاتا ہے سفر سے واپس آ کر سیدھے علاء الدولہ سمنانی کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کر کے رہبر کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے۔مرشد اور رہبر کی صحبت اختیار کرنے کے لئے پہلے چند ایک شرائط کا تسلیم کرنا بہت ضروری ہے اس ضمن میں خواجہ جتی کہتے ہیں کہ پہلی شرط جو ہے وہ ربط قلب ہے شعر ملاحظہ ہو:

مراد از ربط بین پیوستن دل — بہ پیر مرشد کامل مکمل
جدا کردن بوی اہل و عیالی — جدا کردن ز دل مال و منالی
کمر بستن درون خدمت پیر — رعایت کردن از دل حرمت پیر(۱۲)

دوسری شرط خواجہ جتی نے تسلیم کو بتایا ہے اور کہتے ہیں:

دوم شرط است اینجا شرط تسلیم — چنینم پیر کامل کرد تعلیم
دگر تسلیم چون مردہ بہ غسال — نہ جنبش می کند او در ہمہ حال
کند پاکش تمام از لوث دنیا — بہ صابونش بشوید تا سرو پا
معطر می کند اعضائی مردہ — ملبس می کند اجزای مردہ

تیسری شرط کے حوالے سے خواجہ کہتے ہیں:

سیوم شرط است ترک اعتراضت — کہ این شرط است اصل ریاضیت

اگر آید از و چیزی مخالف مکن زان اعتراض تو بعارف

عرفان کے اس حصے کو سیر وسلوک کا علم کہا جاتا ہے جس حصہ میں سالک کو انسانیت کی بلند ترین چوٹی یعنی توحید تک پہنچنے کی کہاں سے سفر شروع کرنا چاہے تاکہ وہ حضرت صمدیت کے قریب آ جائے۔۱۳ آخر کار خواجہ حبّی کی عرفان و تصوف کی اپنائی ہوئی روش کو دیکھتے ہوئے یہ امر اور بھی واضح اور عیاں ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ جو نام عرفان وتصوف اور پیرو مریدی میں ہماری وادی کشمیر نے کمایا ہے وہ دلفریب اور منفرد ہیں برابر اس کے شایان شان ہی خواجہ حبّی کی مریدی اور مرشدی کے مختلف پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں خواجہ حبّی نے شیخ یعقوب صرفیؒ کی مریدی میں آ کر سیر وسلوک اور عشق ومعرفت کے مختلف منازل طے کر کے ان کے شاگردوں میں ایک خاص مقام حاصل کر کے پیر ومریدی کی اس تہذیب وثقافت کی ترویج میں بھی ایک اہم رول ادا کر کے اس کو مزید استحکام بخشا۔صرف یہی نہیں بلکہ آنے والے وقت میں اس سے منسلک ہونے والے افراد کے لئے ایک ہموار راستہ بنا رکھا۔اس حوالے سے بڑے اعتماد کے ساتھ،خواجہ حبّی کی سوانح حیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اور اس کے علاوہ بالخصوص مختلف تاریخی اور قابل اعتماد منابع و مآخذ کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ حبّی بذات خود ایک فرمانبردار اور لائق شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مہربان اور شفیق مربی بھی تھے یہی چیز خواجہ حبّی کی خوبصورتی میں قابل قدر اضافہ کر دیتی ہے جس سے آج تک اسکالر،مصنفین ،اساتذہ،طالب علموں کے علاوہ خاص طور پر ان کے چاہنے والے یاد کرتے ہیں اتنا ہی نہیں جو لوگوں کو مشکلات میں دیکھ کر تڑپتا تھا اور کہے آپ کچھ وقت صبر کریں میں آپ کے بدلے خود کو قربان کر دوں گا تو اس طرح سے خواجہ صاحبؒ شیخ سعدی کے ان چند اشعار کے مصداق بنے شعر ملاحظہ ہو:

بنی آدم ز اعضای یك دیگرند که در آفرینش ز یك گوهرند

چون عضوی به درد آورد روزگار دیگر عضو ها را نه ماند قرار

اس سے بڑھ کر راہ سیر وسلوک،عشق وتصوف اور معنوی آگاہی ومعرفت کیا ہو سکتی ہے؟ادہر صرف اتنا کہا اور چند گھنٹوں کے بعد ہی خدا کے پاس پہنچے۔ادہر عوام الناس سے خدائی قہر ٹل گیا۔اسے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان ارتباط کس قدر محکم اور مضبوط تھے کہ ادھر بندے نے آرزو کی ادھر خدا نے کہا قبول ہے آج کی اس ماڈرن اور نیوکلیر دنیا میں یہ ناممکن لگتا ہے اس کی وجوہات کیا ہیں؟ہم سب جانتے ہیں کہ یہ آج کی دنیا میں کیوں مشکل اور ناممکن لگتا ہے کیونکہ نہ کبھی ہم نے پیر اختیار کیا،نہ کبھی چلہ کاٹا اور نہ ہی ہمیں معنویت کی طرف کسی نے رہبری کی ہے بلکہ ہمیں پتہ ہی نہیں ہے کہ معنویت اور سیر الہ اللہ کیا ہے،ہم بھول گئے ہیں کہ ہماری وادی کشمیر کو کسی زمانے میں "ریش وار"(سیر الہ اللہ کرنے والوں کی وادی) کہا جاتا تھا مختصراً عرفان وتصوف اور راہ سیر وسلوک کشمیری تہذیب وثقافت کی تاریخ کا

ایک اہم اور بڑا حصہ ہے کشمیر کی عوام الناس پیرومریدی کے بطور خاص معتقد تھے روحانی اشخاص سے کسب فیض کرنا کشمیر کی ایک پرانی روایت رہی ہے تو اس ضمن میں اس تہذیب وثقافت میں خواجہ حبّی نے بے شمار خدمات انجام دے کر اس کو چار چاند لگا کر اس سے ترقی کی بلندیوں تک پہنچایا۔خواجہ حبّی ایک شفیق باپ کی طرح عوام الناس سے دکھ درد کو دور کرتا تھا ہمیشہ غریب اور نادار لوگوں کی دادرسی کرنے میں پیش پیش تھا اس طرح کی دیگر خوبیوں کی وجہ سے لوگوں کی ایک کثیر تعداد ان کی دلدادہ تھی جس سے کشمیری معاشرہ اور سماج میں لوگوں کے درمیان پیار ومحبت ،آپسی بھائی چارگی اور صلح وآشتی پیدا ہوئی اور اس طرح سے ہمارے معاشرے میں ترقی کے ساتھ ساتھ امن وامان قائیم ہوا کیونکہ جس قوم وملت کے لوگوں کے درمیان اتحاد ہو وہی قوم باقی رہ سکتی ہے وہی قوم ہر میدان میں ترقی کر سکتی ہے۔

حوالہ جات وکتابیات:۔

۱ واقعات کشمیر،محمد اعظم دیدمری،مترجم ڈاکٹر شمس الدین احمد،ناشر،جموا ینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر سرینگر،طبع پنجم ۲۰۱۹م،ص،۱۰۳،۱۰۴

۲ کشمیر کے فارسی شعراء،محمد صدیق نیازمند،ناشر،جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۱۹۹۴،ص،۱۵۳

۳ فتحات الکبرویہ،عبدالوہاب نوری،برگ ۳۹۰،قلمی نسخہ

۴ رسالہ تصوف ومراۃ القلوب،حبی کشمیری،مترجم،پیر غلام نبی،ناشر،آفاق پرنٹرس سرینگر ۲۰۰۰،ص،۱۵

۵ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص،۱۶

۶ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص،۱۸

۷ واقعات کشمیر،محمد اعظم دیدمری،مترجم ڈاکٹر شمس الدین احمد،ناشر،جموا ینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر سرینگر،طبع پنجم ۲۰۱۹ م،ص،۲۰۶

۸ کشمیر کے فارسی شعراء،محمد صدیق نیازمند،ناشر،جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۱۹۹۴،ص،۱۵۴

۹ تنبیہ القلوب،حبیب اللہ نوشہری کشمیری،مترجم پیر غلام نبی،مطبع،شالیمار آرٹ پریس سرینگر ۱۹۹۳ء،ص ۲۸

۱۰ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص،۳۱

۱۱ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص،۴۴

۱۲ اسلامی علوم کا تعرف،شھید مرتضٰی مطہری،مترجم،سید محمد عسکری،ناشر،سازمان فرھنگ وارتباط اسلامی،تہران ۱۴۱۷ ھ،ص ۲۳۴

☆☆☆

پروفیسر رضوان اللہ آروی
پٹنہ، بہار

بہار کے فارسی اساتذہ سیریز۔۵

پروفیسر عطا کاکوی۔اس چمن کی تھی آبرو اُن سے

خدا بخش لائبریری کے لوگو (Logo) پر فارسی کا ایک مصرع درج ہے ۔'ز بہر روشنی دل مرا ندیم کتاب'۔ پروفیسر سید شاہ عطاء الرّحمٰن صاحب عطا کاکوی اس مصرع کی مجسم تصویر تھے ۔انہوں نے اپنی پوری زندگی خدا بخش لائبریری کی آغوش میں اور کتابوں کی صحبت میں گزاری اور اس سے حاصل ہونے والی روشنی سے علمی دنیا کو منور بھی کرتے رہے ۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی لائبریری سے ان کی وابستگی برقرار رہی ۔مخصوص وقت، مخصوص نشست اور مخصوص موضوعات پر مخصوص مخطوطات کا مطالعہ۔لائبریری ان کی دنیا تھی اور کتابیں ان کی زندگی ؎

لشکر ہے نہ پرچم ہے نہ دولت ہے نہ ثروت ہیں خاک نشینوں کے نشاں اور طرح کے

کتابوں میں فنائیت کے اسی شب و روز نے خود ان کی ذات کو ایک چلتے پھرتے کتب خانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ بڑے بڑے محققوں اور دانشوروں کو میں نے دیکھا کہ وہ فارسی تذکرہ و تاریخ، شعر و ادب اور تحقیق و تنقید کے حوالے سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے اُن سے رجوع کرتے اور چند ہی لمحے میں مطلوبہ اطلاعات ان کے ہاتھ میں ہوتیں ؎

فرصت ملے تو آمرے خلوت کدے میں سن دیوان میں کہاں جو سخن چیدہ چیدہ ہیں

پروفیسر سید حسن کے بعد، پروفیسر شاہ عطا کاکوی فارسی کے دوسرے ایسے استاد تھے جنہیں بازاروں میں یا دنیا کے کسی اور کام میں مصروف دیکھنے کی حسرت میرے دل میں رہ گئی۔ کیا لوگ تھے جو دنیا کو تیاگ کر بھی مطمئن تھے اور ایک ہم ہیں جو دنیا حاصل کر کے بھی اطمینان کی دولت سے محروم ہیں ؎

یہ کیسے لوگ ہیں یارب! جو مر کر بھی نہیں مرتے یہاں تو زندگی میں زندگی کا شائبہ کم ہے

پروفیسر شاہ عطا کاکوی کتابوں اور مخطوطات میں گم ہونے کے باوجود زاہد خشک نہیں تھے ۔لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان کی علمی شخصیت کا ایک ایسا حصّہ تھی جس نے ان کی ذات میں کشش اور دلکشی پیدا کر دی تھی ۔صرف دو مثالیں دیکھئے ۔ ۱۹۶۷ء میں ان کی مجموعی علمی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند نے انہیں سند اعزاز سے نوازا ۔لوگوں نے

مبارکباد دی تو کہنے لگے۔کیسی مبارکباد! اعزاز پانے والوں میں ناچنے گانے والے بھی تھے جن کے ساتھ میں بھی کھڑا تھا۔ دوسری مثال ۔ خدا بخش لائبریری کی نئی عمارت بن کر تیار ہوئی تو اس زمانے کے صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ اس کا افتتاح کرنے کے لئے پٹنہ تشریف لائے ۔اس موقع پر مقامی انتظامیہ نے تحفظ کے پیش نظر مہمانوں کی نشست کا خاص انتظام کرتے ہوئے خواتین کی قطار الگ رکھی تھی ۔ پروفیسر شاہ عطاء الرّحمٰن صاحب غالباً اس خصوصی انتظام کو سمجھ نہیں پائے اور خواتین کی قطار میں جا کر بیٹھ گئے ۔لائبریری کے ایک اہلکار نے ادب سے عرض کیا۔حضور! یہ خواتین کی قطار ہے۔ کہنے لگے۔تو بھلا، اس عمر میں مجھ سے انہیں کیا خطرہ ہے۔

فارسی زبان وادب کی اس یادگار شخصیت کا ظہور، کاکو ضلع جہان آباد میں ۱۷ر ستمبر ۱۹۰۴ء میں ہوا۔ حالانکہ میٹرک کی سند میں ان کا سال ولادت ۱۹۰۵ء درج ہے۔لیکن بعد کے محققین نے ۱۹۰۴ء کو ہی صحیح سال ولادت تسلیم کیا ہے۔ان کے والد سید شاہ غفور الرّحمٰن حمؔد کاکوی بھی اردو و فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے اور وحید الہ بادی جیسے مستند شاعر سے انہیں تلمذ حاصل تھا۔ چنانچہ اپنے خانوادے کی اس ادبی وشعری وراثت کو نہ صرف عطا کاکوی صاحب نے بلکہ ان کے بھائیوں نے بھی مل کر سنبھالا اور یوں یہ گھرانہ 'ایں خانہ تمام آفتاب است' کا مصداق بنا۔عطا کاکوی صاحب کے بڑے اور منجھلے بھائی شاہ ولی الرّحمٰن ولی کاکوی اور شاہ منظور الرّحمٰن اختر کاکوی بھی شاعرانہ ذوق کے حامل تھے۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق:

'یہ پورا گھرانہ چھ پشتوں سے علمی وادبی ذوق کا حامل تھا'

(رسالہ بھاشا سنگم، پٹنہ۔مشاہیر بہار نمبر۔حصّہ ۔۲ ص۔۲۱)

بجھی آتش دل اندھیرا ہوا وہ اجلے سنہرے ورق اب کہاں

پروفیسر سید شاہ عطاء الرّحمٰن عطا کاکوی کی ابتدائی تعلیم ،اُس زمانے کے دستور کے مطابق ،گھر ہی پر ہوئی اور چونکہ وہ ایک علمی گھرانہ تھا، لہذا بچپن ہی میں انہیں نہ صرف فارسی زبان وادب پر خاصی دسترس ہوگئی بلکہ شعروشاعری سے شغف بھی پیدا ہوگیا۔ بعدازاں انہوں نے گیا کے ایک اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا جو، اُس زمانے میں کاکو کا ضلعی صدر مقام ہوا کرتا تھا۔ بعد میں یہ تبدیل ہوکر ضلع جہان آباد ہوا۔اس کے بعد عطا کاکوی صاحب ،پٹنہ منتقل ہوئے اور یہاں پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۸ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں بالترتیب بی۔اے آنرز (فارسی) ایم۔اے (فارسی) اور ایم۔اے (اردو) کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔حصول تعلیم کے دوران انہیں پروفیسر عظیم الدّین احمد، پروفیسر عبدالمنان بیدل اور پروفیسر شمس منیری جیسے فارسی اساتذہ کی شفقت اور سرپرستی حاصل رہی۔

ملازمت کی ابتدا، خانقاہ ہائی اسکول اسلام پور سے ہوئی جہاں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے انہوں نے اپنے فرائض

انجام دیئے۔ بعد میں ان کی تقرری بہار یونیورسٹی، مظفر پور کے ایک باوقار کالج، لنگٹ سنگھ کالج میں اردو و فارسی کے استاد کی حیثیت سے ہوئی جہاں تقریباً بیس سال تک (۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۶ء) وہ تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ پٹنہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے، جہاں انہیں شعبہ فارسی کی صدارت بھی تفویض ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں انہیں ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ کا ڈائرکٹر بنایا گیا جہاں مسلسل پانچ سال تک علمی و انتظامی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۶۹ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے دوران اور ملازمت کے بعد بھی جن اساتذہ اور دانشوروں سے ان کے قریبی روابط اور مراسم رہے، ان میں پروفیسر سید حسن، قاضی عبدالودود، جناب مالک رام، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر امیر حسن عابدی، پروفیسر نذیر احمد، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، جناب مشفق خواجہ اور ڈاکٹر کلیم عاجز وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عطا کاکوی صاحب کا انتقال ۱۸/ مارچ ۱۹۹۸ء میں ہوا اور وہ پٹنہ کے شاہ گنج قبرستان میں مدفون ہوئے۔

پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن صاحب کی علمی و ادبی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ ناقد بھی تھے اور محقق بھی۔ مدیر بھی تھے اور مترجم تھے۔ تاہم انہیں شہرت ایک ایسے محقق کی حیثیت سے حاصل ہوئی جن کی کاوشوں سے کئی نایاب کتابیں اور تذکرے ترتیب و تدوین اور ترجمہ کے بعد منظر عام پر آئے۔ خاص طور پر فارسی کے وہ تذکرے، جس میں فارسی گو شعرا کے ساتھ ریختہ گو شعرا کے تراجم بھی درج ہو گئے ہیں اور اسی لئے فارسی کی ادبی تاریخ کے ساتھ تاریخ ادب اردو کے تناظر میں بھی ان تذکروں کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی احساس کے تحت ان تذکروں میں سے ایسے ذو لسانین شعرا کو الگ کر کے عطا صاحب نے ان کی سوانح حیات کا اردو ترجمہ پیش کر دیا ہے، تاکہ اردو والے بھی اُن شعرا کے حالات سے واقف ہو سکیں جن کی شہرت اگرچہ فارسی شاعر کی حیثیت سے ہے، تاہم ان کی ریختہ گوئی کی روشنی میں انہیں اردو شاعروں کے بنیاد گذاروں میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ عطا کاکوی صاحب کی انہی کتابوں، تذکروں، شعری مجموعوں اور دیگر آثار کا مختصر تعارف ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

تذکرے

نشتر عشق (تلخیص)۔ (آقا حسین قلی خاں عظیم آبادی) اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے :۔

''عطا کاکوی نے 'نشتر عشق' کے نام سے آغا حسین قلی خاں کے فارسی کلام کا اردو ترجمہ کیا۔''

(مضمون 'عطا کاکوی کی ادبی خدمات'۔ مطبوعہ، خدا بخش جرنل۔ شمارہ ۱۴۵۔ اکتوبر۔ دسمبر، ۲۰۰۲ء)

یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ خود پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی صاحب نے اس کتاب میں 'عرض مرتب' کے تحت جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب تقریباً ڈھائی ہزار فارسی شعرا کے تراجم پر مشتمل ایک ضخیم

تذکرہ ہے جس میں ان کے حالات اوران کے فارسی کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔مرتب کے بقول، اب تک یہ مکمل تذکرہ شائع نہیں ہوا ہے ،البتہ اس کے قلمی نسخے ہند و بیرون ہند کے مختلف کتبخانوں میں محفوظ ہیں ،جس میں پٹنہ، رامپور، لاہوراور ڈھاکہ کے نسخے شامل ہیں۔اس تذکرہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ نیاز فتحپوری نے اسی تذکرے کی مدد سے بیدل کے حالات کوترتیب دے کر'نگار'میں شائع کیا تھا۔

عطا کاکوی نے اس تذکرے سے تقریباً ۸۸/ایسے شعرا کے حالات کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو فارسی اوراردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔چونکہ عطا صاحب کا بنیادی مقصد اردو حلقہ میں ان شعرا کو متعارف کرانا تھا،لہذا انہوں نے ان کے فارسی اشعار کو حذف کر دیا ہے۔تاہم انہوں نے مؤلف تذکرہ،آقا حسین قلی خاں عظیم آبادی کے فارسی دیباچہ کا اردو ترجمہ کتاب میں شامل کرلیا ہے جس میں خود اس نے اپنے حالات لکھنے کے ساتھ اس تذکرہ کو مرتب کرنے کی روداد بھی بیان کی ہے اور تاریخ وتذکرہ پر مشتمل تقریباً تین درجن ایسی کتابوں کی فہرست بھی پیش کی ہے جن کی مدد سے اس نے یہ تذکرہ ترتیب دیا ہے۔ان تذکروں میں تحفۂ سامی،خزانۂ عامرہ، سرو آزاد، ید بیضا، اخبار الاخیار، سفینۃ الاولیا، مجمع النفائس،گل رعنا اور تذکرہ بےنظیر وغیرہ شامل ہیں۔آخر میں اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے آقا حسین قلی خاں نے لکھا ہے کہ چونکہ انتخاب کلام میں عاشقانہ اشعار کو ترجیح دی گئی ہے،اس لئے اس کا نام 'نشتر عشق' رکھا گیا اور باب کی جگہ نشتر کا عنوان قائم کیا گیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا،اس تذکرے میں سے ۸۸/ذولسانین شعرا کا ترجمہ عطا کاکوی صاحب نے کیا ہے جو آصفؔ (نظام الملک آصف جاہ) سے شروع ہوکر واقفؔ پر ختم ہوتا ہے۔اس تذکرے میں کچھ غیر معروف شعرا کے علاوہ چند نامور شعرا بھی شامل ہیں۔مثلاً خواجہ میر درد، میر غلام علی آزاد بلگرامی، مرزا عبدالقادر بیدل، امیر خسرو، سراج الدین علی خاں آرزو، لچھمی نرائن شفیق، آنند رام مخلص اور مرزا مظہر جان جاناں وغیرہ۔دوسوسات (۲۰۷) صفحات پر مشتمل یہ کتاب عطا صاحب کے سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ کا عمدہ نمونہ ہے۔

تذکرہ شورش (سید غلام حسین شورش عظیم آبادی) اس کتاب کے آغاز میں 'عرض مرتب' کے تحت پروفیسر عطا کاکوی صاحب نے لکھا ہے کہ عظیم آباد میں لکھا گیا شعرائے ریختہ کا یہ اولین تذکرہ ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا۔اس کے قلمی نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے عطا کاکوی صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے کی اطلاع کے مطابق،اس تذکرے کا واحد نسخہ، بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ میں تھا جس کی بنیاد پر کلیم الدّین احمد نے 'تذکرہ عشقی' کے ساتھ 'دو تذکرے' کے نام سے اس کو شائع کر دیا تھا۔مگر بعد میں اس کا ایک قدیم تر اور مستند تر نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور میں دستیاب ہوگیا جس میں مؤلف کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے جس سے اس کے احوال وآثار پر روشنی پڑتی ہے۔البتہ عطا صاحب نے اس کی صراحت نہیں کی کہ

انہوں نے اردو ترجمہ کے لئے کس نسخے کو بنیاد بنایا ہے۔ تاہم انہوں نے دونوں نسخوں میں جا بجا اختلاف کی نشاندہی ضرور کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں نسخے ان کے سامنے تھے اور انہوں نے دونوں سے استفادہ کیا ہے۔ مجموعی طور پر ۳۲۳ شعرا کا تذکرہ اس کتاب میں شامل ہے جو، آفتاؔب (شاہ عالم بادشاہ) سے شروع ہو کر یقیںؔ (انعام اللہ خاں) پر ختم ہوتا ہے۔ شعرا میں انشاء اللہ خاں انشاء، شاہ مبارک آبرو، سراج الدّین علی خاں آرزو، مرزا عبدالقادر بیدل، مفتی غلام مخدوم ثروت، شاہ آیت اللہ جوہری، غلام یحیٰ حضور عظیم آبادی، مرزا محمد رفیع سودا، شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی، شاہ رکن الدّین عشق، مرزا مظہر جان جاناں اور میر تقی میر وغیرہ شامل ہیں۔

تذکرہ عشقی (شیخ محمد وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی) اس کتاب کے قلمی نسخہ اور پھر اس کی اشاعت کا احوال بیان کرتے ہوئے مرتب، عطا کاکوی صاحب نے 'عرض مرتب' میں لکھا ہے کہ اس کا نسخہ بوڈلین لائبریری کی ملکیت میں ہے جس کی عکسی کاپی پٹنہ یونیورسٹی نے حاصل کی اور اسی عکسی نسخے کی بنیاد پر کلیم الدّین احمد نے اس کو ترتیب دے کر 'تذکرہ شورش' کے ساتھ 'دو تذکرے' کے نام سے شائع کر دیا۔ عطا کاکوی صاحب کے مطابق، عکسی نسخہ میں بہت سے شعرا کے تراجم نہیں تھے جس کی تکمیل کلیم الدّین احمد نے ایک دوسرے نسخے کی مدد سے کی جو قاضی عبدالودود صاحب کی ملکیت میں تھا۔ اسی مکمل تذکرہ کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ غالباً ضخامت سے بچنے کے لئے عطا صاحب نے اشعار کو حذف کر دیا ہے اور صرف اشعار کی تعداد بتانے پر اکتفا کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس تذکرہ کے مؤلف شیخ وجیہ الدّین عشقی عظیم آبادی، آقا حسین قلی خاں عظیم آبادی کے استادِ گرامی تھے۔ اسی لئے اس نے اپنے استاد کا مفصل تذکرہ اپنی کتاب 'نشترِ عشق' میں کیا ہے جس کا اردو ترجمہ عطا صاحب نے عرض مرتب میں ہی کر دیا ہے۔۔ یہ تذکرہ مجموعی طور پر ۴۳۸ شعرا پر مشتمل ہے جو آرزؔو (سراج الدّین علی خاں) سے شروع ہو کر یاسؔ (حسن علی خاں) کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ کتاب کے آخر میں 'تعلیقات' کے تحت عطا کاکوی صاحب نے تذکرہ میں شامل چند اہم اور نامور شعرا کے بارے میں کئی تاریخی حقائق کو درست بھی کیا ہے اور ان کے بارے میں کچھ نئی اطلاعات کا اضافہ بھی کیا ہے۔

سفینۂ ہندی (بھگوان داس ہندی) یہ کتاب اُن شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے جنہوں نے شاہ عالم بادشاہ کے سال جلوس (۱۷۵۹ء) سے لے کر اس کتاب کے سال تصنیف (۱۸۰۴ء) تک ہندوستان میں نشو و نما پائی تھی۔ فارسی زبان میں لکھے گئے 'عرض مرتب' میں عطا صاحب نے بھگوان داس ہندی اور اس تذکرے کا مفصل تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے فارسی شاعری کی ہر صنف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی وغیرہ میں قدرت و مہارت حاصل تھی۔ ان اصناف میں اُس نے دو دو اوین بھی ترتیب دیئے تھے، لیکن شاید دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اس نے 'حدیقۂ ہندی' نامی ایک تذکرہ ترتیب دیا تھا، لیکن وہ بھی نایاب ہے۔ خود بھگوان داس ہندی نے اپنے دیباچے میں بھی، جو

اس کتاب میں شامل ہے، حدیقۂ ہندی کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کو 'حدیقہ ایست جانفزا' اور 'تالیفی ست دلکشا' لکھا ہے اور 'تذکرہ سفینۂ ہندی' کو دوسری تالیف (تالیفی دیگر) قرار دیا ہے۔ عطا صاحب نے اس کتاب کی عدم دستیابی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے 'تذکرہ سفینۂ ہندی' کے محفوظ رہ جانے پر اظہار اطمینان بھی کیا ہے، جس کا واحد نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے اور یہ اشاعت اسی نسخہ پر مبنی ہے۔ اس تذکرہ کی اہمیت اور اس کے امتیازی اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے عطا صاحب نے لکھا ہے کہ اس میں بھگوان داس نے نہ صرف اپنے معاصر شعرا کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں، بلکہ ان شعرا کی سیرت وسوانح کے ذیل میں اُس عہد کی سماجی وسیاسی صورتحال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" ایں تذکرہ (سفینۂ ہندی) بر بنائی نایابی قابل قدر است ۔و نیز اہمیتش بر ایں سبب زیادہ می شود کہ مصنف احوال شعرائی معاصرین را بہ تفصیل نوشتہ و تاریخ ولادت و وفات و دیگر معلومات علمی و سیاسی و ملکی بکار بُر دہ ۔" (سفینۂ ہندی۔عرض مرتب۔ص ب)

بھگوان داس ہندی کے حالات 'تذکرہ انیس الاحبا' اور خود اس تذکرے کی مدد سے ترتیب دے کر عطا صاحب نے کتاب کے آخر میں درج کر دیا ہے۔ تذکرہ سفینۂ ہندی میں مجموعی طور پر ۳۳۵ شعرا کے تراجم ہیں جو آفتاؔب (ابو المظفر عالی گوہر) سے شروع ہو کر یکتاؔ (محمد اشرف یکتا) پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں ضمیمہ کے طور پر مرتب نے اشخاص و مقامات اور کتب کے اشاریئے بھی درج کر دئے ہیں۔

سفینۂ خوشگو (دفتر ثالث) (بندرابن داس خوشگو) 'سفینۂ خوشگو' بندرابن داس کا ایک اہم تذکرہ ہے۔ انگریزی میں اس کتاب اور مؤلف کا تعارف پیش کرتے ہوئے عطا صاحب نے لکھا ہے کہ تذکرہ نگار کے علاوہ بندرابن داس ایک قادرالکلام شاعر بھی تھا، جس کو سرخوش اور آرزو جیسے شعرا کی شاگردی اور شاہ گلشن اور بیدل جیسے شعرا کی صحبتوں کا شرف حاصل تھا۔ وہ اپنے یہاں شعری محفلیں بھی آراستہ کرتا تھا جس میں اُس عہد کے ممتاز شعرا شرکت کرتے تھے۔ ان تمام شعرا کی تحریروں کے نمونے جمع کر کے اس نے ایک مرقع بھی ترتیب دیا تھا جو، اب نایاب ہے۔ اس نے بیدل کے ملفوظات کو بھی قلم بند کیا تھا جن سے ہمیشہ اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ ملفوظات کا یہ مجموعہ بھی دستیاب نہیں ہے۔ بندرا بن داس کے حالات کے ذیل میں عطا صاحب نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ اس کتاب پر، اس کے استاد سراج الدّین علی خاں آرزو نے نظر ثانی کی تھی اور اس پر اہم حواشی کا اضافہ بھی کیا تھا۔

'سفینۂ خوشگو' مجموعی طور پر تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان تینوں جلدوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے عطا صاحب نے لکھا ہے کہ پہلی اور دوسری جلد میں بالترتیب عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے شعرا کا تذکرہ ہے۔ لیکن تیسری اور آخری جلد میں

اس نے اپنے معاصر جدید شعرا کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں اور خود ایک معتبر شاعر ہونے کے سبب، ان شعرا کے انتخاب کلام پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ شاید اسی امتیازی وصف کی بنا پر اور شاید واحد نسخہ ہونے کی بنا پر بھی عطا صاحب نے اس تیسری اور آخری جلد کی ترتیب و اشاعت کا فیصلہ کیا۔ مصنف اور کتاب کی اہمیت کا اندازہ مختلف تذکرہ نگاروں (مثلاً آرزو، لچھمی نرائن شفیق، قدرت اللہ شوق، قیام الدّین حیرت اور بھگوان داس ہندی وغیرہ) کی اُن آراء سے بھی ہوتا ہے جنہیں مرتب نے، اُن تذکروں کے حوالے سے کتاب کے آخر میں درج کر دیا ہے۔ ۲۴۵ر شعرا کے تراجم پر مشتمل اس تذکرہ میں آبرو (شاہ مبارک) سے لے کر یکتا (محمد اشرف) تک کا تذکرہ ہے۔ تاہم دیگر تذکروں کے برعکس شعرا کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق نہیں ہے۔ آخر میں اشخاص و اماکن اور کتب کے اشاریئے بھی درج کئے گئے ہیں۔

تین تذکرے۔ میر تقی میر کا تذکرہ 'نکات الشعرا' گردیزی کا تذکرہ 'ریختہ گویان' اور قائم کا 'مخزن نکات' یہ وہ تین تذکرے ہیں جس کا اردو ترجمہ، ضروری تعلیقات کے ساتھ، کر کے عطا صاحب نے 'تین تذکرے' ہی کے نام سے شائع کیا۔ ان کی یکجا اشاعت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے 'عرض مرتب' میں لکھا ہے کہ یہ تینوں تذکرے تقریباً ایک ہی زمانے میں لکھے گئے ہیں، اس لئے یکجا شائع کئے گئے تاکہ آسانی سے تقابلی مطالعہ ہو سکے۔ شعرا کا ترجمہ آبرو (شاہ مبارک) سے شروع ہو کر یوسف (حکیم یونس) پر ختم ہوتا ہے اور ترتیب میں حروف تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

تذکرہ گلشن و گلزار (یعنی گلشن سخن و گلزار ابراہیم) (مردان علی خاں مبتلا و علی ابراہیم خاں خلیل) جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے، یہ تذکرہ دو تذکروں کا مجموعہ ہے۔ گلشن سخن اور گلزار ابراہیم۔ عطا صاحب نے ان کے تلخیص و ترجمہ کے ساتھ ان کو ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ 'عرض مرتب' کے تحت انہوں نے ان دونوں کے مؤلفین کی حیات و خدمات پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے ان دونوں تذکروں کے امتیازات اور ان کی مختلف اشاعتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ دونوں تذکروں کی مماثلت کو انہوں نے ان کی یکجا اشاعت کا سبب بتایا ہے۔ بخوف طوالت انہوں نے اشعار کو حذف کر دیا ہے، تاہم ہر شاعر کے حالات کے اردو ترجمہ کے ساتھ انہوں نے تعداد اشعار کی نشاندہی کر دی ہے۔ شعرا کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے جو، آفتاب (شاہ عالم بادشاہ) سے شروع ہو کر یاس (حسن علی خاں) پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ انیس الاحبا (موہن لال انیس) 'تذکرہ انیس الاحبا' کی ترتیب و اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے عطا کاکوی صاحب نے اس کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ اُس دور کی تصنیف ہے جب فارسی کے ساتھ ریختہ گوئی کا رجحان بھی عام تھا۔ اسی لئے 'انیس الاحبا' میں جو ۹۱ر شعرا کے تراجم ہیں، اُن میں سے عطا صاحب نے ۲۷ر ایسے شعرا کو منتخب کر کے ان کا ترجمہ پیش کیا ہے جو فارسی کے ساتھ ریختہ کے بھی شاعر تھے۔ یہ آفتاب (شاہ عالم بادشاہ) سے شروع ہو کر وہم (میر محمد علی) پر ختم ہوتا ہے۔ اس کی ترتیب میں بھی عطا صاحب کی روش وہی ہے۔ یعنی شعرا کے حالات کا اردو ترجمہ کیا ہے اور ان کے فارسی

اشعار کو حذف کر کے صرف تعداد اشعار لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔اس تذکرہ کی اہمیت،انفرادیت اور قدر و قیمت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر عطا کاکوی صاحب لکھتے ہیں :

''انیس الاحبا ایک خاص نہج کا تذکرہ ہے۔یہ محض اُن شعرا کا تذکرہ ہے جن کی فاخر مکین سے وابستگی تھی اور جو اُن کے حلقۂ تلامذہ میں داخل تھے یا پھر اُن کے جو مکین کے شاگردوں کے شاگرد تھے۔اس طرح یہ تذکرہ ایک خاص مکتبہ خیال کی ترجمانی کرتا ہے اور ایک خاص دور کی شعری زندگی کا خاکہ ہے۔'' (پیش لفظ۔ص۴)

تذکرہ انجمن ونگارستان سخن (صدیق حسن خاں ونورالحسن خاں) ان دونوں تذکروں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے عطا کاکوی صاحب نے لکھا ہے کہ بھوپال سے شائع ہونے والا فارسی تذکرہ 'شمع انجن' نواب صدیق حسن خان نے ترتیب دیا تھا اور چونکہ بہت سے شعرا کے تراجم تذکرہ کی تکمیل کے بعد پہنچے،اس لئے اس کا تتمہ 'نگارستان سخن' کے عنوان سے ،نواب صاحب کے بڑے صاحبزادے نورالحسن خاں کے نام سے شائع ہوا۔چونکہ 'نگارستان سخن' میں شعرا کے حالات بہت مختصر تھے،لہذا عطا صاحب نے اس کو 'شمع انجمن' کے ساتھ شائع کرنا مناسب سمجھا۔'نگارستان سخن' کے دو حصّے ہیں۔ایک حصّہ شعرائے فارسی کے لئے اور دوسرا شعرائے بھاکا (ہندی) کے لئے۔اسی دوسرے حصّے میں سے عطا کاکوی صاحب نے صرف ذولسانین شعرا کا انتخاب کر کے ان کا ترجمہ شائع کیا ہے۔یہ تذکرہ آرزو (سراج الدّین علی خاں آرزو) سے شروع ہوکر یاس (انور علی) پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ طبقات الشعرائے ہند (دور متقدمین وطبقۂ اول) (ایف فیلن ومولوی کریم الدین) 'تذکرہ طبقات الشعراء' کا یہ حصّہ اول ہے اور جیسا کہ عطا صاحب کے 'عرض مرتب' سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے قبل طبقات کے تین حصّے یعنی دوم،سوم اور چہارم وہ شائع کر چکے ہیں۔یہ حصّہ قدیم شعرائے ریختہ کے تراجم پر مشتمل ہے اور اس سے پہلے مؤلف نے طبقہ متقدمین کا ایک الگ باب بھی قائم کیا ہے جو ہندی اور بھاکا کے قدیم شعرا پر مشتمل ہے۔یہ تذکرہ آبرو (شاہ مبارک) سے شروع ہوکر ولی (شمس ولی اللہ گجراتی) پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ گلشن ہند (مرزا علی لطف) مرزا علی لطف کے تذکرہ 'گلشن ہند' کو بعض لوگوں نے 'گلزار ابراہیم' پر مبنی بتایا ہے۔لیکن عطا کاکوی صاحب نے اپنے 'عرض مرتب' میں اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لطف علی نے اس میں خاصا اضافہ کیا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ شعرا کے حالات بیان کئے ہیں۔مرزا لطف علی کے فارسی مقدمہ کا اردو ترجمہ بھی عطا کاکوی صاحب نے شامل کیا ہے جس سے اس کتاب کی ترتیب وتدوین اور اس کے تصنیفی پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔آخر میں تعلیقات کی شمولیت سے بھی کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے جس میں متعدد شعرا کے بارے میں مفید اضافی

معلومات فراہم کی گئی ہیں۔**تذکرہ صبح گلشن (سید علی حسن خاں)** یہ تذکرہ بنیادی طور پر فارسی شعرا کے تراجم پر مشتمل ہے ۔ان میں سے ۲۲ر ایسے شعرا کو عطا کاکوی صاحب نے منتخب کر کے ان کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے جو فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ یہ تذکرہ آزاد (شیخ امیر الدّین) سے شروع ہو کر یکساں (کیسری سنگھ دہلوی) پر ختم ہوتا ہے۔عطا کاکوی صاحب نے دیباچۂ مؤلف کو بھی شامل اشاعت کر لیا ہے، جس سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ تذکرہ 'نگارستان سخن' میں جو شعرا شامل ہونے سے رہ گئے تھے، انہیں اس میں شامل کر کے گویا اس کی تکمیل کی گئی ہے۔مؤلف نے اُن مختلف تذکروں مثلاً 'نشتر عشق' اور 'آفتاب عالم تاب' وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے جن کی مدد سے یہ تذکرہ مرتب ہوا۔

تذکرہ مسرت افزا (ابوالحسن امیر الدین احمد عرف امراللہ الہ بادی) 'تذکرہ مسرت افزا' کا مؤلف چونکہ خود شاعر بھی تھا اور ناقدانہ ذہن کا حامل بھی، لہذا شعرا کے کلام پر اس کے تنقیدی تبصروں نے اس تذکرہ کو انفرادی جہت عطا کر دی ہے۔اس کی دوسری انفرادیت یہ ہے کہ ترجمہ کے لئے مؤلف نے زیادہ تر ایسے شعرا کا انتخاب کیا ہے جن سے اس کے ذاتی مراسم تھے۔لہذا ان کے بارے میں اس کی مفصل اطلاعات مستند، معتبر اور ہر قسم سے شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔مجموعی طور پر ۲۵۶ر شعرا کے تراجم پر مشتمل یہ تذکرہ آفتاب (شاہ عالم) سے شروع ہو کر یونس (حکیم یونس) پر ختم ہوتا ہے۔مؤلف کا اپنا دیباچہ اردو ترجمہ کی صورت میں کتاب میں شامل ہے جس میں اس تذکرہ کی جمع و ترتیب کا احوال بیان کیا ہے۔

تذکرہ نتائج الافکار (قدرت اللہ گویا مؤی) تذکرہ 'نتائج الافکار' کی تالیف ایک ایسے دور میں ہوئی (۱۲۵۷ھ) جب فارسی شاعری روبزوال تھی اور ریختہ گوئی کو عروج حاصل ہو رہا تھا۔یہی وجہ ہے کہ شعرائے فارسی کا تذکرہ ہونے کے باوجود اس میں ۵۱ر شعراء ایسے ہیں جو ریختہ میں بھی شعر کہتے تھے۔انہی شعرا کے تراجم کا اردو ترجمہ عطا کاکوی صاحب نے کیا ہے ۔انہوں نے دیباچۂ مؤلف کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے مختلف تذکروں کی مدد سے یہ تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے اور سنین وفات کے تعین کا التزام بھی رکھا ہے۔آخر میں عطا صاحب نے مؤلف کا احوال بھی درج کیا ہے۔یہ تذکرہ آرزو (سراج الدّین علی خاں) سے شروع ہو کر والہ (علی قلی خاں) کے ترجمہ پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ چمنستان شعرا (لچھمی نرائن شفیق) تذکرہ 'چمنستان شعرا' کے بنیادی مآخذ دو تذکرے ہیں۔'نکات الشعرا' (میر تقی میر) اور 'تذکرہ ریختہ گویاں' (گردیزی) یہ اور بات ہے کہ دیگر ذرائع سے بھی شفیق نے شعرا کے حالات اور کلام کو جمع کیا ہے ۔یہ اطلاع دیتے ہوئے عطا صاحب نے 'عرض مرتب' میں مؤلف تذکرہ کی سوانح حیات بھی لکھی ہے اور اس کے علمی آثار کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔تذکرہ 'چمنستان شعرا' کی خصوصیات پر نظر ڈالتے ہوئے عطا صاحب نے اس کے متوازن انداز و اسلوب کی تحسین کی ہے۔مجموعی طور پر ۲۰۶ر شعرا کے تراجم پر مشتمل اس تذکرہ کی ترتیب، مؤلف نے حروف جمل (ابجد)

کے اصول پر کی تھی، لیکن عطا صاحب نے اپنے اردو ترجمہ میں آسانی کے لئے اس کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کر دی ہے۔ مؤلف کے دیباچہ کا اردو ترجمہ بھی عطا صاحب نے کتاب میں شامل کیا ہے جس سے اس تذکرہ کا تالیفی پس منظر نمایاں ہوتا ہے۔

تذکرہ بے نظیر (سید عبدالوہاب اختیار) تذکرہ 'بے نظیر' کے مؤلف سید عبدالوہاب اختیار، آزاد بلگرامی (صاحب سرو آزاد) کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کے تتبع میں انہوں نے یہ تذکرہ تالیف کیا ہے۔ مجموعی طور پر ۱۳۴ر شعرا کے تراجم پر مشتمل اس تذکرے میں ۲۹ر شعرا کو عطا صاحب نے منتخب کر کے ان کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے جو فارسی کے ساتھ ریختہ میں بھی شعر کہتے تھے۔ تذکرہ بے نظیر کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے عطا کاکوی صاحب نے لکھا ہے کہ شعرا کے حالات مؤلف نے ذاتی واقفیت کی بنیاد پر لکھے ہیں اور کچھ ایسے غیر معروف شعرا کی سوانح بھی درج کی ہے جن کے حالات کہیں اور دستیاب نہیں ہوتے۔ تاریخ ولادت و وفات کے تعین میں بھی مؤلف کی تحقیق بلیغ کی عطا صاحب نے تعریف کی ہے۔ یہ تذکرہ آزاد (میر غلام علی آزاد بلگرامی) سے شروع ہو کر وقار (میر عبدالحئی خاں) پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ روز روشن (مظفر حسین صبا گوپا موی) بھوپال میں لکھا جانے والا یہ ضخیم تذکرہ مجموعی طور پر ۲۴۱۱ر فارسی شعرا کے تراجم پر مشتمل ہے جس میں ۱۴۳ر شعرا ذولسانین تھے اور فارسی کے ساتھ ریختہ میں بھی شعر کہتے تھے۔ عطا کاکوی صاحب نے انہی شعرا کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے اور یہ شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ تالیف تذکرہ کے وقت مؤلف کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی لہذا اُن سے ایسے ضخیم تذکرے کی تالیف کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ان کے خیال میں یہ تالیف ان کے والد مولوی یوسف علی کی ہوسکتی ہے جنہوں نے اس سے قبل بھی کئی تذکرے ترتیب دیئے تھے۔ دیباچۂ مؤلف کا اردو ترجمہ بھی عطا صاحب نے پیش کیا ہے جس میں مؤلف نے اس تذکرہ کی ترتیب میں محمد صادق خاں اختر کے تذکرہ 'آفتاب عالمتاب' سے استفادہ کا خاص طور پر اعتراف کیا ہے۔ یہ تذکرہ آزاد (محمد امجد علی) سے شروع ہو کر یاس (انور علی) پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی) میر حسن کی شہرت 'مثنوی سحر البیان' سے ہے۔ نثر میں یہی تذکرہ ان کی یادگار ہے۔ 'عرض مرتب' میں عطا کاکوی صاحب نے میر حسن کی سوانح حیات بیان کرتے ہوئے اس تذکرہ کی خصوصیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اکثر شعرا سے چونکہ میر حسن کے ذاتی مراسم تھے لہذا ان کے بارے میں ان کی اطلاعات کے استناد میں کوئی شبہ نہیں۔ عطا صاحب نے اپنے اردو ترجمہ میں بخوف طوالت اشعار حذف کر دیئے ہیں اور صرف شعرا کے حالات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ یہ تذکرہ آفتاب (شاہ عالم بادشاہ) سے شروع ہو کر یونس (حکیم یونس) پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ عقد ثریا (غلام ہمدانی مصحفی) غلام ہمدانی کے تین تذکروں میں، پہلا تذکرہ 'عقد ثریا' ہے جو فارسی شعرا کے تراجم پر مشتمل ہے۔ لیکن ان میں سے ۴۴ر شعرا فارسی کے ساتھ ریختہ میں بھی شعر کہتے تھے۔ عطا صاحب نے انہی شعرا کا اردو

ترجمہ پیش کیا ہے اور اسی کے ساتھ دیباچۂ مؤلف کی تلخیص بھی پیش کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مصحفی نے اس تذکرے کو شاہ عالم بادشاہ کے عہد کے شعرا تک ہی محدود رکھا ہے اور تفصیل کی بجائے اجمال سے کام لیا ہے۔ یہ تذکرہ آرزو (سراج الدّین علی خاں) سے شروع ہو کر ہادی (میر جواد علی) پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ بزم سخن وطور کلیم (سید علی حسن خاں سلیم وسید نور الحسن خاں کلیم) تذکرہ 'بزم سخن وطور کلیم' کے مؤلفین سید علی حسن خاں سلیم اور سید نور الحسن خاں کلیم، نواب صدیق حسن خاں کے صاحبزادگان تھے، جنہوں نے صرف شعرائے ریختہ کے حالات وکلام پر مشتمل یہ دونوں تذکرے فارسی زبان میں لکھے ہیں۔ عطا صاحب نے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ البتہ طوالت کے خوف سے اشعار کو حذف کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ 'طور کلیم' کے دوسرے حصّے کو بھی انہوں نے حذف کر دیا ہے جو بھاکا (ہندی) شعرا کے تراجم پر محیط تھا۔ یہ تذکرہ آباد (مہدی حسن خاں) سے شروع ہو کر یقین (انعام اللہ خاں) پر ختم ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر شعرا کی تعداد تقریباً پانچ سو ہے۔ تعداد کی اسی کثرت کے سبب شاید ان کے حالات کے بیان میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

گلدستہ نازنیناں (کریم الدین پانی پتی) کریم الدّین کے تذکرہ 'گلدستہ نازنیناں' کو دراصل احمر لاری نے مرتب کیا ہے اور انہی کے مفصل مقدمہ کے ساتھ یہ کتاب شائع بھی ہوئی ہے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے عطا کاکوی صاحب نے اپنے پیش لفظ میں خود لکھا ہے کہ اس کے آخر میں انہوں نے صرف تعلیقات کا اضافہ کیا ہے شعرائے اردو کے حالات پر یہ تذکرہ اردو ہی میں لکھا گیا ہے جو خواجہ میر درد سے شروع ہو کر چرکین پر ختم ہوتا ہے۔ ترتیب میں حروف تہجی کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

تذکرہ شعرائے اردو بزبان سید علی محمد شاد عظیم آبادی۔ شاد عظیم آبادی کو تذکرہ شعرا کی ترتیب سے دلچسپی ضرور تھی لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب وہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ البتہ اپنی مختلف کتابوں میں انہوں نے شعرا کے حالات لکھے تھے۔ عطا کاکوی صاحب نے انہی بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کر کے 'تذکرہ شعرائے اردو' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں انہوں نے شاد عظیم آبادی کی ان کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

حیات فریاد۔ مکتوبات شاد۔ سوانح شاد۔ نوائے وطن۔ اور نقش پائدار وغیرہ

اپنے 'عرض مرتب' میں عطا کاکوی صاحب نے لکھا ہے کہ ان شعرا میں سے بیشتر کا تعلق چونکہ بہار سے ہے، اس لئے بہار میں اردو شاعری کی ابتدا و ارتقا کے لحاظ سے یہ تذکرہ بہت اہم ہے۔ مجموعی طور پر ۱۳۲ شعرا کے ذکر پر مشتمل یہ تذکرہ آباد (شیخ علی باقر) سے شروع ہو کر یکتا (مرزا نوروز علی خاں) پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ سخن شعراء (عبدالغفور نساخ) تقریباً دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) شعرا و شاعرات کے حالات پر مشتمل یہ ضخیم تذکرہ

۱۲۹۱ھ میں شائع ہوا اور چونکہ اس کے مؤلف نساخ کو بہار اور بنگال میں رہنے کا موقع زیادہ ملا تھا، لہذا اس دیار کے شعرا کا ذکر اس میں زیادہ ملتا ہے۔ غیر مسلم شعرا کی بھی تعداد اچھی خاصی ہے۔ 'عرض مرتب' میں عطا کاکوی صاحب نے نساخ کے حالات اور اس کے علمی کارناموں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ آبادؔ (محمد یعقوب علی خاں) سے شروع ہو کر نورنؔ (نورن میراسن) پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ طبقات الشعرائے ہند، طبقہ دوم (ایف فیلن و کریم الدین) کریم الدّین کا یہ تذکرہ مجموعی طور پر چار طبقات پر مشتمل ہے جس کا یہ دوسرا طبقہ ہے اور جس میں مؤلف نے خود اپنے بقول، صرف اُن شعرا کا ذکر کیا ہے جنھوں نے زبان کو سلاست سے آشنا کیا اور ریختہ سے کریہہ الفاظ کے استعمال کو ختم کیا۔ عطا کاکوی صاحب نے دیگر تذکروں کی مانند اس تذکرہ میں بھی صرف متن کو پیش کیا ہے اور اشعار کو حذف کر کے صرف ان کی تعداد کی نشاندہی کی ہے۔ یہ تذکرہ اخترؔ (میر اکبر علی) سے شروع ہو کر یکرنگؔ (حفیظ خاں) پر ختم ہوتا ہے۔ تاہم شعرا کی ترتیب میں حروف تہجی کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

مجموعہ نغز (میر قدرت اللہ قاسم) 'مجموعہ نغز' بنیادی طور پر اردو شعرا کا تذکرہ ہے جسے حکیم قدرت اللہ قاسم نے فارسی زبان میں لکھا ہے۔ عطا کاکوی صاحب کے 'عرض مرتب' کے مطابق، یہ ضخیم تذکرہ تقریباً سات سو (۷۰۰) شعرا کے تراجم پر مشتمل ہے جس میں سے ۵۶۴ شعرا کے حالات اصل تذکرہ میں اور ۱۲۲ شعرا کے احوال تکملہ میں درج ہیں۔ اس تذکرہ کے رنگین اور پُرتصنع اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے عطا صاحب یہ اہم انکشاف کیا ہے کہ چونکہ اس کا قلمی نسخہ محمد حسین آزاد کے پاس تھا اور ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ لہذا کوئی بعید نہیں کہ 'آب حیات' میں آزاد کی رنگین بیانی اور خاص طور پر شعرا کے القاب و آداب کا ان کا مرصّع و مقفیٰ انداز اسی تذکرے کے اثر کا نتیجہ ہو۔ اس لئے کہ قدرت اللہ قاسم نے بھی اس تذکرے میں شعرا کے القاب و آداب اور ان کی تعریف و توصیف میں پُرتصنع اسلوب و آہنگ اختیار کیا ہے۔ عطا کاکوی صاحب نے اردو ترجمہ میں اشعار کے ساتھ ان رسمی کلمات اور مصنوعی القاب کو بھی حذف کر دیا ہے جس کے سبب اس کی ضخامت میں نمایاں کمی آ گئی ہے۔ یہ تذکرہ سب سے پہلے پروفیسر شیرانی کی کوششوں سے پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ لیکن اب یہ مطبوعہ نسخہ بھی نایاب ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی عام طور پر دستیاب نہیں ہیں۔ عطا کاکوی صاحب کے اس اردو ترجمہ کی اشاعت سے اس تذکرہ کو نئی زندگی تو ملی ہے تاہم اس میں صرف ۱۲۹ شعرا کی شمولیت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر یہ تلخیص ہے تو بعض شعرا کو شامل کرنے اور بعض شعرا کو حذف کرنے کا پیمانہ کیا ہے، عطا کاکوی صاحب کے پیش لفظ یا عرض مرتب سے اس کی صراحت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ انہوں نے یہ اردو ترجمہ پروفیسر شیرانی کے مطبوعہ نسخہ سے کیا ہے یا اس تذکرے کے کسی قلمی نسخے سے۔ حالانکہ خود پروفیسر عطا کاکوی صاحب کی یہ روش رہی ہے کہ وہ فارسی زبان میں لکھے گئے تذکروں میں سے لازماً ایسے شعرا کو اردو ترجمہ میں شامل کرتے ہیں جو فارسی کے ساتھ اردو

میں بھی شعر کہتے تھے۔ جبکہ یہ تذکرہ خود ان کے بقول، کاملاً شعرائے اردو کا تذکرہ ہے، لہٰذا اس کے تمام شعرا کو اردو ترجمہ میں شامل ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں کا بالاستیعاب مطالعہ ہو تو شاید اس کے اسباب کا انکشاف ہو سکے۔

سعادت خاں ناصر کے '**تذکرہ خوش معرکہ زیبا**' کی ترتیب و تدوین بھی عطا کاکوی کا ایک اہم کارنامہ ہے ۔'عرض مرتب' کے تحت عطا کاکوی نے تذکرہ نگار سعادت خاں ناصر کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اُس دور کی اخلاقی پستی، معاصرانہ چشمک اور زبان و بیان کی رنگ آمیزی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس تذکرہ کے پُرتصنع اسلوب کی بناء پر انہوں نے یہ قیاس بھی ظاہر کیا ہے کہ 'آب حیات' میں محمد حسین آزاد کا مرصّع اسلوب غالبًا اسی تذکرہ کی صدائے بازگشت ہے۔ عطا کاکوی نے سعادت خاں ناصر کے کئی دعووں کی تردید بھی کی ہے، جس میں اس کا یہ دعوا بھی شامل ہے کہ اس کا یہ تذکرہ پہلی بار اردو زبان میں لکھا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے تمام تذکرے فارسی زبان میں تھے۔ عطا کاکوی نے اس کی نفی کرتے ہوئے دو ایسے تذکروں کی نشاندہی کی ہے جو اس سے پہلے اردو زبان میں لکھے جا چکے تھے۔ مختلف کتب خانوں میں اس تذکرے کے قلمی نسخوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عطا کاکوی نے لکھا ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین میں انہوں نے خدابخش لائبریری کے نسخے کو اساسی نسخہ قرار دیا ہے۔

تذکروں کی تدوین کے علاوہ، عطا کاکوی صاحب کے علمی آثار میں ان کی گرانقدر تحقیقی و تنقیدی کتابوں کے ساتھ ان کے شعری مجموعے اور مختلف شعراء کا انتخاب کلام بھی شامل ہے۔ ان کے ذکر کے بغیر عطا کاکوی کی ہمہ جہت علمی شخصیت پر گفتگو مکمل نہیں ہوگی۔ شعراء کے انتخاب کلام کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عطا صاحب نے شعراء بہار کے کلام کے انتخاب کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کا مستقل عنوان تھا ''**سلسلۂ انتخاب کلام شعرائے بہار**'' اس سلسلہ کے تحت انہوں نے شعراء کے مختصر حالات کے ساتھ ان کے انتخاب کلام کی اشاعت شروع کی تھی۔ اس سلسلے کا آغاز میر کمال علی کمالؔ کے انتخاب کلام کی اشاعت سے ہوا تھا جو میر تقی میر کے ہم عصر تھے اور فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اس سلسلے کی چوتھی اشاعت خود عطا کاکوی کے انتخاب کلام پر مشتمل ہے جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ انتخاب اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں عطا کاکوی صاحب نے خود اپنے اردو کلام سے اپنی پسندیدہ غزلوں اور متفرق اشعار کا انتخاب کیا ہے۔

اردو شاعری کے انتخاب کے سلسلے میں عطا کاکوی صاحب کی کتاب **جمال غزل، کمال غزل اور کاروان خیال** کا ذکر بھی ضروری ہے جو بالترتیب ان کی غزلوں اور نظموں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ **جمال غزل** عطا کاکوی صاحب کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ ایک صفحہ کے ' پیشگفتار' میں اگرچہ انہوں نے اس مجموعہ کے حوالے سے کوئی بات نہیں لکھی ہے

۔تاہم اپنی شاعری کی طرف اشارہ ضرور کیا ہے جو وہ اپنے دیگر انتخاب کلام میں بھی کر چکے ہیں کہ غزل کی شاعری میں مختلف موضوعات کا دَر آنا اس کا حسن ہے۔عطا صاحب کا یہ مجموعہ ان کے اسی نظریہ شاعری کی عکاسی کرتا ہے۔**کمال غزل** عطا کاکوی کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کے پیشگفتار میں انہوں نے اس مجموعہ کے حوالے سے کچھ کہنے سے گریز کرتے ہوئے صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا ہے:

'کلام خود اپنا آپ تعارف کرالیتا ہے۔تعریف سے بری چیز مستحسن نہیں ہوسکتی اور تنقیص سے اچھی چیز بری نہیں ہوسکتی۔'

تاہم عطا صاحب کے پہلے مجموعہ **جمال غزل** کے مقابلے میں اس مجموعہ کو سامنے رکھا جائے تو عطا صاحب کی شاعری میں فنی ارتقا کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔**کاروان خیال** عطا کاکوی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کی بیشتر نظمیں خود ان کے بقول ''ہنگامی اور وقتی موضوعات پر لکھی گئی ہیں یا پھر کسی شخص کی وفات سے متاثر ہوکر۔'' حالانکہ انہوں نے اپنے 'عرض حال' میں ان نظموں میں رومان اور وجدان کے فقدان کا ذکر کیا ہے۔تاہم یہ ان کا انکسار ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ان نظموں میں وجدان اور رومان کے عناصر موجود ہیں۔مثال کے طور پر ان کی نظمیں شباب، مستقبل اور قصور عشق دیکھی جاسکتی ہیں۔اس کے علاوہ عطا کاکوی کا ایک اور شعری مجموعہ '**گلہائے رنگ رنگ**' کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔اس کے 'حرف اول' میں اپنی شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہی ہوگیا تھا جب انہوں نے غالب کی زمین 'انساں ہونا' میں اپنی پہلی مکمل غزل شاد عظیم آبادی کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی تھی ۔عطا صاحب نے اپنے اس مجموعہ کی انفرادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مکمل غزل کی بجائے منفرد اشعار کا انتخاب ہے جو ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں۔موضوع کی مناسبت سے انہوں نے مختلف عنوانات بھی قائم کردیئے ہیں جن کی تعداد تقریباً ستر (۷۰) کے آس پاس ہے۔اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو شاعری میں یہ ایک نیا تجربہ ہے جو عطا کاکوی جیسا استاد فن ہی کرسکتا تھا۔اسی طرح کا ایک اور تجربہ عطا صاحب نے '**ساقی نامہ**' کی شکل میں کیا ہے۔ان کا یہ شعری مجموعہ یک موضوعی نوعیت کا ہے کہ اس میں ساقی سے خطاب کرکے صرف شراب کی باتیں کی گئی ہیں۔اپنے مختصر سے پیش لفظ میں (جو 'جرعۂ اول' کے دلچسپ عنوان سے موسوم ہے) عطا صاحب نے فنی اعتبار سے ساقی نامہ کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اور اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فارسی اور اردو میں ساقی ناموں کی کمی نہیں۔یہ عموماً مثنوی کی بحروں میں لکھے جاتے ہیں۔لیکن اس کے خلاف بھی مثالیں ملتی ہیں۔شراب چاہے جس ظرف میں ہو، شراب ہی ہے۔اسی طرح ساقی سے خطاب چاہے جس لب و لہجے میں ہو، بہرحال ساقی سے خطاب ہے۔اسی خیال کو مدنظر

رکھ کر اس مجموعہ کو 'ساقی نامہ' کہنا بیجا نہ ہوگا۔'' (ساقی نامہ کا پیش لفظ)

شعراء کے انتخاب کلام کے سلسلے میں ان کی ایک اہم کتاب ''**میخانہ تغزل**'' ہے۔اس کتاب کے حصہ اول میں ،میرؔ سے اصغرؔ تک ،اردو کے دس غزلگو شعراء کی دس / دس غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے ۔ان شعراء میں آتش، غالب،مومن،داغ،شاد،حسرت،اقبال اور فانی شامل ہیں ۔ان کے انتخاب کلام میں عطا کاکوی نے ہر شاعر کے حقیقی رنگ وآہنگ اوران کے رجحانات ومیلانات کونمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ان شعراء کا دورانیہ تقریباً ڈیڑھ سو برسوں پر محیط ہے۔اس انتخاب میں فکری وفنی اعتبار سے اس پورے عہد کا مکمل شعری منظر نامہ ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔

اردو کے علاوہ شعراء فارسی کے کلام کا انتخاب بھی عطا کاکوی نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ان میں بیدل اور غالب خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔بیدل پر ان کی کتاب 'حیرت زار' خاصی مقبول ہوئی ،جس میں انہوں نے مرزا عبد القادر بیدل کی حیات وشاعری پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔اسی کے ساتھ اُن تبصروں کو بھی انہوں نے یکجا کر دیا ہے جو مختلف تذکرہ نگاروں نے اور ماہرین بیدل نے ان کے کلام کے حوالے سے کئے تھے۔ان میں نیاز فتحپوری ،خوشگو،امیر حسن عابدی،سرخوش،حسین قلی خاں اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ شامل ہیں ۔'تصانیف بیدل' کے عنوان کے تحت، بیدل کی تمام منظوم ومنثور تصانیف کا تعارف بھی اس کتاب کا امتیاز خاص ہے ۔مختلف شعرا کے درمیان تقابلی مطالعہ،عطا کاکوی کی تحریروں کا نشان امتیاز رہا ہے۔چنانچہ اس کتاب میں بھی انہوں نے بیدل کا موازنہ غالب اور اقبال سے کیا ہے اوران سب کے شاعرانہ امتیازات کو بھی اجالا ہے۔کتاب کے پیش لفظ میں خود عطا صاحب نے بیدل کی شاعری پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور فکری وفنی دونوں اعتبار سے بیدل کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شاعری میں جوش وولولہ،تحرّک اور تصوف،حسن آفرینی اور اضطراب مسلسل جیسے عناصر کی نشاندہی کی ہے ۔عطا کاکوی نے اپنے تجزیہ کے دوران اُن ناقدین کی بھی گرفت کی ہے جو بیدل کی شاعری کی روح میں اُترے بغیر اس پر سرسری تبصرہ کر کے گزر گئے ۔ان میں علامہ شبلی جیسے ناقد بھی شامل ہیں ۔کلام بیدل کا انتخاب پیش کرتے ہوئے عطا کاکوی نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے اس انتخاب میں بیدل کی شاعری کی تمام خصوصیات عکس ریز ہوں ۔تاکہ اس کی روشنی میں بیدل کے بارے میں ایک جامع تاثر بن سکے ۔واقعہ یہ ہے کہ بیدل کی ذات اوران کے کلام سے عطا صاحب کو خصوصی دلچسپی تھی اور اس موضوع پر انہیں گویا اختصاص کا درجہ حاصل تھا۔چنانچہ 'خدا بخش خطبات سیریز' کے تحت ۱۹۸۶ء میں انہوں نے خدا بخش لائبریری میں مرزا عبدالقادر بیدل پر ایک طویل اور جامع خطبہ دیا تھا جو،بعد میں خدا بخش لائبریری جرنل کے شمارہ نمبر ۴۴ میں شائع ہوا۔اس مقالے میں بیدل کے سلسلے میں پھیلی ہوئی کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے انہوں نے بیدل کے حالات زندگی،ان کی تصانیف اوران کی فارسی شاعری کے ساتھ ان کی ریختہ گوئی کا بھی تفصیل سے تجزیہ کیا ہے۔خاص طور

پر بیدل کی جائے پیدائش کے پیچیدہ مسئلہ کو بھی انہوں نے اس خطبہ میں حل کرنے کی کوشش کی ہے اور مختلف مستند مأخذ کے حوالے سے راج محل کو بیدل کا مولد قرار دیا ہے۔ حالانکہ 'حیرت زار' میں بھی انہوں نے اسی موضوع پر سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون شامل کیا تھا جس کا عنوان ہی ہے ''مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے؟'' لیکن سید صاحب کی مخلصانہ کاوشوں کے باوجود وہاں بھی یہ مسئلہ لاینحل ہی رہ گیا تھا۔ مقالے کے آخر میں غالب اور اقبال سے کلام بیدل کا موازنہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تینوں شعراء کے کلام اور ان کے یکساں و ہم آہنگ مضامین پر عطا صاحب کتنی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ حالانکہ 'حیرت زار' میں بھی انہوں نے بیدل اور اقبال کا موازنہ کیا ہے۔ لیکن اس مقالے میں موازنہ کی گیرائی سوا ہے۔

بیدل پر عطا کاکوی صاحب کے یہ تمام کارنامے اپنی جگہ، لیکن **'نکات بیدل'** کا اردو ترجمہ ان سب کارناموں پر سبقت لے گیا ہے۔ بلکہ اگر وہ بیدل پر کچھ اور نہ لکھتے، صرف 'نکات' کا ترجمہ ہی کر دیتے تو بھی بیدل شناسی میں ان کا مقام و مرتبہ وہی ہوتا جو آج ہے۔ تقریباً سو صفحات پر مشتمل 'نکات بیدل' کا یہ ترجمہ خدا بخش لائبریری جرنل کے شمارہ نمبر ۱۱۰ میں شائع ہوا ہے۔ جو لوگ بیدل کی نثر سے واقف ہیں، وہ عطا صاحب کے سلیس اور با محاورہ ترجمہ کی داد دینگے جنہوں نے بیدل کی مشکل نثر کو حیرت انگیز طور پر آسان اور سہل انداز و اسلوب میں اردو کا جامہ پہنا کر اردو دانوں کیلئے بھی بیدل کی تفہیم آسان کر دی ہے۔ واضح رہے کہ یہ ترجمہ خدا بخش لائبریری کے زیر اہتمام الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے اور اس میں بطور مقدمہ بیدل پر عطا صاحب کا وہ خطبہ بھی شامل کر لیا گیا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ عطا کاکوی صاحب صرف فارسی نثر کے ترجمہ پر ہی قدرت نہیں رکھتے تھے بلکہ فارسی نظم کے منظوم ترجمہ پر بھی انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ بیدل کی مشکل نثر 'نکات بیدل' کے ترجمہ کے ساتھ، غالب کے ہزاروں فارسی اشعار کا منظوم ترجمہ ان کی اس مہارت و صلاحیت کا بین ثبوت ہے۔ خود عطا صاحب نے اس منظوم ترجمہ کی کتابی شکل میں مرتب ہونے کی اطلاع اپنی کتاب 'کاروان خیال' کے پیش لفظ میں یوں دی ہے:

''غالب کے تقریباً ایک ہزار فارسی اشعار کا اردو منظوم ترجمہ کتابی شکل میں مرتب ہے۔''

(بحوالہ مضمون 'عطا کاکوی کی ادبی خدمات۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان۔ مطبوعہ، خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۸۶)

افسوس ہے کہ ترتیب کے بعد اس کی اشاعت عمل میں نہیں آئی۔ اس کی اطلاع دیتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنے محولہ بالا مضمون میں لکھا ہے:

''انہوں نے (عطا کاکوی نے) اپنے رسالہ 'سفینہ' کے مختلف شماروں میں 'دو آتشہ' کے عنوان سے غالب کے فارسی اشعار کے بالمقابل اپنے اردو اشعار شائع کئے ہیں۔'' (ایضاً۔ ص ۸۶)

بیدل کے بعد عطا کاکوی نے غالبؔ کے انتخاب کلام پر مشتمل اپنی کتاب '**غالب،نقشہائے رنگ رنگ (انتخاب کلام غالب فارسی)** پیش کی ۔جیسا کہ کتاب کے ذیلی عنوان سے ظاہر ہے،اس کتاب میں عطا کاکوی صاحب نے غالب کے فارسی کلام کا انتخاب پیش کیا ہے،جس میں غالب کی غزلوں کے ساتھ قصائد،قطعات اور رباعیات بھی شامل ہیں ۔ کتاب میں دیباچہ،پیش لفظ یا مقدمہ کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔اس انتخاب میں ،غالب کی فارسی شاعری پر عطا صاحب کی مختصر سی تحریر بھی شامل ہوتی تو اس کی افادیت میں اضافہ ہوتا اور مرزا غالب کے فارسی کلام کے کچھ نئے نکات وامتیازات بھی سامنے آتے ۔غالبیات کے سلسلے میں عطا کاکوی کی کتاب **نذر غالب** بھی نہایت اہم کتاب ہے،جوانہوں نے غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر انہیں خراج عقیدت کے طور پر شائع کیا تھا ۔اس کتاب کو اس کے محتویات کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔پہلے حصے میں عطا صاحب نے مختلف طرز واسلوب میں غالب کی شاعرانہ انفرادیت کو اجالا ہے،جبکہ دوسرے حصے میں غالب کی زمینوں میں عطا صاحب کی تضمینیں ہیں جوانہوں نے اس اعتراف کے ساتھ پیش کی ہیں:

> ''غالب کی زمین میں غزلیں کہنا ادب اور سخن کا منہ چڑانا ہے ۔پھر بھی قلم نے جسارت کر کے بے ادبی کی ،گنہگاری پر اکسایا ۔روح غالب سے معذرت کے ساتھ چند غزلیں پیش خدمت ہیں ۔''
> (نذر غالب ۔ص۲۹)

ظاہر ہے یہ عطا کاکوی کی خاکساری ہے ۔ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ مہارت اور کلام پر قدرت نے تضمین کا حق ادا کر دیا ہے ۔مثال کے طور پر غالب کے معروف شعر 'درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا' پر عطا صاحب کی یہ تضمین دیکھئے ؎

آبروچشم محبت کی ہے گریاں ہونا گوہر اشک کا پلکوں پہ نمایاں ہونا
نگہ رحمت یزداں کو بہت بھاتا ہے زلف عصیاں کا بصد حسن پریشاں ہونا

بیدل اور غالب کا انتخاب اپنی جگہ،لیکن عطا کاکوی کا ان دونوں سے اہم اور بڑا کارنامہ **دیوان خواجہ امین الدین امینؔ عظیم آبادی** کی تدوین واشاعت ہے ۔اصلاً خطہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے شاعر خواجہ امین الدین امینؔ کو غالباً اس لئے عظیم آبادی کہتے ہیں کہ وہ وہاں سے ہجرت کر کے اس شہر میں مقیم ہو گئے تھے ۔عطا کاکوی نے خواجہ امین کے حالات اور ان کے دیوان فارسی پر 'عرض مرتب' میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اس دیوان کا قلمی نسخہ پہلے خانقاہ عمادیہ کی ملکیت میں تھا جو بعد میں خدا بخش لائبریری کو عطیہ کر دیا گیا ۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ دیوان نہ صرف شاعر کی زندگی میں مرتب ہو گیا تھا بلکہ خواجہ امین نے خود اس میں جا بجا تصحیح واضافہ بھی کیا تھا ۔اس کے علاوہ دیوان میں

شامل دو قصائد تو خود شاعر کے دست خاص کے لکھے ہوئے ہیں ۔کلام کے معیار پر گفتگو کرتے ہوئے عطا صاحب نے لکھا ہے کہ اگر چہ اس کی شاعری بہت اعلا پائے کی نہیں ہے، تاہم ایک ایسے زمانے میں جب ریختہ گوئی کا رواج عام ہو چکا تھا اور فارسی شاعری رو بزوال تھی ، امین کا فارسی کلام اس کے معاصرین کے مقابلے میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے ۔عطا کاکوی کے الفاظ یہ ہیں:

" امینؔ را شاعر بلند پایه نمی توان گفت ولی ازیں انکار نیست که در آنزماں که رواج ریخته گوئی رو به ترقی شده ،فارسی گوئی بدور انحطاط بوده کلام فارسی امینؔ به مقابله هم عصران خود بسا ممتاز و گراں ارز است(دیوانِ خواجہ امین عظیم آبادی۔عرض مرتب۔ص۴)

عطا کاکوی کی تحقیق کے مطابق ،خواجہ امینؔ ریختہ میں بھی شعر کہتے تھے اور ایک مختصر سا دیوان بھی ترتیب دیا تھا ۔یہ مکمل دیوان تو اب دستیاب نہیں ہے تاہم اُن کے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ریختہ کے اشعار، جو دستیاب ہو سکے، انہیں جمع کر کے عطا صاحب نے اس دیوان کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا ہے ۔خواجہ امین کے حالات عام طور پر دستیاب نہیں ہیں ۔مختلف تذکرہ نگاروں مثلاً عشقی، مصحفی، میر حسن اور مرزا علی لطف وغیرہ نے اس کے بارے میں جو چند الفاظ لکھے ہیں، عطا کاکوی نے ان کی مدد سے خواجہ امین کی مختصر سوانح ترتیب دی ہے۔

ان تمام شعری مجموعوں، دواوین اور انتخاب کلام میں عطا کاکوی نے شعراء کے کلام پر جو اظہار خیال کیا ہے، ان سے نہ صرف ان کے تنقیدی مزاج و میلان کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ شعراء کے کلام کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے ۔واقعہ یہ ہے کہ عطا کاکوی صاحب، شاعری میں جتنی قدرت رکھتے تھے، اتنی ہی مہارت انہیں نثر میں، خاص طور پر تنقیدی نثر میں حاصل تھی ۔مثال کے طور پر اردو کے مختلف شعراء مثلاً حسرت، شاد، جگر اور عندلیب شادانی وغیرہ پر ان کے تنقیدی مضامین اور ان کی کتابیں بعنوان **تقابلی مطالعے** ، **تنقیدی مطالعے اور مطالعہ حسرت** وغیرہ دیکھی جا سکتی ہیں۔

تقابلی مطالعے، جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے، شعراء کے تقابلی مطالعے پر مشتمل کتاب ہے ۔پیش لفظ میں اس کی صراحت کرتے ہوئے خود عطا کاکوی صاحب نے لکھا ہے کہ ایسے مضامین جن کا تعلق دو شعراء کے موازنہ اور ان کی باہمی یکسانیت اور مغائرت سے ہے، ان ہی مضامین کو 'تقابلی مطالعے' کے نام سے کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے ۔مجموعی طور پر سات مضامین پر مشتمل اس کتاب کا غالب حصہ شادؔ کے مطالعہ پر محتوی ہے ۔کتاب کے پانچ مضامین شادؔ عظیم آبادی سے متعلق ہیں اور صرف دو مضامین میں بالترتیب حسرت و غالب اور میر و راسخ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ۔بقیہ مضامین میں شادؔ کا موازنہ حسرت، آتش اور دیگر شعراء سے کیا گیا ہے ۔لیکن ایک مضمون میں مختلف فارسی شعراء کے

اشعار کے بالمقابل شاؔد کے ایسے اشعار پیش کئے گئے ہیں جو یکساں معنی ومفہوم کے حامل ہیں۔اس انداز سے شاؔد کا مطالعہ عطا کاکوی ہی کر سکتے تھے جو فارسی اور اردو کے شعری سرمایہ پر یکساں نگاہ رکھتے تھے اور دونوں زبانوں کی شاعری کا بہترین موازنہ کرنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔یہی اس کتاب کا نشان امتیاز ہے۔**تنقیدی مطالعے** عطا کاکوی صاحب کے دس مضامین کا مجموعہ ہے،جس میں انہوں نے عندلیب شادانی،حسرت موہانی،شاد عظیم آبادی،جگر مرادآبادی اور اختر قادری کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔اس کے علاوہ بعض مضامین سرقہ وتوارد اور غزل وتغزل جیسے عنوانات پر بھی انہوں نے لکھے ہیں۔یہ کتاب نہ صرف اردو شاعری کے موضوعات پر ان کے وسیع مطالعہ کی عکاسی کرتی ہے بلکہ فنی اعتبار سے بھی شعر کی کیفیت وماہیت اور غزل کی نزاکت ولطافت پر ان کی گہری نگاہ کا پتہ دیتی ہے۔سرقہ،توارد اور استفادہ کے باریک فرق کی وضاحت بھی،فن شاعری پر،عطا صاحب کی گرفت کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔

حسرت موہانی کی شخصیت اور ان کی شاعری پر عطا کاکوی کی کتاب **مطالعہ حسرت** آٹھ (۸) مضامین پر مشتمل ہے جس میں ان کی غزلگوئی سمیت ان کی شاعری کی تمام جہتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔فن شاعری پر چونکہ عطا صاحب کو عبور حاصل تھا،لہذا فنی اعتبار سے حسرت کی غزل کا تجزیہ ان کے ناقدانہ مضامین کا امتیاز ہے۔حسرت کے کلام کے اجزائے ترکیبی اور طرز لکھنؤ کی روشنی میں کلام حسرت کا جائزہ،حسرت کے باب میں اپنی نوعیت کے الگ مضامین ہیں۔تاہم اس کتاب کا غالب حصہ دیگر شعراء سے حسرت کی شاعری کے تقابلی مطالعہ پر محتوی ہے،جس میں غالب اور شاد وغیرہ کی شاعری سے حسرت کی شاعری کا موازنہ کیا گیا ہے اور ان کے یہاں مماثلتوں کے ساتھ ان نکات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جہاں حسرت کے فکری امتیازات نمایاں ہوتے ہیں۔آخر میں عطا صاحب نے فنی اعتبار سے کلام حسرت کے معائب پر بھی نظر ڈالی ہے جس کی جرأت کم لوگ کرتے ہیں۔تاہم اس سے حسرت کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا کہ حسرت کی تحقیر کرنے کا،عطا صاحب کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ان کا منشاء غالباً صرف اتنا تھا کہ شاعری کرنے والے عروضی اوزان اور بلاغت کے نظام سے بے نیاز نہ ہوں اور ان کا احترام کریں۔اس ذیل میں **مطالعہ شاد** بھی عطا کاکوی کی اہم کتاب ہے۔کہتے ہیں کہ عطا صاحب کو شاد سے تلمذ حاصل تھا لہذا انہوں نے اپنے استاد گرامی کی شخصیت اور ان کی شاعری کے مطالعہ کا حق ادا کر دیا ہے۔اس کتاب کے مختلف مضامین میں نہایت جامعیت کے ساتھ عطا کاکوی نے نہ صرف شاد عظیم آبادی کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے بلکہ مختلف شعراء مثلاً آتش لکھنوی اور حسرت موہانی وغیرہ سے ان کا موازنہ کر کے ان کے شاعرانہ امتیازات کو بھی اجالا ہے۔عطا کاکوی کے یہ مضامین اردو کی غزلیہ شاعری اور مختلف دبستان شعر کی خصوصیات پر ان کے عمیق مطالعہ کا اشاریہ ہیں۔

'مطالعہ شاد' کی نہج پر شاہ اکبر داناپوری کی حیات وشاعری کے سیر حاصل مطالعہ پر مبنی عطا کاکوی صاحب کی

کتاب بنام 'سید شاہ محمد اکبر' بھی قابل ذکر ہے، جس کے آغاز میں انہوں نے شاہ اکبر داناپوری کی علمی و روحانی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے علمی و ادبی نیز شعری کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اسی ذیل میں ان کے عہد کے درخشاں علمی و ادبی ماحول کا بھی جائزہ لیا ہے، جب شاہ اکبر داناپوری کے ساتھ امداد امام اثر، فضل حق آزاد، شوق نیموی، سعید حسرت، صفیر بلگرامی اور شاد عظیم آبادی جیسے نابغہ روزگار بھی داد سخن دے رہے تھے۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ ان تمام علما، ادبا اور شعرا کے درمیان معاصرانہ چشمک نام کو نہیں تھی۔ یہ سب ایک دوسرے کا نہ صرف احترام کرتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف اور مداح بھی تھے۔ عطا کاکوی نے شاہ اکبر داناپوری کی سوانح حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے 'خم خانہ جاوید' کے مصنف لالہ سری رام کی اُس غلط بیانی کی تردید بھی کی ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ شاہ اکبر داناپوری کے والد حضرت شاہ محمد سجاد ابوالعلائی کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ شاعری کی طرف شاہ اکبر داناپوری کے رجحان کی داستان خود انہی کی زبانی بیان کرتے ہوئے عطا کاکوی نے خاص طور پر اُس پس منظر کو اجالا ہے جب مولانا وحید الدین وحید الہ بادی کی شاگردی میں اکبر داناپوری کا شاعرانہ کمال اپنے اوج کی طرف مائل پرواز تھا۔ شاہ اکبر داناپوری کی شاعری میں متصوفانہ عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے عطا کاکوی نے ان کے دو مجموعہ کلام 'نسبت عشق' اور 'جذبات اکبر' کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جس میں تصوف و معرفت کا عکس نمایاں ہے۔ شاہ اکبر داناپوری نے متنوع موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ تاریخ و تذکرہ، ملفوظات و ارشادات، سفرنامہ اور سیرت و سوانح پر شاہ اکبر داناپوری کی مختلف نثری کتابوں مثلاً سیر دہلی، تاریخ عرب، دل، اشرف التواریخ اور چراغ کعبہ وغیرہ کا مفصل تعارف عطا کاکوی صاحب نے پیش کیا ہے، جس سے شاہ اکبر داناپوری کی ہمہ جہت علمی و روحانی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔

عطا کاکوی کے تنقیدی مضامین کے ذیل میں ان کی کتاب **پیشگفتار** کو بھی رکھا جا سکتا ہے جو مختلف کتابوں پر ان کے دیباچوں کا مجموعہ ہے۔ ان کتابوں میں بیشتر شعری مجموعے ہیں جن پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے عطا صاحب نے بہترین تنقیدی شعور کا نمونہ پیش کیا ہے۔ شعراء میں بسمل عظیم آبادی، اختر قادری، اشرف قادری، ثاقب عظیم آبادی، صدر الدین فضا، تاج پیامی اور جمیل عظیم آبادی وغیرہ شامل ہیں۔ کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ان شعراء کا تجزیہ، ان کے فکر و فن دونوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ عطا صاحب نے ان شعراء پر گفتگو کرنے سے قبل ان کی مختصر سوانح حیات بھی درج کر دی ہے اور ان کے سلسلۂ تلمذ کو بھی پیش نظر رکھا ہے کہ اس زمانے میں استادی و شاگردی کی روایت قائم تھی۔ یوں ان شعراء کے اساتذہ کے حوالے سے اردو کی غزلیہ شاعری کی فنی روایت کا تدریجی ارتقاء عطا صاحب کی تحریر میں نمایاں تر صورت میں سامنے آیا ہے۔ اردو کی غزلیہ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب بلا شبہ ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔

تنقید، حالانکہ عطا صاحب کی ادبی شخصیت کا ایک اہم عنصر ہے، تاہم اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ تحقیق کو بہر حال اولیت حاصل ہے جو ان کی علمی شخصیت کی اصل شناخت ہے اور مختلف تذکروں کی تدوین و اشاعت جس کا بہترین نمونہ ہیں۔ تاہم اس سلسلہ میں ان کی مزید دو کتابوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ **غلطیہائے مضامین** اور **آثار کاکو**۔ ان میں اول الذکر کتاب کے پیشگفتار میں عطا صاحب نے اس کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کتاب دراصل ان مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مجلّہ معاصر (پٹنہ) کے شماروں میں بالاقساط شائع ہوئے۔ ان مضامین کا مقصد یہ تھا کہ کتابوں اور رسالوں میں جو تسامحات ملتے ہیں، ان کی نشاندہی ہو جائے اور ان فروگزاشتوں کی تصحیح بھی ہو سکے۔ عطا صاحب نے اس کی صراحت بھی کی ہے کہ اس سے کسی کی دل آزاری یا اہانت مقصود نہیں ہے اور نہ اپنی علمیت یا ہمہ دانی کا مظاہرہ کرنا ہے، بلکہ صرف یہ احساس ہے کہ تحقیق کے باب میں کوئی بھی بیان حرف آخر نہیں ہوتا اور انکشافات کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ کتاب میں نہ صرف ادب و شاعری کے حوالے سے اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے بلکہ تاریخ ولادت و وفات نیز عہد وسطی کی تاریخ کے حوالے سے بھی تسامحات کی گرفت کی گئی ہے اور صحیح حقائق کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اردو فارسی شعراء کے تقریباً تمام اہم تذکرے چونکہ عطا صاحب کی نگاہ میں تھے۔ لہذا ان کی روشنی میں نہ صرف وہ اغلاط تک پہنچ جاتے تھے بلکہ ان کی تصحیح کر کے وہ حقائق کو بے نقاب بھی کر دیتے تھے۔ اس طرح کے بے شمار نمونے اس کتاب میں بکھرے پڑے ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب **آثار کاکو** دراصل عطا کاکوی صاحب کے والد سید شاہ غفور الرحمٰن حمدؔ کاکوی کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے مولد اور صوبہ بہار کی قدیم بستی کاکو کی تاریخی و تہذیبی نیز متصوفانہ و مذہبی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، لہذا عطا صاحب نے کچھ اہم اضافوں کے ساتھ اسے از سر نو ترتیب دے کر شائع کیا۔ اس کا انتساب بھی انہوں نے اپنے والد ہی کے نام کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ایک مخصوص عہد اور ایک مخصوص علاقے کی تاریخ کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے بلکہ تذکرہ صوفیہ کے نقطہ نگاہ سے بھی نہایت مفید اور انفرادی نوعیت کی کتاب ہے کہ اس میں حضرت بی بی کمالؒ سمیت کئی ایسے گمنام صوفیہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں جن کا ذکر عام طور پر تذکروں میں نہیں ملتا۔ کتاب کے آخر میں عطا کاکوی نے اپنے والد حمدؔ کاکوی کے حالات بیان کرتے ہوئے ان کی فارسی شاعری پر روشنی ڈالی ہے اور بطور نمونہ ان کا فارسی کلام بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔

عطا کاکوی کے تحقیقی کارناموں میں ان کی کتاب **'آوارہ گرد اشعار'** کو نمایاں اہمیت حاصل ہے، جس میں انہوں نے متعدد ایسے اشعار کی نشاندہی کی ہے جو غلطی سے کسی دوسرے شاعر سے منسوب ہو گئے اور پھر نقل در نقل کا یہ غلط سلسلہ چلتا رہا۔ اس میں میر تقی میر جیسے شاعر بھی شامل ہیں جن کے اشعار کو رند سے منسوب کر دیا گیا۔ عطا کاکوی نے نہایت دیدہ ریزی سے ایسے اشعار کو منتخب کر کے اصل شاعر کی نشاندہی کی ہے۔ 'آوارہ گرد اشعار' کے مستقل عنوان سے عطا کاکوی کے

ان مضامین کی اشاعت پہلے نیاز کے 'نگار' میں ہوتی رہی۔ بعد میں اسے ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ اپنے پیش لفظ میں عطا کاکوی نے یہ صراحت کی ہے کہ ایسے اشعار کو 'آوارہ گرد' کہنا صحیح نہیں ہے جس کے شاعر کا نام معلوم ہو ۔اس کو اشعار کا غلط انتساب کہنا مناسب ہوگا۔ لیکن چونکہ 'نگار' میں یہ مضامین اسی عنوان سے شائع ہو چکے تھے، لہذا انہوں نے اس نام کو برقرار رکھا۔ یوں تو پروفیسر عطا کاکوی کی تحقیقی جہات مختلف النوع ہیں، تاہم فارسی ادب و شاعری کے مخطوطات کا تعارف ان کی تحقیقی شخصیت کا اصل شناسنامہ ہے۔ چنانچہ رام چند فرحتؔ عظیم آبادی کے فارسی دیوان کے قلمی نسخہ کا تعارف اسی نوع کا ایک اہم مضمون ہے جو، خدا بخش لائبریری جرنل کے شمارہ نمبر ۳۲ میں شائع ہوا ہے۔ خدا بخش لائبریری میں محفوظ دیوان فرحت کا تعارف پیش کرتے ہوئے عطا صاحب نے اس کی مثنویوں، غزلوں اور قصائد پر اظہار خیال کیا ہے اور عظیم آباد سے اس کی وابستگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق کی روشنی میں اس امکان کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ نسخہ منحصر بہ فرد ہے اور اس کا دوسرا نسخہ کہیں دستیاب نہیں ہے۔

پروفیسر عطا کاکوی صاحب کی علمی و ادبی شخصیت کی ایک اہم جہت مدیر کی بھی ہے۔ انہوں نے 'سفینہ' کے نام سے ایک اہم اور معیاری رسالہ نکالا تھا جس کے کئی خصوصی نمبر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ عطا صاحب کے مزاج کے مطابق یہ رسالہ بھی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا تھا۔ چنانچہ قاضی عبدالودود صاحب کے نام سے منسوب اس رسالہ کا ایک خصوصی شمارہ، عطا کاکوی صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا جس میں قاضی صاحب کے بارے میں اُس زمانے کے ادیبوں، ناقدوں اور محققوں کے خیالات و تاثرات کو یکجا کیا گیا ہے۔ قاضی عبدالودود کے علاوہ کلیم الدین احمد، فیض احمد فیض، جوش و فراق اور ارشد کاکوی پر بھی انہوں نے خصوصی نمبر شائع کیا تھا۔ واضح رہے کہ ارشد کاکوی، پروفیسر عطا کاکوی کے فرزند ارجمند تھے جن کا انتقال عطا صاحب کی زندگی میں ہو گیا تھا۔ رسالہ 'سفینہ' کے خصوصی نمبروں کے علاوہ اس کے عام شمارے بھی تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے نہایت اہمیت اور قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ ان شماروں میں خود مدیر محترم پروفیسر عطا کاکوی کے قلم سے ایسے مضامین شائع ہوئے ہیں کہ انہیں کتابی شکل میں ترتیب دیا جائے تو تحقیقی مقالات کا ایک نادر مجموعہ سامنے آئے گا۔ نیاز فتحپوری کی طرح، عطا کاکوی بھی تنہا اپنی تحریروں کی بنیاد پر مکمل شمارہ ترتیب دینے کی ہمت اور صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ 'سفینہ' کے بعض شمارے صرف عطا صاحب کی نگارشات اور ان کے مقالات پر مشتمل ہیں۔ اس رسالے کے مختلف شماروں میں عطا صاحب کے جو نادر و نایاب مضامین شائع ہوئے ہیں، اُن میں اکبر دانا پوری اور احسان دانش کی حیات و شاعری پر ان کے مقالات کے علاوہ 'قاموس المشاہیر' پر ان کا مفصل مضمون خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس میں 'قاموس المشاہیر' (مصنفہ مولوی نظام الدین حسین نظامی) کی دونوں جلدوں کا نہ صرف مفصل تعارف پیش کیا گیا ہے بلکہ اس کے تسامحات اور فروگذاشتوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس سے کئی تاریخی

رکارڈ درست ہو گئے ہیں۔ رسالہ 'سفینہ' میں 'معیار و میزان' کے نام سے ایک مستقل عنوان ہوا کرتا تھا جس کے تحت پروفیسر عطا کاکوی مختلف کتابوں پر تبصرہ کرتے تھے۔ ان تبصروں کو یکجا کر دیا جائے تو ایک مبصر کی حیثیت سے عطا صاحب پر الگ سے ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ صرف رسالہ 'سفینہ' میں ہی شائع ہونے والے عطا کاکوی صاحب کے مضامین اب تک یکجا نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ان کے مضامین بھی اپنی یکجائی کے منتظر ہیں۔ اسی قسم کے مضامین میں 'مرأۃ المحققین' اور 'معدن المعانی' پر ان کے مضامین شامل ہیں جو بالترتیب 'خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ اور 'معارف' اعظم گڑھ میں شائع ہوئے۔ اول الذکر مضمون میں 'مرأۃ المحققین' کے خدا بخش نسخہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے عطا کاکوی صاحب نے مستند منابع کے حوالے سے اس کتاب کو محمود شبستری (صاحب گلشن راز) کی تصنیف ثابت کیا ہے۔ مخطوطہ کے متن میں مصنف کا نام نہیں ہونے سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح حضرت مخدوم جہاںؒ کے مجموعہ ملفوظات 'معدن المعانی' کے تعارف پر مشتمل عطا صاحب کا مضمون اس لحاظ سے انفرادیت کا حامل ہے کہ اس میں بھی انہوں نے مرتب / پبلشر کے تصرفات کو کھوج نکالا ہے جس نے عرفی کے ایک شعر کو شامل کتاب کر دیا تھا۔ جبکہ حضرت مخدومؒ کی رحلت کے تقریباً دو سو سال بعد عرفی عالم وجود میں آیا تھا۔

پروفیسر عطا کاکوی کی شخصیت اور ان کے علمی آثار پر یہ تشنہ و نامکمل مضمون اس اعتراف و اعتذار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ ان کی ادبی خدمات، تخلیقی جہات اور تحقیقی نگارشات کے منظر نامے کا یہ بہت چھوٹا سا حصہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے علمی کارنامے فکری اور موضوعاتی اعتبار سے اتنی مختلف جہتوں میں پھیلے ہوئے ہیں کہ ایک مضمون تو کیا، ایک مکمل کتاب میں بھی ان سب کا احاطہ کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔ عطا صاحب کی تحقیق، تنقید، تدوین، شاعری، تبصرہ، ترجمہ نگاری، لغت نویسی اور فہرست مخطوطات کی تصحیح و ترتیب جیسے تمام پہلوؤں میں سے ہر پہلو پر الگ سے مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ ایک لغت نویس کی حیثیت سے عطا صاحب کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے لکھا ہے:

> ''انہوں نے (عطا کاکوی نے) پروفیسر کلیم الدین احمد کی ادارت میں تیار ہونے والی ڈکشنری پروجیکٹ میں ایک طویل عرصہ تک کام کیا۔ واضح ہو کہ یہ جامع انگلش اردو ڈکشنری چھ جلدوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی نے شائع کر دی ہے۔''
>
> (خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔ اکتوبر۔ دسمبر، ۲۰۰۲ء۔ ص ۸۵)

لغت نویسی کی مانند فارسی مخطوطات کی فہرست سازی کے ذیل میں عطا کاکوی کے سلسلۂ مضامین 'مسامحات مرأۃ العلوم' کا ذکر بھی ناگزیر ہے جس میں انہوں نے خدا بخش لائبریری میں محفوظ مخطوطات فارسی کی فہرست 'مرأۃ العلوم'

میں راہ پانے والے کئی اغلاط کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ تصحیح واضافہ بھی کیا ہے۔ان تسامحات میں کتابوں کے غلط نام کے ساتھ مصنف کا غلط اندراج بھی شامل ہے۔ واضح رہے کہ ہر مخطوطہ کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد وہ حقائق تک پہنچے ہیں،غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور آنے والے محققین کے لئے راہ ہموار کی ہے۔مجموعی طور پر تقریباً تین سو ایسے مخطوطات کا انتخاب انہوں نے کیا ہے جس کے نام رمصنف راوراق رکاتب رسنہ کتابت وغیرہ کے اندراج میں غلطی ہوئی تھی۔

حالانکہ عطا صاحب کے انتقال کے بعد ہی ان پر مضامین لکھے جانے کے ساتھ پی ایچ ڈی کے لئے ان پر تحقیقی مقالات بھی لکھے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔تاہم ان تمام کاوشوں کے باوجود یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیا گیا ہے اور ان کی تمام تخلیقات منظر عام پر آ گئی ہیں۔ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے نظم ونثر دونوں پر مشتمل عطا صاحب کی تقریباً ۱۵ رایسی تصانیف کی طرف اشارہ کیا ہے جو،اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔اس کے علاوہ اُس زمانے کے مختلف رسائل مثلاً معارف،معاصر،آجکل،ماہ نو،نگار اور صنم وغیرہ میں عطا صاحب کے مضامین تواتر کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ان سب کو بھی یکجا کرنے اور انہیں ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔پھر مختلف سیمیناروں اور علمی مذاکروں میں پیش کئے گئے ان کے مقالات کی بھی کوئی ایسی فہرست دستیاب نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ ان میں سے کتنے مقالات شائع ہوئے ہیں اور کتنے تشنہ طبع ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ عطا کاکوی صاحب اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے،لہذا کسی ادارے کے زیر اہتمام باضابطہ ایک پروجیکٹ کے تحت ان کے احوال وآثار پر جامع تحقیقی کام ہو تو شاید ان کی خدمات کا کچھ حق ادا ہو سکے۔

منابع:۔

۱۔تذکرہ شورش۔مؤلف: سید غلام حسین شورش عظیم آبادی۔مترجم ومرتب: عطا کاکوی۔ناشر،ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ۔ ۱۹۶۸ء

۲۔نشتر عشق۔مؤلف: آقا حسین قلی خاں عظیم آبادی۔مترجم ومرتب: عطا کاکوی۔ناشر،ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ۔۱۹۶۸ء

۳۔تذکرہ عشقی۔مؤلف: شیخ محمد وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی۔مترجم ومرتب: عطا کاکوی۔ناشر،ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ۔ ۱۹۶۹ء

۴۔بہار کی بہار۔(جلد اول) مصنف: ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔ناشر،خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔۲۰۱۰ء

۵۔ بہار میں عربی وفارسی زبان وادب (مجموعہ مقالات) مرتب: ڈاکٹر حسن رضا خاں۔ناشر، ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ۔ ۲۰۱۱ء

۶۔دیوان خواجہ امین الدین امین عظیم آبادی۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ۔۱۹۶۶ء

۷۔سفینہ خوشگو (دفتر ثالث) تذکرہ شعرای فارسی۔مؤلف: بندرابن داس خوشگو۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،ادارہ تحقیقات عربی و

فارسی، پٹنہ۔۱۹۵۹ء

۸۔سفینہ ہندی (تذکرہ شعرای فارسی) مؤلف: بھگوان داس ہندی۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۱۹۵۸ء

۹۔تنقیدی مطالعے۔(مجموعہ مضامین) مصنف: عطا کاکوی۔ناشر، شاد بکڈپو، پٹنہ۔جون ۱۹۵۷ء

۱۰۔تقابلی مطالعے۔(شعرا کے کلام کا تقابلی جائزہ) مصنف: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، سلطان گنج، پٹنہ۔جولائی ۱۹۶۶ء

۱۱۔مطالعہ حسرت۔مؤلف: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔جولائی ۱۹۶۶ء

۱۲۔مطالعہ شاد۔مؤلف: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔

۱۳۔غلطیہائے مضامین۔(حصہ اول) مصنف: عطا کاکوی۔ناشر، مصنف، عطا منزل، سلطان گنج، پٹنہ۔جنوری، ۱۹۸۴ء

۱۴۔حیرت زار۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، سلطان گنج، پٹنہ۔۱۹۸۱ء

۱۵۔تین تذکرے۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، سلطان گنج، پٹنہ۔نومبر، ۱۹۶۸ء

۱۶۔تذکرہ گلشن وگلزار۔تلخیص وترتیب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔جولائی، ۱۹۶۸ء

۱۷۔تذکرہ انیس الاحبا۔مؤلف: موہن لال انیس۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔۱۹۷۱ء

۱۸۔تذکرہ شمع انجمن ونگارستان سخن۔مؤلفین: صدیق حسن خاں ونور الحسن خاں۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔ ۱۹۶۸ء

۱۹۔تذکرہ طبقات الشعرائے ہند۔(طبقہ اول) مؤلفین: اف فیلن ومولوی کریم الدین۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔اگست، ۱۹۷۱ء

۲۰۔تذکرہ گلشن ہند۔مؤلف: مرزا علی لطف۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔جون ۱۹۷۲ء

۲۱۔تذکرہ صبح گلشن۔مؤلف: سید علی حسن خاں۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، سلطان گنج، پٹنہ۔جنوری، ۱۹۶۸ء

۲۲۔تذکرہ مسرت افزا۔مؤلف: ابوالحسن امیر الدین احمد عرف امراللہ الہ بادی۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔ اپریل، ۱۹۶۸ء

۲۳۔تذکرہ نتائج الافکار۔مؤلف: قدرت اللہ گوپامؤی۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔فروری، ۱۹۶۸ء

۲۴۔تذکرہ چمنستان شعرا۔مؤلف: لچھمی نرائن شفیق۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔دسمبر، ۱۹۶۸ء

۲۵۔تذکرہ بے نظیر۔مؤلف: سید عبدالوہاب اختیار۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔مئی، ۱۹۶۸ء

۲۶۔تذکرہ روز روشن۔مؤلف: مظفر حسین صبا گوپامؤی۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔جون، ۱۹۶۸ء

۲۷۔تذکرہ شعرائے اردو۔مؤلف: میر حسن دہلوی۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔ستمبر، ۱۹۷۱ء

۲۸۔تذکرہ عقد ثریا۔مؤلف: غلام ہمدانی مصحفی۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر، عظیم الشان بکڈپو، پٹنہ۔مارچ، ۱۹۶۸ء

۲۹۔تذکرہ بزم سخن وطور کلیم ۔مؤلفین: سید علی حسن خاں وسید نورالحسن خاں کلیم ۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو، پٹنہ۔ ستمبر،۱۹۶۸ء

۳۰۔گلدستہ نازنیناں ۔مؤلف: کریم الدین پانی پتی ۔مرتب: احمر لاری رعطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو، پٹنہ۔اکتوبر،۱۹۷۲ء

۳۱۔تذکرہ شعرائے اردو بزبان سید علی محمد شاد عظیم آبادی ۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،دائرہ ادب، پٹنہ۔۱۹۶۵ء

۳۲۔تذکرہ سخن شعراء۔مؤلف: عبدالغفور نساخ ۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو،سلطان گنج، پٹنہ۔مئی،۱۹۷۲ء

۳۳۔تذکرہ طبقات الشعرائے ہند (طبقہ دوم) مؤلف: ایف فیلن وکریم الدین ۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو، پٹنہ۔ جون،۱۹۷۱ء

۳۴۔آثار کاکو۔مصنف: سید شاہ غفورالرحمٰن حمدؔ کاکوی ۔مرتب وناشر: عطا کاکوی۔جنوری،۱۹۸۶ء

۳۵۔مجموعہ نغز۔مؤلف: میر قدرت اللہ قاسم ۔مرتب ومترجم: عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو،سلطان گنج، پٹنہ۔مارچ،۱۹۷۲ء

۳۶۔نذر غالب ۔(غالب کی صد سالہ برسی پر نذر عقیدت) عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو،سلطان گنج، پٹنہ۔فروری،۱۹۶۹ء

۳۷۔غالب،نقشہائے رنگ رنگ (انتخاب کلام غالب فارسی) مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو،سلطان گنج، پٹنہ۔جون، ۱۹۶۹ء

۳۸۔گلہائے رنگ رنگ ۔عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو، پٹنہ۔اپریل،۱۹۷۰ء

۳۹۔جمال غزل (انتخاب غزلیات) ۔عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو،سلطان گنج، پٹنہ۔اگست،۱۹۷۰ء

۴۰۔کمال غزل (انتخاب غزلیات) ۔عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو، پٹنہ۔اپریل،۱۹۷۱ء

۴۱۔کاروان خیال۔عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو، پٹنہ۔اگست،۱۹۷۷ء

۴۲۔میخانہ تغزل (حصہ اول: میر سے اصغر تک) مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو،سلطان گنج، پٹنہ۔دسمبر،۱۹۵۴ء

۴۳۔پیش گفتار (دیباچوں کا مجموعہ) عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو، پٹنہ۔جنوری،۱۹۸۹ء

۴۴۔آوارہ گرد اشعار۔مصنف وناشر: عطا کاکوی۔۱۹۸۸ء

۴۵۔تذکرہ خوش معرکہ زیبا۔مؤلف: سعادت خاں ناصر۔مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،عظیم الشان بکڈ پو،سلطان گنج، پٹنہ۔اکتوبر، ۱۹۶۸ء

۴۶۔سلسلہ انتخاب کلام شعرائے بہار (میر کمال علی کمال) مرتب وناشر: عطا کاکوی۔

۴۷۔سلسلہ انتخاب کلام شعرائے بہار (کلام عطا کاکوی) مرتب وناشر: عطا کاکوی۔۱۹۶۶ء

۴۸۔ملخّص تذکرہ ریاض الوفاق۔مؤلف: ذوالفقار علی مست ۔مرتبین: عطا کاکوی وسید حسن ۔پٹنہ

۴۹۔نکات بیدل۔مصنف: مرزا عبدالقادر بیدل ۔مترجم: عطا کاکوی۔ناشر،خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔۱۹۹۸ء

۵۰۔حیرت زار۔(انتخاب کلام مرزا عبدالقادر بیدل) مرتب: عطا کاکوی۔ناشر،ایوان اردو، پٹنہ۔باراول،۱۹۵۶ء

۵۱۔ساقی نامہ۔طبع دوم۔(عطا کاکوی) ناشر: ایون اردو، پٹنہ۔۱۹۵۴ء
۵۲۔خدابخش لائبریری جرنل۔شمارہ،۱۴۵۔(اکتوبر۔دسمبر،۲۰۰۲ء) مدیر: ڈاکٹر امتیاز احمد۔ناشر،خدابخش لائبریری، پٹنہ۔
۵۳۔خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ ۔شمارہ نمبر۲۰،۲۵،۳۲،۴۰،۴۴،۶۹۔۷۴۔ مدیر : ڈاکٹر عابد رضا بیدار۔ ناشر، خدا بخش لائبریری، پٹنہ
۵۴۔خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔شمارہ نمبر۱۱۰۔(۱۹۹۷ء) مدیر: حبیب الرحمٰن چغانی۔ناشر،خدابخش لائبریری، پٹنہ۔
۵۵۔بھاشا سنگم۔(مشاہیر بہار نمبر۔حصہ ۲) مدیر: امتیاز احمد کریمی۔ ناشر،محکمہ کابینہ سکریٹریٹ بہار، پٹنہ۔اکتوبر، ۲۰۱۷ء تا مارچ ۲۰۱۸ء
۵۶۔معارف (اعظم گڑھ) فروری،۱۹۵۷ء
۵۷۔سفینہ۔(مختلف شمارے بشمول خصوصی نمبر) مدیر: عطا کاکوی۔پٹنہ
۵۸۔روزنامہ پندار، پٹنہ۔مدیر،اے۔کے احسانی۔مورخہ ۲۴/مارچ،۲۰۲۱ء

☆☆☆

ڈاکٹر عتیق الرحمن
اسسٹنٹ پروفیسر فارسی، شعبہ عربی، فارسی، اردو و اسلامک اسٹڈیز
وشو بھارتی یونیورسٹی، مغربی بنگال،

پروفیسر امیر حسن عابدی: حیات و خدمات

حیات و شخصیت: پروفیسر سید امیر حسن عابدی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ یکم جولائی ۱۹۲۱ء میں گنگولی گاؤں ضلع غازی پور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش ان کی دادی کے ہاتھوں ہوئی۔ عابدی صاحب نے فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ چشمۂ رحمت ، غازیپور، سلطان المدارس لکھنو اور جوادیہ عربی کالج، بنارس سے حاصل کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے ذاتی طور پر بھی ملک کے اہم اساتید فن مثلاً مولانا عنایت اللہ اور مولانا سبغت اللہ وغیرہ سے استفادہ کیا۔

لکھنؤ میں ریام کے درمیان ان کی متربیت مولانا سید نونہری مرحوم اور ان کی اہلیہ عابدہ بی بی نے کی جو ان کی اہلیہ خالہ تھیں۔ عربی تعلیم کے بعد عابدی صاحب نے ایم.اے. اور پی.ایچ.ڈی کی سند آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور رارسی کے لیکچرر کی حیثیت سے اپنے کیریر کی شروعات سنٹ اسٹفینس کالج دہلی سے کی اور ۱۹۵۷ء سنٹ اسٹفینس کالج، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ عابدی صاحب ۱۹۷۳ء میں صدارتی اعزاز (Presidential Award of Certificate of Honour) سے ۱۹۷۵ء میں ساہتیہ کلا پریشد کے اوارڈ اور ۱۹۷۸ء میں غالب انسٹیوٹ سے فخر الدین علی احمد تحقیقی اور تنقیدی اعزاز سے سرفراز ہوئے۔ رضا لائبریری رامپور نے ان کی ادبی اور خدمات پر انھیں ۱۹ر نومبر ۲۰۱۰ء کو لائف ٹائم اوارڈ سے سرفراز کیا۔ عابدی صاحب کو ہندوستانی اسکالرشپ پر تہران یونیورسٹی سے دو سالہ کورس کے بعد ڈاکٹریٹ کی سند تفویض ہوئی۔

پروفیسر عابدی، محقق تنقید نگار اور فارسی کے بہترین دانشور تھے۔ انھیں وجوہات پر عابدی صاحب کو بائے بائے فارسی در ہند (Father of Persian in India) کہا جاتا ہے۔

میری پہلی باقاعدہ ملاقات ۲۰۰۳ء میں عابدی صاحب سے نور مائیکرو فلم سینٹر ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی میں ہوئی اس وقت میں اس سینٹر میں 'فہرست نگار'' کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ جب کبھی میں ن ے پروفیسر عابدی سے مخطوطات (Manuscripts) کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے بھرپور رہنمائی کی۔ اس سے قبل میں نے کلچر ہاؤس میں متعدد سمینار، اور ادبی اور علمی پروگراموں میں عابدی صاحب سے ملاقات کی تھی۔ لیکن جب میں نور مائیکرو فیلم سینٹر میں

مشغول کار تھا تب پروفیسر امیر حسن عابدی ہر بدھ اور جمعہ کو اس دفتر میں مہمان کی حیثیت سے آتے تھے اور شام کو گھر لوٹتے وقت مجھے اپنے ساتھ ٹیکسی میں لے کیونکہ میں منیر کا میں رہتا تھا اور منیر کا ان کے گھر کے راستے میں آتا تھا۔ عابدی صاحب کو ریٹائرمنٹ کے بعد دہلی یونیورسٹی سے پروفیسر ایمریٹس کے خطاب سے نوازا گیا۔ پروفیسر عابدی ۴ رمئی ۲۰۱۱ء دہلی میں اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ پروفیسر عابدی معاصرین کی نظر میں:

۱۔ پروفیسر حسن عباس: استاد بزرگوار ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی متفقہ طور پر برصغیر کے بہترین اساتذہ میں سے ایک ہیں اور فارسی زبان وادب اور تہذیب کے عظیم خدمت گذار ہیں۔ عابدن صاحب نے اپنی بے مثال کوششوں سے نہ صرف فارسی زبان وادب کی خدمت کی بلکہ آزادی کے بعد غیر متوقع حادثات پر بھی نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنی پچاس سالہ علمی اور ادبی خدمات سے پھلدار درخت کی شاخ اور پتے کی طرح مشرق میں آسام سے گجرات تک، مغرب میں ممبئی تک، شمال میں کشمیر اور جنوب میں حیدرآباد سے مدراس تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہزاروں اساتذہ، معلّمین اور طلبہ ان کے سایہ عاطفت سے فیض یاب ہوئے اور ہو رہے ہیں اور فارسی زبان وادب کے ابیش قیمتی خزانہ سے اپنے ذہن اور روح کو سرشار کر رہے ہیں۔

پروفیسر عابدی نے ہمیشہ تعلیم وتربیت کو ایک نظر سے دیکھا اور شاگردوں جن کی تعداد ہزاروں میں ہے نہ صرف فارسی کے دقیق مسائل سے آگاہ کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو اپنے حسن اخلاق وعلمی بصیرت سے روشناس کرایا ہے۔ پروفیسر عابدی کی شخصیت علم وعمل گفتگو اور بیان طلبہ وتحقیق کنندگان کے لئے ایک کامل نمونہ ہے۔ انھیں وجوہات پر ان کے شاگردان کو دل کی گہرائیوں سے دوست رکھتے ہیں اور اشد احترام کرتے ہیں۔

سالها سجدئه صاحب نظران خواهد بود
بر زمینی که نشان کف پای تو بود

(سیماء عابدی، مقدمہ، ر۔ژ)

۲۔ پروفیسر نذیر احمد: پروفیسر عابدی حاضر جواب اور قوی الحافظہ تھے۔ تمام اہم تاریخی واقعات برصغیر ان کو ذہن نشیں تھے۔ وہ بڑے بڑے خاندان کے نام بخوبی جانتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ یہ مطالب ان کے ذریعہ لکھا گیا ہے کیونکہ یہ بخش مطالب تاریخ وتہذیب کے لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ میرے خیال سے علم رجال میں دوسرا شخص ہندوستان میں اس علمی بصیرت اور جانکاری موجود نہیں ہے۔ عابدی صاحب بے ریاء مخلص اور ہر طرح کے تعصب سے دور تھے۔ انسانی قدروں کو خوب پہچانتے تھے اور اس کی ستایش کرتے تھے اس وجہ سے وہ زیادہ تر لوگوں کے درمیان اور مختلف اجتماعی طبقوں میں محبوب ومحترم تھے۔ وہ شیعہ مذہب کے پروردہ تھے۔ ایک تعلیم یافتہ شیعہ خاندان میں ان کی پرورش ہوئی اور

شیعہ عالموں کے حلقہ میں ان کی تعلیم ہوئی۔

پروفیسر عابدی فارسی اور عربی کے عالم اور فاضل تھے اور کسی طرح اپنی علمی برتری پر فخر نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی سے بے رخی سے پیش آتے تھے۔ وہ برصغیر میں فارسی اور عربی دونوں زبانوں کے زوال پزیری پر یکسان نگراں تھے اور اکثر انہوں نے اس ضمن میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ وہ بہت صبر وتحمل کرنے والے اور حوصلہ مند انسان تھے۔ بہت سی ایسی پسندیدہ اور نیک سفات عابدی صاحب کے اندر پوشیدہ تھی۔ وہ بڑے عالم، انسان دوست، غریب پرور اور تشفی بخش انسان تھے۔ بغیر تردید کے اسطرح کی خوبیوں والے انسان بہت کم ملتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا جلال الدین رومی نے درست کہا ہے:

دی شیخ با چراغ گشت گرد شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

پروفیسر امیر حسن عابدی کے علمی اور تحقیقی کارناموں کے بارے میں جتنا کہیں کم ہے کہ انھوں نے ادبیات کو ہندوستانی داستانوں کے رشتے تحریر کئے ہیں اور اکٹھا ہوئے ہیں بے نظیر اور بیش بہا تحقیقی خزانہ ہے۔ اس طرح سے کوئی بھی شخص چاہے تو اس ضمن میں وسیع کام کرکے بلا تردید کوئی شخص استاد عابد یصاحب کے تحقیقی کارناموں پر اعتماد کریگا۔ (سیمای عابدی، مقدمہ، س،ص)

ادبی خدمات: پروفیسر امیر حسن عابدی نے بہت سی کتابوں کی تصحیح کی اور متعدد مقالے مختلف موضوعات پر لکھے ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ وکرم اروشی: پروفیسر عابدی نے کالیداس کی سنسکرت کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا مقدمہ بھی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ روابط فرہنگی ہند اس کو ۱۹۹۵ء میں شائع کیا ہے۔ (پیش لفظ:ا۔۹۹، متن: ۲۲۶۔۱۰۳)

۲۔ گلزار حال یا طلوع قمر معرفت: پربود چند کی سنسکرت کتاب کا ترجمہ بنوالی والی منشی، شاہزادہ دارا شکوہ نے فارسی میں کیا تھا۔ عابدی صاحب نے اس کتاب کو ڈاکٹر تارا چند کی مدد سے ترجمہ کرکے مرتب کیا جو علیگڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب خیر وشر کی جنگ پر مبنی ہے اور بالآخر شر پا خیر غالب آتا ہے۔ امیر حسن عابدی نے اس کتاب کے پیش لفظ میں احوال وآثار منشی بنوالی داس پر بھی ضوفشانی کی ہے۔ (پیش لفظ:ا۔ی، متن:۱۸۰۔۱)

۳۔ مثنویات فانی کشمیری: عابدی صاحب نے فانی کشمیری کی چار مثنویوں کی تصحیح کی ہے جن میں بالخصوص کشمیر کے اجتماعی اور فرہنگی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ پیش لفظ:۳۴۔۵، متن: ۴۷۸۔۳۵)

۴۔ جوگ وششٹ: ہندوؤں کی فلسفیانہ اور مذہبی کتاب، جس کا مترجم مجہول ہے، شاہزادہ دارا شکوہ کے حکم سے سنسکرت

سے فارسی میں ترجمہ ہوئی ہے۔ داراشکوہ کے دوسرے رسالے، جو سوال و جواب داراشکوہ و فتح علی قلندر کے اس ضمیمہ کے ساتھ شائع ہوئے تھے، پروفیسر عابدی اور ڈاکٹر تاراچند نے انھیں بھی ترتیب دیا جنھیں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ (پیش لفظ: ۵۵۔ا،متن:۲۵۸۔ا، ترجمہ اشعار:۲۶۰۔۲۵۹،فرہنگ لغات:۳۴۰۔۲۶۱)

۵۔سوزوگداز: نوعی خبوشانی نے اپنی کتاب سوز وگداز جو کہ موضوع پر شہنشاہ اکبر کے عہد میں لکھی گئی ہ، عابدی صاحب نے اس مثنوی کے مقدمہ کو جو نوعی خبوشانی کے احوال و خدمت اور دیگر داستانہاے ادبیات فارسی ہند پر مشتمل ہے، ترتیب دیا ہے اور بنیاد فرہنگ ایران نے اسے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا ہے۔

۶۔منتخب اللطائف: اس نامعلوم تذکرہ کو جو فارسی اور ہندی کا بہترین شاہکار ہے، پروفیسر عابدی نے تصحیح کر کے ۱۹۷۱ء میں ایران سے شائع کرایا ہے۔ (پیش لفظ:۴۹۔۵،متن:۴۴۵۔ا)

۷۔داستان پدماوت: جائسی کی پدماوت جو کہ ہندی زبان و ادب کی شاہکار کتاب ہے جسے فارسی شاعر و انشاء پرداز نے بھی فارسی کا جامہ پہنایا ہے۔ عابدی صاحب نے اس پہلے فارسی شاہکار ترجمے کو تحقیق و مقدمہ کے ساتھ ترتیب دیا اور بنیاد فرہنگ ایران نے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔

۸۔تاریخ صلاطین صفوی: یہ کتاب صفوی بادشاہوں کی اہم ترین تاریک ہے جو احمد نگر میں لکھی گئی۔ لیکن اس کا مصنف نامعلوم ہے۔ اس کتاب کو عابدی صاحب نے اپنے تحقیقی مشاہدات اور نظر یہ کی بنیاد پر بہترین تاریخ دودمن شاہی کی تشریح کی اور اس کی اہمیت میں چار چاند لگایا ہے۔ بنیاد فرہنگ ایران نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا ہے۔ (پیش لفظ:۱۴۔۹، ۶۳۔۳، تعلیقات: ۱۵۱۔۱۰۱)

۹۔پنچاکیانہ: اس کتاب کی تصحیح پروفیسر عابدی اور ڈاکٹر تاراچند نے کی اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا ہے، یہ کلاسیکی کتاب پنچ تنترا کا ترجمہ ہے جس کو خالقداد عباسی نے شہنشاہ اکبر کے دور میں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ پروفیسر عابدی نے اس خطی نسخہ کو جو کافی خستہ حالت میں تھا، اپنی جد و جہد اور دس سالہ تحقیقی محنت سے ترتیب دیا ہے۔

۱۰۔ضمیمہ تغلق نامۂ امیر خسرو: پروفیسر امیر حسن عابدی اور ڈاکٹر سید مقبول احمد استاد زبان و ادبیات فارسی دہلی یونیورسٹی نے اس ضمیمہ کو ترتیب دیا۔

۱۱۔ابوطالب کلیم کاشانی: یہ کتاب شاہجہان بادشاہ کے درباری شاعر ابوطالب کلیم کاشانی ملک الشعراء کے احوال و آثار پر مبنی ہے۔ عابدی صاحب کی تصحیح شدہ اس کتاب کو انجمن فارسی دہلی نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا ہے۔ (پیش لفظ: ۵۔۳، احوال و آثار:۱۳۸۔۶)

۱۲۔ادبیات فارسی در ہند: یہ عابدی صاحب کے مختلف تحقیقی، ادبی اور تاریخی مقالات کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر شریف حسین

قاسمی نے ترتیب دیا ہےاور انجمن فارسی ہند نے ۱۹۸۴ء مین شائع کیا ہے۔ (پیش لفظ گردوَرندہ:۱۴۔۱،متن: ۳۲۰۔۱۵)

۱۳۔عسمت نامہ یا قصۂ میناولورک: اس ہندوستانی فارسی مثنوی جو عشقیہ داستان پر مبنی ہے، پروفیسر عابدی نے اس مثنوی کو ترتیب دیا اور مرکز تحقیقات فارسی ہند نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا ہے۔

۱۴۔کتھا سرت ساگر: پروفیسر عابدی نے دس سالہ تحقیقی محنت ومشقت سے اس فارسی ترجمہ کو جو اخلاقیات، افسانوں اور داستانوں پر مشتمل ہے اور سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئی ہے تصحیح کی ہے۔ یہ کتاب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا ہے۔

پروفیسر عابدی کے متعدد مقالے ہندوستان اور بیرون مملک میں مختلف موضوعات پر شائع ہوئے ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

نمبر	مقالے کا نام	رسالے کا نام	سن اشاعت	زبان
۱۔	ہندوی فارسی داں	سخن، تہران	دسمبر، ۱۹۵۵ء	فارسی
۲۔	دیوان طوسی	یغما، تہران	جنوری ۱۹۵۶ء	فارسی
۳۔	ظفر خان احسن	یغما، تہران	اپریل، ۱۹۵۶ء	فارسی
۴۔	منوہر داس توسنی	یغما، تہران	مارچ، ۱۹۵۶ء	فارسی
۵۔	ابوطالب کلیم	انڈو ایرانیکا، کولکاتا	ستمبر، ۱۹۵۷ء	فارسی
۶۔	بنیا نگذار شعر نو	اردو ادب، علیگڑھ	جون، ۱۹۵۸ء	فارسی
۷۔	با باولی رام	آہنگ، دہلی	جون، ۱۹۵۸ء	فارسی
۸۔	ملا طغرا	آہنگ، دہلی	اکتوبر، ۱۹۵۸ء	فارسی
۹۔	شہریار	معاصر، پٹنہ	جولائی، ۱۹۵۹ء	اردو
۱۰۔	سلیم تہرانی	آہنگ، دہلی	اکتوبر، ۱۹۵۹ء	فارسی
۱۱۔	میر لاہوری	آہنگ، دہلی	اکتوبر، ۱۹۵۹ء	فارسی
۱۲۔	جدید ایران کا انقلابی وسماجی ادب	آہنگ، دہلی	جنوری، ۱۹۶۰ء	اردو

۱۳۔	ادبیات انقلابی و اجتماعی ایران	صبا،حیدرآباد	اگست،۱۹۶۰ء	فارسی
۱۴۔	عنایت خان آشنا	آہنگ،دہلی	فروری،۱۹۶۰ء	فارسی
۱۵۔	حکیم حاکم	آہنگ،دہلی	مارچ،۱۹۶۰ء	فارسی
۱۶۔	مقیم فوجی	آہنگ،دہلی	مارچ،۱۹۶۰ء	فارسی
۱۷۔	غازی خان وقاری	آہنگ،دہلی	جون،۱۹۶۰ء	فارسی
۱۸۔	غنی کشمیری	آہنگ،دہلی	نومبر،۱۹۵۹ء	فارسی
۱۹۔	The Influence of Hindi on Indo-Persian Literature in the reign of Shahjahan	انڈوایرانیکا،کولکاتا	جولائی،۱۹۶۰ء	انگلس
۲۰۔	کامی شیرازی	مجلّہ علوم اسلامی،علیگڑھ	جولائی،۱۹۶۰ء	اردو
۲۱۔	تجلی	انڈوایرانیکا،کولکاتا	دسمبر،۱۹۶۰ء	فارسی
۲۲۔	مچھوی مہرماہ	مجلّہ علوم اسلامی،علیگڑھ	دسمبر،۱۹۶۱ء	اردو
۲۳۔	مثنویات ملاشاہ	شیرازہ،سری نگر	نومبر،۱۹۶۲ء	اردو
۲۴۔	غالب وسبک ہندی	فکرنو،دہلی	مارچ،۱۹۶۲ء	اردو
۲۵۔	دانش مہدی	ہنرنو،تہران	مارچ،۱۹۶۲ء	فارسی
۲۶۔	داستان پدماوت در ادبیات فارسی	مجلّہ دانشکدہ،تہران	جون،۱۹۶۲ء	فارسی
۲۷۔	فانی کشمیری	شیرازہ، سری نگر	جون،۱۹۶۲ء	اردو
۲۸۔	کلیات ساعی	مجلّہ دانشکدہ،تہران	دسمبر،۱۹۶۲ء	اردو
۲۹۔	میر کا سبک شاعری	مجلۂ یادبود میر،دہلی	۱۹۶۲ء	اردو

۳۰	دیوان اویس بیگ فطرت	معارف، پٹنہ	اپریل،۱۹۶۳ء	اردو
۳۱۔	صوفی مازندرانی	معارف، پٹنہ	اپریل،۱۹۶۳ء	اردو
۳۲۔	یک شاعرہ بر جستہ دورۂ شاہجہان	فکرونظر،علیگڑھ	جنوری،۱۹۶۳ء	اردو
۳۳	Mathura Das Hindu (ماتوراداس ہندو)	مجلۂ دانشگاہ ہندوی بنارس، وارانسی	۶۴۔۱۹۳۶ء	انگلس
۳۴۔	عربی و فارسی دا مطالعات ہند	مطالعات شرق شناسی در ہند، دہلی نو	۱۹۶۴	فارسی
۳۵۔	عصمت نامہ	راہنامی کتاب،تہران	فروری،۱۹۶۴ء	فارسی
۳۶۔	Qudsi Mushhadi (قدسی مشہدی)	اسلامک کلچر،حیدرآباد	اپریل،۱۹۶۴ء	انگلس
۳۷۔	حسن بیگ رفیع	برہان،دہلی	اگست،۱۹۶۴ء	اردو
۳۸۔	The story of Ramayana in Indo-Persian Literature	انڈوایرانیکا،کولکاتا	ستمبر،۱۹۶۴ء	انگلس
۳۹۔	روس کاایک فارسی شاعر	صبا،حیدرآباد	ستمبر،۱۹۶۴ء	اردو
۴۰۔	Panchkhanya (پنچاکیانہ)	اسلامک کلچر،حیدرآباد	جنوری،۱۹۶۵ء	انگلس
۴۱۔	دیوان شاہ	شیرازہ،سری نگر	مئی،۱۹۶۵ء	فارسی
۴۲۔	ملاشیدا	آریانا،کابل	مئی۔اگست	فارسی
۴۳۔	مولانا کاشفی	برہان،دہلی	جون،۱۹۶۵ء	اردو

۴۴۔ ہندوستان میں فارسی ادب کا مستقبل	معارف،اعظم گڑھ	جولائی،۱۹۶۵ء	اردو
۴۵۔ دیوان ہجری	معارف،اعظم گڑھ	اکتوبر،۱۹۶۵ء	اردو
۴۶۔ مثنوی ہجروصال	معاصر،پٹنہ	ستمبر،۱۹۶۵ء	اردو
۴۷۔ Translation in and from Persian	انواد،دہلی	نومبر،۱۹۶۵ء	انگلس
۴۸۔ مثنوی معدن الجوہر	جامعہ،دہلی	دسمبر،۱۹۶۵ء	اردو
۴۹۔ صائب تبریزی اصفہانی	انڈوایرانیکا،کولکاتا	دسمبر،۱۹۶۵ء	فارسی
۵۰۔ نظیرا کبرآبادی وسبک ہندی	نذرعرشی،دہلی نو	......	اردو
۵۱۔ داستان رامایانا در ادبیات فارسی	مہر،تہران	مارچ،۱۹۶۵ء	فارسی
۵۲۔ The story of Hir Ranjha in Indo-Persian Literature	قومی زبان،کراچی	دسمبر،۱۹۶۶ء	انگلس
۵۳۔ The story of Sassi and Punu in Indo-Persian Literature	یادنامہء پریچی کمار باروا، گوھاٹی	۱۹۶۶ء	انگلس
۵۴۔ افغانستان کی سماجی اور ادبی سرگامیاں	نیادور،لکھنؤ	مئی،۱۹۶۶ء	اردو
۵۵۔ Chandra Bhan Brahman	اسلامک کلچر،حیدرآباد	اپریل،۱۹۶۶ء	انگلس

۵۶۔ دیوان راقم	معارف اعظم گڑھ	مارچ،۱۹۶۶ء	اردو
۵۷۔The story of Mina and Lurak in Indo-Persian Literature	یاد نامۂ سوریا کمار بویان، گو ھاٹی	۱۹۶۶ء	انگلس
۵۸۔ سیاہ موی جلالی	انڈو ایرانیکا، کولکا تا	جون،۱۹۶۶ء	فارسی
۵۹۔ روابط ادبی افغانستان و ہند	ادب، کابل	جون۔جولائی،۱۹۶۶ء	فارسی
۶۰۔ 'Indian stories in Indo-Persian Literature	ادبیات، ہند	جولائی۔ستمبر،۱۹۶۶ء	انگلس
۶۱۔ ثنایی مشہدی	معارف، اعظم گڑھ	نومبر،۱۹۶۶ء	اردو
۶۲۔ شریف کاشی	سبرس، حیدرا آباد	نومبر،۱۹۶۶ء	اردو
۶۳۔ عبدالرحمٰن مشفق	مجلّہ علوم اسلامی، علیگڑھ	جون۔جولائی،۶۶ ۱۹ء	اردو
۶۴۔ پنچا کیانہ (ترجمۂ نا شناختہ پنچاتنترا)	مجلۂ دانشکدۂ ادبیات، تہران	جنوری۔جون،۱۹۶۶ء	فارسی
۶۵ فارسی ادب میں ستی کی داستانیں	تحریر، دہلی	جلد دوم،۱۹۶۶ء	اردو
۶۶۔ کلیات توفیق	شیرازہ، سری نگر	جنوری۔جون، ۶۷۔۱۹۶۶ء	اردو
۶۷۔ صبا کاکوروی	انڈو ایرانیکا	مارچ،۱۹۶۶۷ء	فارسی
۶۸۔ Talib-i-Amuli (طالب آمولی)	اسلامک کلچر، حیدرا آباد	اپریل، ۱۹۶۷ء	انگلس
۶۹۔ نوعی خبوشانی	معارف، اعظم گڑھ	جون،۱۹۶۷ء	ارو

۷۰ افغانستان و ہند	جامعہ، دہلی	اگست، ۱۹۷۶ء	اردو
۷۱۔ صائب	یادنامۂ ژان ریپکا، پراگ	۱۹۶۷ء	فارسی
۷۲۔ فارسی ادب میں حدیث کشمیر	آج کل، دہلی نو	اکتوبر، ۱۹۶۷ء	اردو
۷۳۔ سنجر کاشی	برہان، دہلی	نومبر، ۱۹۶۷ء	اردو
۷۴۔ منتخب اللطائف	نذر ذاکر، دہلی نو	۱۹۶۸ء	اردو
۷۵۔ ہمایوں اور اکبر کے دور کیا اردو غزلیں	تحریر، دہلی	۱۹۶۸ء	اردو
۷۶۔ میر جملہ روحالامین	آئینہ ہند، تہران	خرداد، ۱۳۴۷ھ	فارسی
۷۷۔ سعید تہرانی	آئینہ ہند، تہران	مرداد، ۱۳۴۷ھ	فارسی
۷۸ دیوان رضا	تحریر، دہلی	۱۹۶۸ء	اردو
۷۹۔ حدیث کشمیر در ادبیات فارسی	آئینہ ہند، تہران	شہریور، ۱۳۴۷ھ	فارسی
۸۰۔ سالک قزوینی	شیرازہ، سری نگر	ستمبر، ۱۹۶۸ء	اردو
۸۱۔ فتح گیلانی	سبرس، حیدرآباد	نومبر، ۱۹۶۸ء	اردو
۸۲۔ ناصر ہمدانی	رنگ و بو، بریلی	مارچ، ۱۹۶۸ء	اردو
۸۳۔ ابوطالب کلیم کاشانی	مجلۂ انجمن تحقیقات بہار، پٹنہ	۱۹۶۸ء	اردو
۸۴۔ عارف خراسانی	نیا دور، لکھنؤ	اپریل، ۱۹۶۸ء	اردو
۸۵۔ رستم مرزا فدائی	تحریر، دہلی	۱۹۶۸ء	اردو
۸۶۔ برخی از منابع ناشناختہ فارسی برای مطالعہ تاریخ و فرہنگ ایران و ہند	ہنر و مردم، تہران	آذر، ۱۳۴۸ھ	فارسی
۸۷۔ غروری	معارف، اعظم گڑھ	نومبر، ۱۹۷۰ء	اردو
۸۸۔ تراجم آثار ہندی بہ فارسی	راہنمایی کتاب، تہران	مرداد، ۱۳۴۹ھ	فارسی

۸۹۔ پنڈت زندہ رام موبد کشمیری	دانش، سری نگر	.....	اردو
۹۰۔ مجرم کشمیری	شیرازہ، سری نگر	اپریل، ۱۹۷۰ء	اردو
۹۱۔ مثنویہای رانی چندرا کرن	ملجہ دانشکدۂ ادبیات و علوم انسانی، تہران	مارچ، ۱۹۷۱ء	فارسی
۹۲۔ دیوان بیرم خان	یادنامۂ مالک رام، دہلی نو	مارچ،	اردو
۹۳۔ Darya-i-Asmar (دریای اسمار)	اسلامک کلچر، حیدرا آباد	جولائی، ۱۹۷۲ء	انگلس
۹۴۔ فارسی ادب میں ہندوستانی داستانیں	آجکل، دہلی نو	نومبر، ۱۹۷۲ء	اردو
۹۵۔ سہم گرانقدر ہند در گسترش زبان وادبیات	مجلۂ انجمن ہندوایران، دہلی نو	جنوری، ۱۹۷۳ء	فارسی
۹۶۔ دیوان ہادی	معارف، اعظم گڑھ	اکتوبر، ۱۹۷۳ء	اردو
۹۷۔ Bab Farid as a Persian Poet	یادنامۂ بابا فرید، پٹیالہ	۱۹۷۳ء	انگلس
۹۸۔ Baba Sheikh Fariduddin Ganj-i-Shakar	یادنامۂ بابا فرید، پٹیالہ	۱۹۷۳ء	انگلس
۹۹۔ یکی از نسخہ ہای خطی کہن و اصیل دیوان حافظ	خردوکوشش، شیرازہ	آذر، ۱۳۵۱ھ	فارسی
۱۰۰۔ تاراچند وادبیات فارسی	آجکل، دہلی نو	جولائی، ۱۹۷۴ء	اردو

۱۰۱۔	Maulana Jlaluddin Rumi, His Times and Relevance to Indian Thought	مجلۂ انجمن ہندوایران، دہلی نو	آپریل ۔جولائی ۱۹۷۴ء	انگلس
۱۰۲۔	آثارنادرامیرخسرودرترکی	آجکل، دہلی نو	نومبر،۱۹۷۴ء	اردو
۱۰۳۔	ضمیمۂ تغلق نامہ	راہنمایی کتاب، تہران	فروردین۔خرداد، ۱۳۵۴ھ	فارسی
۱۰۴۔	ضمیمۂ تغلق نامہ	مجلس امیرخسرو بلخی، کابل	۱۳۵۴ھ	فارسی
۱۰۵	غزلیات فارسی امیرخسرو دہلوی	نیادور، لکھنؤ	دسمبر،۱۹۷۴ء	اردو
۱۰۶۔	A Persian Poet Par Excellence	مجلۂ یادبودامیرخسرو، دہلی نو	اکتوبر،۱۹۷۴ء	انگلس
۱۰۷	امیرخسرووسبک ہندی	خسروشناسی، دہلی نو	اکتوبر،۱۹۷۶ء	اردو
۱۰۸	Awadh in the Times of Amir Khurau	مجلۂ یادبودامیرخسرو، دہلی نو	۱۹۷۶ء	انگلس
۱۰۹	قصاید نا شناختہ و گرانبہای شعرای بزرگ ایران	مجلّہ انجمن ہندوایران، دہلی نو	۱۹۷۶ء	فارسی
۱۱۰	شاہنامہ وہند	فردوسی و ادبیات جہان تہران (جشن طوس)	۱۹۷۶ء	فارسی

۱۱۱۔ Some Valuable and Hitherto Unknown Persian Anthology in Indian Libraries and Museum	مطالعات ہندوایران، دہلی نو	۱۹۷۷ء	انگلس
۱۱۲۔ Some precious and Valuable Gazals of Famous Persian Poets	انڈوایرانیکا، کولکاتا	۱۹۷۶ء	انگلس
۱۱۳۔ مطالعات و رباعیات نا شناختہ شعرای بزرگ فارسی	سخن، تہران	جنوری۔فروری، ۱۹۷۷ء	فارسی
۱۱۴۔ آثار نا شناختہ فردوسی و عنصری	مجلۂ انجمن ہندوایران، دہلی نو	۷۷۔۱۹۷۶ء	فارسی
۱۱۵۔ مقطعات نا شناختہ خلاق المعانی	نشریۂ دانشکدۂ ادبیات علوم انسانی، اصفہان	۷۷۔۱۹۷۶ء	فارسی
۱۱۶۔ مطالعات تحقیقات فارسی در ہند	بیاض، دہلی	ستمبر، ۱۹۷۷ء	فارسی
۱۱۷۔ دیوان قپلان بیگ کا ایک اہم خطی نسخہ	معارف، اعظم گڑھ	ستمبر، ۱۹۷۸ء	اردو
۱۱۸۔ اقبال از حیث غزل سرای فارسی	انڈوایرانیکا، کولکاتا	مارچ۔جون، ۱۹۷۸ء	فارسی

۱۱۹۔ Hafiz and India	انڈوایرانیکا،کولکاتا	ستمبر۔دسمبر،۱۹۷۸ء	انگلس
۱۲۰۔ دیوان کوکبی	مجلۂ دانشگاہ دہلی،دہلی	مارچ،۱۹۷۹ء	فارسی
۱۲۱۔ مجموعہ لطائف و ظرایف	سفینۂ کتاب،کابل	۱۹۷۹ء	فارسی
۱۲۲۔ دیوان غضنفری	معاصر،پٹنہ	۱۹۸۰ء	اردو
۱۲۳۔ سبک شعر فارسی میر تقی میر	نقوش،لاہور	شمارہ۲،۱۹۸۰ء	اردو
۱۲۴۔ امیر خسرو کی چند غیر مطبوعہ غزلیں اور قطعات	آجکل،دہلی نو	جنوری،۱۹۸۰ء	اردو
۱۲۵۔ خان کلان میر محمد خان غازی	نذر زیدی،دہلی نو	۱۹۸۰ء	اردو
۱۲۶۔ فارسی ادب کی ترویج میں منشی نولکشور کا حصہ	نیا دور،لکھنؤ	نومبر۔دسمبر،۱۹۸۰ء	اردو
۱۲۷۔ Some Valuable & Hitherto Unknown Quatrains of Umar Khayyam	انڈوایرانیکا،کولکاتا	مارچ۔دسمبر،۱۹۸۰ء	اردو
۱۲۸۔ نسخہ خطی کہنہ و پر ارزش غزلیات سلمان ساوجی	مجلّہ کتابخانہ خدابخش،پٹنہ	جنوری،۱۹۸۱ء	فارسی
۱۲۹۔ فارسی ادب پر ہندی کا اثر	غالب نامہ،دہلی نو	جنوری،۱۹۸۱ء	اردو
۱۳۰۔ دیوان ابوالفرج رونی	مجلّہ دانشگاہ دہلی،دہلی	فروری،۱۹۸۱ء	فارسی
۱۳۱۔ ہندوستان خسرو کی نظر میں	اردو اکیڈمی،لکھنؤ	جولائی،۱۹۸۱ء	اردو

۱۳۲۔ حدیث بنارس در ادبیات فارسی	آجکل، دہلی نو	جولائی، ۱۹۸۱ء	اردو
۱۳۳۔ امیر معزی کے تین غیر مطبوعہ قصائد	دانش، سری نگر	شمارہ ۵	اردو
۱۳۴۔ An Scientific Study of Indo-Persian is necessary	انڈو ایرانیکا، کولکاتا	مارچ/ دسمبر، ۱۹۸۱ء	انگلس
۱۳۵۔ دیوان احسن دہلوی کی چند اہم مخطوطات	منادی، دہلی نو	۱۹۸۱ء	اردو
۱۳۶۔ جلیس المشتاق	نذر حمید، دہلی نو	جون، ۱۹۸۱ء	اردو
۱۳۷۔ غالب و سبک ہندی	غالب نامہ، دہلی نو	جون، ۱۹۸۲ء	اردو
۱۳۸۔ بیدل و سبک ہندی	مجلّہ مرکز عربی و فارسی، پٹنہ	۱۹۸۲ء	اردو
۱۳۹۔ ہند و پاک کا ایک معروف محقق	مجلّہ انسٹیوٹ عربی و فارسی، ٹونک	۱۹۸۲ء	اردو
۱۴۰۔ سلمان ساؤجی کی چند غیر مطبوعہ غزلیں	مجلّہ کتاب خانہ خدا بخش، پٹنہ	۱۹۸۲ء	اردو
۱۴۱۔ India's Rich and Valuable Contribution to Persian Literature	مجلّہ کتاب خانہ خدا بخش، پٹنہ	۱۹۸۲ء	انگلس
۱۴۲۔ تذکرۃ السلاطین یا مجموعہ اشعار	مطالعات فارسی ہند دانشگاہ کلکتہ، کلکتہ	۸۲۔۱۹۸۱ء	اردو

۱۴۳۔دیوان ساعی	معارف،اعظم گڑھ	نومبر،۱۹۸۲ء	اردو
۱۴۴۔Some Valuable and Hitherto Unknown Quatrains of Great Persian writers	مجلّہ دانشکدہ،لاہور	۱۹۸۲ء	انگلس
۱۴۵۔ بیاض مہم شعرای فارسی	غالب نامہ،دہلی نو	جنوری،۱۹۸۳ء	اردو
۱۴۶۔ خواجہ حسن مروی	اردو اکیڈمی،لکھنؤ	جنوری۔فروری	اردو
۱۴۷۔ خم کدۂ خیام	یادنامہ آغا زشیر قزلباش،دہلی نو	۱۹۸۳ء	اردو
۱۴۸۔ دیوان عشقی	مجلّہ مرکز تحقیقات عربی وفارسی، بہار،پٹنہ	۱۹۸۳ء	اردو
۱۴۹۔Some Valuable and Unknown Sources for the Study of Indian History and Culture	مجلّہ مرکز تحقیقات عربی وفارسی، ٹونک	نومبر،۱۹۸۲ء	انگلس
۱۵۰۔ دیوان پیام	نوای ادب،ممبئی	اپریل،۱۹۸۴ء	اردو
۱۵۱۔ بیاض نادر شعرای فارسی	غالب نامہ،دہلی نو	جولائی،۱۹۸۴ء	اردو
۱۵۲۔ امیر خسرو کا غیر مطبوعہ منظوم کلام	یادنامۂ امیر خسرو،مرکز تحقیقات عربی وفارسی،پٹنہ	۱۹۸۲ء	اردو
۱۵۳۔غزلیات ناشناختہ سعدی	کیہان فرہنگی،تہران	دی ماہ،۱۳۶۳ھ	فارسی
۱۵۴۔ یک بیاض نادر خطی	دانش،اسلام آباد	۱۹۸۴ء	فارسی

۱۵۵۔ غزلیات ناشناختہ ہلالی	بیاض، دہلی	۱۹۸۲ء	فارسی
۱۵۶۔ فارسی کی ایک اہم بیاض	غالب نامہ، دہلی نو	جنوری، ۱۹۸۳ء	اردو
۱۵۷۔ بیاض والہ داغستانی	غالب نامہ، دہلی نو	جنوری، ۱۹۸۴ء	اردو
۱۵۸۔Some Hitherto of Unknown Ghazals of Attar, Sa'di and Hafiz	مجلّہ انجمن تاریخی ، دانشگاہ پنجاب، لاہور	۱۹۸۵ء	انگلس
۱۵۹۔ بتخانہ	غالب نامہ، دہلی نو	جنوری، ۱۹۸۶ء	اردو
۱۶۰۔ عبد الرحمٰن جامی کا غیر مطبوعہ کلام	معارف، اعظم گڑھ	جنوری، ۱۹۸۶ء	اردو
۱۶۱۔ یک معمای ناشناختہ دقیقی	فرہنگ وہنر، تہران	بہمن، ۱۵۳۵ھ	فارسی
۱۶۲۔ فسونی یزدی	بیاض، دہلی	شمارہ۲، ۱۹۹۸ء	فارسی

ماخذ:۔

۱۔ عابدی نامہ، گروہ زبان وادبیات فارسی، دانشگاہ دہلی وانجمن دہلی، ای۔ایس پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی، ۱۹۹۰ء

۲۔ داریای اسمار، ڈاکٹر تاراچند و پروفیسر سید امیر حسن عابدی، علیگڑھ، مسلم یونیورسٹی، فروری، ۱۹۹۷ء

۳۔ بیاض، مجلّہ تحقیقات فارسی، انجمن فارسی دہلی، ہند، شمارہ۲، ۱۹۹۸ء

۴۔ سیمای عابدی، پروفیسر سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی، بخش فارسی، دانشکدہ ہنر، دانشگاہ دہلی، ۲۰۰۴ء

☆☆☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تاریخ دکن کے چند منظوم مآخذ

تخریب وترتیب اس عالم فانی کا روز ازل سے دستور رہا ہے اور ہندوستان جنت نشان میں اسلامی حکومتوں کے حوالے اگر اس عمل کا ذکر کیا جائے تو شاید سب سے زیادہ آثار نظر آئیں گے۔ محمد بن قاسم کی فتح سندھ، محمود غزنوی کی مسلسل فتوحات، سام میرزا کی فتح ہند پھر مملوک سلاطین کی تشکیل حکومت اسلامی اس عمل کا آئینہ ہیں۔ ہندوستان میں مستحکم اور وسیع سلطنت کی جو ترتیب سکندر ثانی نے کی اسکی عہد تغلق میں ایسی تخریب ہوئی کہ تقریباً ہر خطہ ہند میں ایک خود مختار سلطانت قائم ہوگئی انہیں خود مختار حکومتوں میں سرزمین دکن میں ایک مستحکم و وسیع سلطنت بہمنی بھی تھی جس میں کم وبیش ۱۸ سلاطین سریر آرائے سلطنت ہوئے اور ان سلاطین نے اپنی علم پروری وادب نوازی کے ایسے ایسے باب وا کئے جو خود میں دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سلطان محمود تغلق نے ۱۳۴۲ء میں ظفر خان کو جنوبی ہند کا صوبہ دار مقرر کیا اس نے دکن کے سرداروں کو اپنے ساتھ ملا مرکز سے علیحدگی اختیار کی اور ۱۳۴۷ء میں علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے لقب سے آزاد بہمنی سلطنت کی بنیات رکھی ۱۸ سلاطین پر مشتمل بہمنی حکومت میں دکن میں تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ زراعت، عمارات اور فنعن لطیفہ پر بھی خاص توجہ دی گئی فارسی اس زمانہ میں تو تھی ہی ساتھ ساتھ اردو نے بھی نشو ونما پائی اور اسلام کی بھی خوب تبلیغ واشاعت ہوئی۔ ۱۴۹۰ء میں اس سلطنت پر زوال آنا ہوا شروع ہوا اور تقریباً دوسو سال اس خاندان کے فرزندوں نے جس آب وتاب سے دکن کی سرزمین پر حکومت کی تھی وہی حکومت ایک بار تخریب کا شکار ہوئی اور پانچ خود مختار بریدشاہی، عمادشاہی، نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کی ترتیب عمل میں آئی۔ عہد بہمنیہ میں فارسی زبان وادب کی خوب آبیاری ہوئی بہت سی منظوم ومنثور نگارشات قلع قرطاس پر اتر کر آج تک بہمنی سلاتین کے جاہ وحشم کی دلیل بنی ہوئی ہیں اس مختصر سے مقالہ چند اہم منظوم تاریخی نگارشات کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں اس عہد کی تاریخ میں اہم مآخذات کا مقام حاصل ہے۔

ا۔ تحفۃ السلاطین

یہ بہمنیوں کی منظوم تاریخ اس کے مصنف ملا داؤد بیدری ہیں بقول نبی ہادی (ص ۱۵۷) ملا بیدری نے سلطان

فیروز شاہ بہمنی اور احمد شاہ بہمنی کے عہد میں خوب شہرت پائی۔ ملا بیدری نے تحفۃ السلاطین ۱۳۹۷۔۱۴۱۷ء کے درمیانی سالوں میں لکھی اور اس میں سلطان فیروز شاہ اور اس کے جانشین احمد شاہ کے احوال، ان کی جہان بینی و جہان بانی اور دیگر حالات درج کئے ہیں۔ دانشنامہ ادب فارسی در شبہ قارہ (ج ۴ ص ۱۱۵۲)، تاریخ نویسی فارسی در شبہ قارہ (ج ۴، ص ۱۶۷۶) اور تاریخ فرشتہ میں اس تصنیف کی معمولات درج کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ فرشتہ، بہمن نامہ آذری، برہان مآثر جیسی اہم تصانیف میں اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۲۔ بہمن نامہ دکنی

یہ منظوم تاریخ نور الدین محمد بن عبد الملک کا اثر ہے کچھ تذکرہ نگاروں نے اس کا نام علی بن حمزہ عبد الملک لکھا ہے جو کہ طوس کا رہنے والا تھا۔ بقول فرشتہ (ج ۱، ص ۳۳۶) ۷۸۳ق میں اسفراین میں پیدا ہوا اس کی ولادت کا مھینہ آذر تھا لہٰذا خود کو آذری لکھا۔ بہت زمانہ تک شاہ رخ میرزا بن امیر تیمور کے دربار سے وابستہ رہا اور ملک الشعراء کے خطاب سے بھی سرفراز ہوا اس کے بعد اس نے فقر و درویشی کو اپنا شیوہ بنایا اور شیخ محی الدین طوسی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا شاہ نعمت اللہ سے اسے اجازت و خلافت عطا ہوئی کچھ دنوں تک مکہ میں قیام کیا اور ایک تصنیف بعنوان ''سعی الصفا'' لکھی۔ بقول دولت شاہ سمرقندی (ص ۳۰۱) احمد شاہ بہمنی کے عہد میں دکن آیا، دربار سے وابستہ ہوا اور ملک الشعرای کا خطاب حاصل کیا۔ آذری کو جب وطن کی یاد آئی اور سلطان سے انعام و اکرام لے کر وطن لوٹا تو اس نے بہمن نامہ لکھنے کا ارادہ کیا اور ہر سال جتنے اشعار اسفراین میں کہتا انہیں دکن بھجوا دیتا ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کیا اس کی تصانیف میں بہمن نامہ آذری، جواہر الاسرار، طغرای ہمایون، مرآت عجائب غرائب (تاریخ نویسی در شبہ قارہ ص ۳۸۴) وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔ بہمن نامہ آذری عہد بہمنی کی منظوم تاریخ ہے جسے بحر متقارب میں نظم کیا گیا ہے اس میں بہمنی سلطنت کی ابتداء سے سلطان ہمایون شاہ بہمنی تک کے حالات بڑے دلپذیر انداز میں بیان کئے ہیں۔ اس منظوم تاریخ سے تاریخ فرشتہ اور تاریخ ادبیات در ایران میں استفادہ کیا گیا ہے۔

۲۔ بہمن نامہ نظیری

اسے اگر بہمن نامہ آذری کا تکملہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ آذری اسفرائنی کی وفات کے بعد اس کے آگے کے حالات کو اس بہمن نامہ میں نظیری مشہدی نے قلم بند کیا جو کہ ہمایون شاہ بہمنی کے عہد میں دکن میں تھا اور محمود گاوان کا تبیت یافتہ تھا۔ نظیری شاہ نعمت اللہ ولی کے مریدوں میں سے تھا دکن آکر اس نے محمود گاواں کی سرپرستی حاصل کی اور اس کی کوششوں سے منصب ملک الشعرای عطا ہوا۔

آذری کی وفات کے بعد اس کی منظوم تاریخ کو آگے بڑھاتے ہوئے نظیری نے ملا سامعی کے ساتھ تقریباً

بہمنیہ سلطنت کے اختتام تک کے حالات اس میں درج کئے ہیں بلکہ ہمایوں شاہ کے ظلم وستم کی سادتان بھی درج کی ہے۔

۳۔بہمن نامہ ملا سامعی

ملا سامعی ایک ایرانی نژاد شاعر ہے جو محمود شاہ بہمنی کے عہد میں دکن میں وارد ہوا بقول فرشتہ اس کی تاریخ ولادت جای ولادت اور زمانہ مہاجرت کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔نظیری طوسی کے بہمن میں یہ خوش بیان شاعر بھی رہا جس کی وجہ سے کہیں کہیں اس بہمن نامہ کو بہمن نامہ سامعی بھی لکھا گیا ہے۔

۴۔فتح نامہ محمود شاہی

بیدر کے شاعر عیانی بیدری کا کارنامہ ہے جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس خطہ میں گذارا اور اس مناسبت سے خود کو بیدری لکھا یہ محمود شاہ دوم بہمنی کا پروردہ تھا اور فتح نامہ میں اس نے محمود شاہ کی گلبرگہ اور ساغر کی فتوحات کا ذکر کر کے اپنی تصنیف کو اس کے نام سے منسوب کیا ہے یہ تصنیف مدراس سے شائع ہو چکی ہے۔

۵۔فتوح السلاطین

فتوح السلاطین مشہور بہ شاہنامہ ہند عصامی کی شہرہ آفاق تصنیف ہے جس نے سلطان محمد تغلق کے تبدیل دارالخالفہ کے فیصلہ کے باعث دہلی سے دکن مہاجرت کی اور بعد میں سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے تعاون سے فتوح السلاطین نظم کی جس میں بہمنی حکومت کے ابتدائی دور کی مکمل تفصیلات درج کی گئی ہیں۔

یہ چند وہ منظوم تصانیف ہیں جن کے بارے میں تاریخوں سے معلومات فراہم ہو جاتی ہیں ظاہر ہے اس عظیم الشان سلطنت اور علم پرست وادب نواز سلاطین کے دور حکومت میں بے شمار شعراء، ادباء علماء فضلاء نے فیض حاصل کیا ہوگا اور اپنی کاوشوں پر داد وتحسین بھی حاصل کی ہوگی اور آج ممکن ہے ایسی بہت سی تصانیف لاعلمی کی وجہ طاق عصیان بنی ہوں ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ کم از کم اپنی تاریخ کو ترتیب کے ذریعہ، حوالوں کے ذریعہ، مقالوں اور کتابوں میں محفوظ کیا جائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر حنا اسحٰق
اسسٹنٹ پروفیسر، ویمنس کالج
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قطب شاہی سلطنت کا ایک تاریخ نویس: مرزا نظام الدین صاعدی

''حدیقۃ السلاطین قطب شاہی'' عبداللہ قطب شاہ (۱۰۲۲۔۱۰۸۳ھ/۱۶۱۴۔۱۶۷۲ء) کے عہد کی ایک اہم اور قابل قدر تاریخ ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کی ولادت (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۴ء) سے مصنف کی وفات ۱۰۵۳ھ/۱۶۴۳ء (قیاساً) تک یعنی اکتیس برسوں پر محیط ہے۔ یہ تاریخ متعدد نقطۂ نظر سے منفرد ہے۔ اس کتاب کے مصنف مرزا نظام الدین احمد ولد عبداللہ صاعدی الشیرازی ہیں۔ ان کے تفصیلی حالات زندگی کہیں دستیاب نہیں ہوسکے۔ ان کے عہد اور ان کے بعد کے مصنفین کی تخلیقات میں بھی ان کی زندگی کے بارے میں کچھ اطلاع فراہم نہیں ہوسکی۔ ان کے مختصر حالات زندگی خود ان کی اسی تصنیف سے معلوم ہوتے ہیں، جس کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

اس بات کا ثبوت حدیقۃ السلاطین سے ملتا ہے کہ وہ سلطان محمد قطب شاہ (۱۵۹۳۔۱۶۲۶ء) کے دور میں گولکنڈہ میں مقیم تھے اور پیشوائے سلطنت یعنی وزیر اعظم علامہ ابن خاتون العاملی (۹۷۹یا۹۸۰۔و۱۰۵۸ھ کے بعد) سے منسلک تھے، جن کو وہ انتہائی عزت و وقار کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ابن خاتون کو ۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء میں قطب شاہی سفیر کے طور پر ایران میں تعینات کیا گیا تھا جبکہ نظام الدین گولکنڈہ میں ہی مقیم تھے۔ آپ اس عہد میں حکیم حاذق کے طور پر بھی مشہور تھے۔ یہ اطلاع فراہم نہ ہوسکی کہ وہ سلطان محمد قطب شاہ کی خدمت میں کس منصب پر فایز تھے۔ لیکن وہ تمام اہم موقعوں پر دربار میں حاضر رہتے تھے۔ مثلاً عبداللہ قطب شاہ کی ولادت کے موقع پر قطب شاہ کو درج ذیل اشعار میں ایک خوبصورت و تفصیلی اور وضاحتی خراج تحسین پیش کی ہے:

در عیش پروری عالم کشودند — زمرات دل رنگ کلفت زدودند
بمولود شهزاده نیك طالع — جهان را پراز عیش عشرت نمودند
نمودند اسباب عشرت مهیا — از آنچه درو هم آید فزودند

(حدیقۃ السلاطین، ص ۸)

نہ صرف یہ تمام اہم موقعوں پر بلکہ وہ عدالتی امور کے تمام اہم مواقع پر بھی حاضر رہتے تھے۔ فقط ان لمحات میں

ان کی ہمراہی نہیں ہوتی تھی جب بادشاہ وقت سفر میں ہوتا تھا۔

بیشتر تاریخ نویس نظام الدین صاعدی شیرازی کی تاریخ وفات کے متعلق خاموش نظر آتے ہیں البتہ خود ان کی تاریخ حدیقۃ السلاطین اچانک ۶ ذوالحجہ ۱۰۵۳ھ/ ۵ فروری ۱۶۴۴ء پر اختتام پذیر ہوگئی۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ شاید تاریخ کا اچانک اختتام مصنف کے انتقال کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ یہ کام عبداللہ قطب شاہ کے انیس سنہ جلوس یعنی ۱۰۵۳ھ تک کے خاتمے تک کا ایک موثر بیان ہے۔

اس کتاب میں مصنف کا خود ایک تعارف اور مقدمہ شامل ہے۔ وہ مقدمہ میں قارئین کو مطلع کرتا ہے کہ اس نے ابن قطب شاہ کے موقع پر عبداللہ قطب شاہ کے دور کی تاریخ لکھنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جسکا اندازہ مندرجہ ذیل قطعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کتاب پر ابن خاتون نے نظر ثانی کی تھی۔

ز مو میایی اصلاح او درست شده شکسته که من از خامه کرده ام تحریر
ز کیمیای افادات او مس سخنم زر تمام عیاری شد و رواج پذیر
کشوده چهره تصویرهای این اوراق چو مانی از قلم نکته ریز سحر نظیر

(حدیقۃ السلاطین، ص ۴)

نظام الدین نے ۱۰۵۳ھ (۱۶۴۴ء) میں حدیقۃ السلاطین کی تصنیف کا کام روک دیا تھا تو اس بات کے کافی امکانات ہیں کہ اس کی وجہ ان کی وفات یا بڑھاپے یا طبیعت کی خرابی ہو، کیونکہ اس نے اس وجہ سے اس کتاب کو حتمی شکل دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی سبب اس نے ابتدا میں ایک مقدمہ اور تعارف شامل کر کے ابن خاتون کی خدمت میں نظر ثانی کے لیے پیش کیا۔ لہذا اس کتاب میں کوئی باقاعدہ اختتام نہیں ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مصنف کے پاس وقت ہوتا تو وہ اس تصنیف کو جاری رکھتا۔

تاریخ حدیقۃ السلاطین ایک خاص اہمیت کی حامل تاریخ ہے کیونکہ مصنف عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا عینی شاہد ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں تاریخی اعتبار سے عبداللہ قطب شاہ کے باقاعدہ انیسویں سال کے آخر تک کے واقعات کو مجلس میں اپنی موجودگی کے حوالے سے درج کیا ہے۔ ساتھ ہی سال بہ سال ہونے والے تاریخی واقعات کو مرتب کر کے پیش کیا ہے۔ تصنیف کا آغاز مقدمہ سے کیا ہے جو کہ مختصر ہے۔ واقعات کو باقاعدہ سال کے تحت عنوان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے حصوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ کچھ واقعات کو بعین عنوانات کے تحت مخصوص تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے یہ دعوی کیا ہے کہ ان کے ذریعے درج حقایق مستند ہیں اور ان کے دیے ہوئے متنازعہ دیگر تاریخی واقعات کو جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد بھی وہ عاجزی کے ساتھ عرض اور گذارش کرتے ہیں کہ اگر اس کے بیان اور تحریر

میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو علما و محققین کے ذریعے اس کی اصلاح کی جائے۔

مورخ نظام الدین صاعدی نے کتاب کا آغاز خدا کی حمد وثنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے ساتھ کیا ہے۔ پھر حضرت محمد اور اس کے بعد اماموں کی مدح کی ہے۔ درحقیقت عبداللہ قطب شاہ کے پہلے باقاعدہ سال کے واقعات کو بیان کرنے سے پہلے تعارف میں عبداللہ قطب شاہ کی ولادت، اس کی تعلیم وتربیت کے ہمراہ کئی نائب ریاست یا ناظم سلطنت کے افراد کی تقرری کا تفصیلی احوال پیش کیا ہے۔ اس کے بعد وہ محمد قلی قطب شاہ کی بیماری اور ہندوستانی، ایرانی، عراقی اور دیگر معالجین کے ذریعے اختیار کی جانے والے ان کے معالج کا ذکر کرتے ہوئے بالآخر اس کی موت کا بیان کیا ہے اور اس کے فوراً بعد عوام میں رونما ہونے والے واقعات کو، جو کہ بادشاہ کی موت کی خبر سے قبل ہی پھیل گئے تھے، تفصیل سے درج کیا ہے۔ اس تعارف کا اختتام عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کی ایک خوبصورت وضاحت کے ساتھ ہوا ہے جبکہ مرکزی تاریخ کا آغاز پہلے باقاعدہ سال کے حوالہ سے ہوا ہے۔

حدیقۃ السلاطین میں تاریخی واقعات کو باقاعدہ سالوں کی ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی وسعت کی اہمیت کو محسوس کیا گیا ان کو علاحدہ علاحدہ عناوین کے تحت درج کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کرنے پر بادشاہ وقت کے علاوہ ایک اور شخصیت جو محوری مقام پر نظر آتی ہے، وہ ابن خاتون العاملی کی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ عہدِ عبداللہ قطب شاہ میں ابن خاتون کا عظیم کردار جبکہ دوسری وجہ خود اس کتاب کے مصنف کا ابن خاتون سے ذاتی دلچسپی ولگاو ہے۔ ڈاکٹر ڈاروے کا بیان ہے کہ ''مصنف سے توقع کے برخلاف اس تاریخی کتاب میں تاریخی معلومات کم ہیں اور انھوں نے سفارتی وفوجی واقعات کی بہ نسبت معاشرتی اور مذہبی واقعات کو زیادہ وسیع طور پر بیان کیا ہے۔

ڈاروے اپنی تاریخ A Short History of Persian Literature میں اس طرح رقم طراز ہے:

"Hadiqatu's-Salatin in unique in its literary exceilence. In its grace, elegance and colourfulness of description and its vivid depiction of ceremonials, celebrations and assemblies of revelry and merriment, it suprasses many other histories of this perid."

حدیقۃ السلاطین مغل اور ایرانی مملکت میں ہونے والی سرگرمیوں، ان کے ریاستی مذاکرات، ان کے اور اپنے کردار کے متعلق تفصیلات سے پُر ہے۔ اسی طرح جنگی واقعات کا بیان بھی مفصل ہے مثلاً قاسم کوٹ اور کرناٹک کی مہم

وغیرہ۔لیکن اس کتاب میں ایک چیز جس کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ سول اور ملٹری انتظامیہ کے ڈھانچہ کی کمی ہے۔سفارتی تاریخی پہلو،سفیروں کے معاہدوں،سفارتی واقعات،مواد کے اختتام اور حقایق کی تفصیلات کو پڑھتے ہوئے خط اور کتابت کافی واضح اور صاف ہیں۔

اگر ہم اس کی کتاب کو تاریخ نویسی کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ حدیقۃ السلاطین میں کئی دیگر قرون وسطی کی تاریخ کے مقابلے میں تجارت،زراعت اور انتظامیہ وغیرہ جیسے معاشرتی پہلوؤں کے بارے میں معلومات کا فقدان ہے۔سچ کہا جائے تو یہ کتاب تاریخی وسیاسی حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ ریاست ومعاشرت کے بیشتر پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتی ہے لیکن پھر بھی یہ تاریخ ان پہلوؤں کی علمی تفصیلات کی تعمیر نو میں خاطر خواہ مدد فراہم نہیں کر پاتی ہے۔یہ بات بلا شک کے کہی جاسکتی ہے کہ صاحبِ تصنیف نظام الدین کو معاشرے کی ثقافتی زندگی کو لکھنے میں زیادہ مہارت اور گہری دلچسپی تھی مثلاً محرم،عید میلاد النبی وغیرہ۔تہواروں کے ساتھ ساتھ فنکاروں کے مختلف گروہوں مثلاً رقاصوں،گویوں اور جادوگروں وغیرہ سے متعلق بھی معلومات فراہم کی ہیں۔اس کی سب سے اچھی مثال مؤلف نے ''قطب شاہی آرٹ گلیری'' کی خوبصورتی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

حدیقۃ السلاطین،تاریخ کے علاوہ ادبی اور لسانی اہمیت کی بھی حامل ہے۔اس کی زبان سے ایک گہری پختگی ظاہر ہوتی ہے۔مصنف نے اس کتاب میں دو طرفہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔پہلا انتہائی تخلیقی مضامین ہیں جو اس نے ابواب کے تعارفی حصوں میں اپنایا ہے جس میں وہ اپنے حکمراں کی ذاتی خصوصیات یا معاشرے کے ثقافتی پہلوؤں سے اپنی محبت ووفاداری کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔کبھی کبھی بارش کے موسم یا کسی ثقافتی تقریب کو بیان کرتے ہوئے وہ کچھ حد تک شاعرانہ ہو جاتا ہے مثال کے طور پر حسب ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

> ''عندلیب هزار داستان ناطقه شیرین مقال داستان خرمی فصل بر شگال وحکایت سواری و سیر خاقان یوسف جمال را برای تماشائیان گلستان اخبار و سیاران بوستان اسمار روزگار فقرات فصاحت آثار مسجع با جواهر اشعار مرصع نموده بلحن صریرخامه مشکبار باین آئین دلنشین می سراید که چون فصل برشگال که مبداء خرمی هرسال است پیدا شد روی زمین و فضای باغ و بساتین از سبزهٔ خود روو شگوفه وازهار خوشبو کمال خضرت و نضرت بهم رسانیده سبزه زار کنار انهار مشابهء خط تازه نوش لبان شیرین گفتار منظور انظار اولوالابصار گردید

و حلہ خضرای جبل مطرز بطراز سیمین انہار چشمہ سار و منقش بنقوش شگو فہ وازہار شد:

زمین پر سبزہ شدبستان پر از گل رخ خوبان شگفتہ گل گل ازمل
ہوای جان فزای فصل برسات دمیدہ جان در اجزای نباتات
بدلہا عیش وعشرت گشتہ انبوہ ز سیر مرغزارو دامن کوہ"

(حدیقۃ السلاطین،ص۔۸۶)

دوسرا انداز بیان وہ ہے جب پر جوش معاملات سے متعلق حالات وواقعات تحریر کرتا ہے تو اس کا بیان تند و تیزی سے نہیں بلکہ پر سکون واطمینان سے بھرے الفاظ میں کرتا ہے۔ درج ذیل عبارت سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

"اعلی حضرت خاقان سکندر منزلت بہ جہت اطمینان خاطر خلایق و رعایت حزم و پیش بینی جمعی از امراء را مثل نصیر الملک با لشکر عین الملک و شجاعت و وزارت دستگاہ یولچی بیگ و سیادت پناہ شجاع الملک و چند سر از امرای معتبر دکنی و چند نفر از سرداران ہندو را تشریف ہا دادہ بجانب سرحد طرف قصبہ ناندیرروانہ فرمودند کہ در آنجا بکمال عظمت قرار گیرند و ایشان بآنجانب رفتہ خیام فلک رفعت بر افراختہ با شان و شوکت تمام آرام گرفتندو خاقان سکندر شان بعد از آن متوجہ تعمیر و اہتمام قلعہ گولکندہ وقلاع نزدیک شدہ امر فرمودند کہ بہ ذخایرو استعداد وآلات و ادوات حرب بپر دازند و خود بدولت و اقبال سوار شدہ بدیدن قلعہ گولکندہ تشریف ارزانی وبروج و باروی آن را بنظر احتیاط در آوردہ امر فرمودند کہ شصت برج آنرا با آتشبازی و توپہااستحکام دہند"۔

(حدیقۃ السلاطین،ص۔۱۷۱)

حدیقۃ السلاطین کا ایک سب سے دلچسپ پہلو ہندوستان کی فطری خوبصورتی کی تعریف ہے۔وہ ایرانی اور ہندوستانی افراد کے منصفانہ رنگ کے مساوی ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے طاغوتی خوبصورتی کی بھی تعریف کرتا ہے۔وہ قطب شاہی سلاطین کی سرزمین یعنی دکن کی خوبیوں میں اپنے وطن کی خوبصورتی وخصوصیات کو دیکھتا ہے۔جس میں انھوں نے ہندوستانی زبان کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور تلگو زبان کا بھی کافی استعمال کیا ہے۔وہ ان دونوں زبانوں کے اسم کا مناسب استعمال کرتا ہے مثلاً بہمنیوں کے لیے بہمانہ،منڈوہ کے لیے مندبہ،ڈاک چوکی کے لیے داغ چوکی،دریائے تاپتی کے لیے تپتی اور دریائے کرشنا کے لیے کشنہ وغیرہ۔اسی طرح صاعدی نے ان زبانوں کے الفاظ کی جمع بنانے کے لیے فارسی الفاظ کے ساتھ مرکب بھی کیا ہے مثلاً منڈپ ہا،نا یکواریان،فصل برسات،کلاوندان رقاص،ڈولی کہنہ،دکاکین تاری وسیندی وغیرہ۔

المختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حدیقۃ السلاطین دکن کی نہ صرف سیاسی وثقافتی تاریخ ہے بلکہ اس کا شمار فارسی ادب کے خوبصورت نثری شہ پاروں میں بھی ہوتا ہے۔

''حدیقۃ السلاطین قطب شاہی'' کے عنوان سے اسے پہلی بار سید علی اصغر بلگرامی نے ۱۹۶۱ء میں ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد سے اپنے تعلیقات وحواشی کے ساتھ شائع کرایا۔حدیقۃ السلاطین کا اردو ترجمہ خواجہ محمد سرور نے کیا جو حیدرآباد سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد قمر عالم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کی تصانیف کے خطی نسخہ

نواب مصطفیٰ خان کا شمار عہد غالب کے ان نامور فارسی شعراء وادباء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ انیسویں صدی کے ہندوستانی فارسی ادب میں ایک گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ آپ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر انشاء پرداز بھی تھے۔ نواب مصطفیٰ خان نے فارسی ادب کے خزانے میں کئی اہم تخلیقات اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں آپ کا سفر نامۂ حج بنام ترغیب السالک (رہ آورد) خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ دیوان فارسی، رقعات فارسی، تذکرہ گلشن بیخار وغیرہ آپکی یادگار شاہکار ہیں۔ زیر نظر مقالے میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجودہ ان تمام تخلیقات کے مخطوطات کے حوالے سیے نواب صاحب کی فارسی خدمات کو پیش کیا جارہا ہے۔

نواب صاحب کا نام' محمد مصطفیٰ خان' اور تخلص حسرتی (فارسی میں) وشیفتہ (اردو میں) تھا، آپ کی ولادت ۱۸۰۶ء میں دہلی کے ایک معزز خاندان میں ہوئی، والد کا نام نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خان بہادر تھا۔ نواب مرتضیٰ خان پہلے دہلی میں جاگیردار تھے پھر ۱۸۱۴ء میں جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر) کے تعلق دار ہوگئے، والد کے انتقال کے بعد مصطفیٰ خاں بھی جہانگیر آباد کے تعلق دار مقرر ہوئے۔

نواب مصطفیٰ خان کی تعلیم وتربیت اپنے عہد کے عظیم اساتذۂ کرام کے زیر سایہ ہوئی۔ فارسی، عربی وعلوم مروجہ دہلی کے مشہور بزرگ معلم میاں جی مالا مال سے اور علم حدیث، فقہ، تجوید وقرأت حضرت مولانا حاجی محمد خورد دہلوی نقشبندی سے حاصل کیا۔ آپ علوم دینی کا حد درجہ شوق رکھتے تھے اور اپنا زیادہ تر وقت دینی مسائل کا حل کرنے میں ہی گزارتے تھے، ساتھ ہی شعر وسخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔[۱]

۱۸۵۷ء یعنی غدر سے قبل نواب مصطفیٰ خان نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں ہی گزارا تھا، یہاں آپ کا مفتی صدرالدین آزردہؔ، نواب ضیاء الدین خان، حکیم احسن اللہ خاں، مولوی امام بخش صہبائی، سید غلام علی خان وحشتؔ، میر حسین تسکینؔ، حکیم مومن خان مومنؔ اور مرزا اسداللہ خان غالبؔ جیسے عظیم سخنوران ہند کے ساتھ روزانہ کا میل جول رہتا تھا، ان تمام صاحبان علم وفن کی صحبتوں میں رہ کر ہی نواب صاحب اپنے کلام میں روز بہ روز اضافہ کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء

میں دلی کے اجڑ جانے کے بعد سے نواب مصطفیٰ خان کا زیادہ تر قیام جہانگیر آباد میں ہی ہونے لگا، یہاں پر اب دہلی جیسے علمی چرچے، وہاں جیسی ادبی محفلیں، شعری نشستیں نہیں ہوا کرتی تھین ۔اسی وجہ سے اب آپ کا شغل شعروشاعری بہت کم ہوگیا،گلشن بیخار میں رقمطراز ہیں:

'' چون ربط به این فن از دیگر اشغال عالیه و فنون شریفه باز می دارد، اکنون دیگر گاه است که سرو کارم نیست ،مگر به تحریك محفلیان گاهی از واردات جدیده اتفاق می افتد، آن هم بعد سالی نه که ماهی....''[۲]

نواب مصطفیٰ خان کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی، آپ کو دہلی میں اپنے جدامجد کی قبر (جو کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جوار میں موجود ہے) کے قریب دفن کیا گیا، آپ کی وفات پر جناب خواجہ کرامت علی صاحب پانی پتی نے یہ قطعہ تاریخ نظم کیا تھا:

چو رفت از جهان مصطفی خان امیر — که بود اصل پاکیزۂ و پاك فرع
خداوند تقوی،خداوند زهد — فقیر آشنا سالك راه شرع
شد از فوت آن بی سر و پا تمام — وفاءِ کرم بذل و تقویٰ و ورع[۳]

مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے Manuscript Division میں نواب مصطفیٰ خان کے نام سے باقاعدہ ایک کلیکشن ''شیفتہ کلیکشن'' موجود ہے، جس میں ۱۵۱، فارسی مخطوطات شامل ہیں ۔آزاد لائبریری میں نواب صاحب کی ذاتی تخلیقات میں ان کے سفرنامۂ حج کے پانچ قلمی نسخے، تذکرہ گلشن بیخار کے دو قلمی نسخے، نثر حسرتی کا ایک قلمی نسخہ، اور متفرق غزلیات کا ایک مختصر سا قلمی نسخہ موجود ہے۔جن کی تفصیلات ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

(۱) سفرنامۂ ترغیب السالک:۔ آپ کی تمام تخلیقات میں سب سے اہم سفرنامہ حج ہی ہے۔جس میں ہم کو انیسویں صدی کے ہندوستان سے شناسائی، حج کو جانے کے راستے سے آشنائی، اس وقت کے تہذیب وتمدن، دلّی سے ممبئی کے راستے اور بیچ میں پڑنے والے تمام شہروسرائیں اور انکے بیچ کی مسافت کا بخوبی علم ہوتا ہے، ساتھ ہی آپنے حج کے مناسک و مسائل، آداب، فرائض، سنن، واجبات وغیرہ کو فقہی مسائل کی روشنی میں بھی حل کیا ہے، جگہ جگہ 'مسلۂ' عنوان دیکر ہر بات کو واضح کرکے بیان کرتے ہیں۔اسی سفرنامے کے ذریعہ سے ہم کو نواب صاحب کی زندگی کے حالات کا بھی پتہ چلتا ہے، آپ جس طرح فن سخن وشعر میں مہارت رکھتے تھے اسی طرح وقائع نگاری کے انداز کو بھی خوب جانتے تھے۔آپ نے اپنے سفر کے دوران پیش آنے والے تمام واقعات کو بڑی حسن وخوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، یہ سفر دو سال و چھ روز میں مکمل ہوا

تھا۔نواب صاحب نے اپنا سفرحج دہلی سے خشکی کے راستے ہوکر ممبئی تک اور پھر ممبئی سے لے کر مکہ و مدینہ تک بحری راستے سے طئے کیا تھا۔

نواب مصطفیٰ خان سفرنامے کا آغاز خدائے تعالی کی حمد وثناء سے یوں کرتے ہیں:

بنام خدای که جان آفرید چه یك جان که هر دو جهان آفرید
جهان را به آدم گرامی کنی روان را به ادراك نامی کنی [۴]

اس کے بعد حضور سرور کائنات، رسول اکرم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعتیہ اشعار پیش کئے ہیں، پھر سفرنامہ لکھنے کا سبب بیان کرتے ہیں، اس کے نام کے بارے میں بتاتے ہیں کہ، ''این رساله موسوم به 'ره آورد'' شد و سخن درین شگرف نامه در سه گفتار گفته آید'':

(۱) گفتار اول:۔ در ذکر حقایقی که از روز روانگی از شاه جهان آباد تا رسیدن ممبئی در پیش آمد۔

(۲) گفتار دوم:۔ مشتمل بر سخنهای متعدده۔

(۳) گفتار سوم:۔ در ذکر روانه شدن از ممبئی تا رسیدن به شاهجهان آباد۔ [۵]

نواب صاحب نے اپنے سفرحج کا آغاز ۱۲۵۴ھ میں کیا تھا۔جسکے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''به نیروی ایزدی تائید به تاریخ سعید، دو شنبه هفتدهم ذی الحجه سال هزار و دویست و پنجاه و چهار، آخر به آهنگ کسب سعادت زیارت حرمین شریفین زادهما الله شرفاً و تعظیماً از دارالخلافه شاه جهان آباد نقل و حرکت اتفاق افتاد۔'' [۶]

تقریباً دوسال کی مدت کے بعد یعنی ۱۲۵۶ھ میں نواب صاحب حج کی سعادت سے سرفراز ہوکر وطن واپس آئے:

''بتاریخ بست و سیوم ذی الحجه هزار و دویست و پنجاه و شش بود، فوز زیارت حضرت سلطان المشایخ چاشت گاه وارد شهرمینو بهر شاه جهان آباد شدیم و الحمد الله علی السلامه.....تمام مدت سفر دو سال و شش روز است'' [۷]

سفرنامہ کا اختتام اس عبارت پر ہوتا ہے:

نگارندۂ این مبارک نامه به محمد موسوم به مصطفی معروف حسرتی در فارسی و شیفته در ریخته متخلص است اصحاب تصانیف و ارباب تالیف نام در اول آرند و من در آخر آوردم[۸]:

نواب صاحب کے اس سفرنامۂ حج یعنی ترغیب السالک کے پانچ قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود ہیں جنکی اطلاعات ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

(۱) ترغیب السالک (بنام رہ آورد)، حبیب گنج کلکشن نمبر- ۳۵/۵ فارسیہ سفرنامہ، خط نستعلیق، تعداد اوراق ۱۱۶، سطر ۱۵، نسخہ صاف ستھرا لکھا ہوا ہے کہیں سے بھی بوسیدہ نظر نہیں آتا ہے۔

(۲) ترغیب السالک: یونیورسٹی کلکشن نمبر-۱/۸۷، فارسی مذہب وتصوف، تعداد اوراق ۱۲۷، خط نستعلیق۔

(۳) ترغیب السالک: یونیورسٹی کلکشن نمبر- ۲/۸۷، فارسی مذہب وتصوف، تعداد اوراق ۱۲۷، خط نستعلیق۔

(۴) مخطوطہ سفرنامۂ حجاز: شیفتہ کلکشن، نمبر- ۲۔۱۳۴۔۱۰۲ فارسیہ، تعداد اوراق ۱۰، خط نستعلیق، ناقص الطرفین ہے۔

(۵) مخطوطہ ترغیب السالک (مسودہ): شیفتہ کلکشن، نمبر- ۱۲۷/۹۵، تعداد اوراق ۱۲۲، نسخہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جگہ جگہ کاٹ چھانٹ کی گئی ہے، کسی کسی ورق کو بہت زیادہ پیچیدہ کرکے لکھا گیا ہے۔ سفرنامہ کے مبیضہ نسخے میں تینوں حصے موجود ہیں البتہ اس مسودہ میں پہلا حصہ موجود نہیں ہے، نسخہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

" چون عرض اصلی از ترتیب این رساله و مطلب کلی از تهذیب این عجاله نفع حجاج است۔ بنا بر این ناگزیر است پارۂ بیان مناسك نیز پس دریں فصل لختی سخن به بط رود و چرا نرود گویا این فصل مقصود است ...."[۹]

سفرنامہ ترغیب السالک ۱۲۸۳ھ میں مطبع مصطفائی دہلی سے شائع ہو چکا ہے، اسکے علاوہ 'سید زین العابدین' نے 'سراج منیر' کے نام سے اس کا اردو زبان میں ترجمہ بھی ۱۹۱۰ء میں کیا ہے۔

مخطوطہ نثر حسرتی: شیفتہ کلکشن، نمبر- ۱۱۹۔۱۵۳۔۲، تعداد اوراق صرف ۶، سطر ۱۱ ہیں، نواب مصطفیٰ خان حسرتؔی کا لکھا ہوا یہ مختصر سا مخطوطہ ہے جس میں نواب صاحب کے پانچ مکتوبات شامل ہیں، مخطوطہ میں موجود مکتوبات اور مطبوعہ مکتوبات کے موازنہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مکتوبات کی ترتیب اور عبارت میں کافی حد تک تضاد ہے۔ نسخہ میں نواب صاحب کے پانچ مکتوبات شامل ہیں جس میں چار مکتوب نواب عبداللہ صاحب کو اور ایک حکیم مومن خان مومن کو ارسال کیا

تھا۔اس نسخہ کی ترتیب کے لحاظ سے مومن خان کو لکھا ہوا مکتوب پہلے شامل کیا گیا ہے جبکہ مطبوعہ مکتوبات میں مومن خان کو لکھا ہوا مکتوب ساتویں نمبر پر درج ہے۔نسخہ کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے:

" نفس اماره که هر نفس عشوه دیگر در کار این ره زدهٔ خیالات دژم و فریفتهٔ نیرنگیهای وساوس نژند میکند نه آغازش را غایتی در پیش است و نه بدایتش را نهایتی از پس لب مقصود جام یزدان فرامشی پیمودن است و داروی بیهشی در کام کردن.....[10]

نسخہ کا اختتام ان اشعار سے ہوتا ہے:

مرحبا، ای چمن طراز امید — که گل مدعا فرستادی
نای ناهید و نغمهٔ داؤد — بر اهل غزا فرستادی[11]

تذکرہ گلشن بی خار نواب مصطفیٰ خاں نے اپنے عہد کے اردو شعراء کا فارسی زبان میں تذکرہ لکھ کر اس زمانے میں فارسی کی ارزش و اہمیت کا مکمل ثبوت دیا ہے۔ یہ تذکرہ شعرائے اردو کا ہے جنکے احوال فارسی زبان میں پیش کئے گئے ہیں، نواب صاحب نے یہ تذکرہ چھپنے سے قبل مرزا غالب کو دیکھنے کے لئے بھیجا تھا جس کو غور سے پڑھنے کے بعد مرزا نے نواب صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس کے چند جملے ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں:

" تذکره ترتیب یافته و مجموعه فراهم آمده که پیش طاق بلند نامی را نقش و نگار است و نحال نکو سرانجامی را برگ و بار۔"

مولانا آزاد لائبریری میں تذکرہ گلشن بی خار کے دو قلمی نسخے موجود ہیں جن کی اطلاعات ذیل میں درج کی جا رہی ہیں:

(۱) گلشن بی خار، ناقص الآخر، شیفتہ کلکشن نمبر ۱۸۶۔۱۵۰ فارسیہ، نسخہ صاف ستھرا نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے، تعداد اوراق ۸۰ ہے اور ہر ورق پر زیادہ تر ۱۱ سطریں ہیں۔

(۲) گلشن بی خار، یونیورسٹی کلکشن، نمبر ۲۵، ضمیمہ تذکرہ فارسیہ، یہ نسخہ بھی صاف لکھا ہوا ہے، خط نستعلیق، تعداد اوراق ۱۱۶ ہے۔

تذکرہ گلشن بیخار اب تک کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔سب سے پہلے نواب صاحب کی حیات میں ہی ۱۸۳۷ء میں مطبع لیتھوگریفک، دہلی، دوسری مرتبہ ۱۸۴۳ء میں اردو اخبار پریس، دہلی، تیسری مرتبہ ۱۸۷۴ء میں منشی نول کشور پریس،

لکھنؤ سے شائع ہوا۔اس کے بعد ۱۹۸۲ء میں نول کشور کے اسی نسخہ کی عکسی کاپی شائع کی گئی۔اس کا ایک نسخہ رام پور رضا لائبریری میں موجود ہے جس کا اردو ترجمہ حمیدہ خاتون نے قومی کونسل برای فروغ اردو کے تعاون سے شائع کیا۔

مخطوطہ غزلیات حسرتی: نواب مصطفیٰ خان ایک اعلی انشاء پرداز کے ساتھ ساتھ نہایت عمدہ شاعر بھی تھے۔آپ نے فارسی و اردو زبانوں میں بہترین شعر گوئی کا یکساں ثبوت دیا ہے۔آپ کا کلام تصوف،حکمت، پند ونصیحت، اخلاق اور محبت کے اعلیٰ جذبات سے بھرا ہوا ہے۔نواب صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ صوفیانہ خیالات وعقائد سے بھرا ہوا ہے عاشقانہ اشعار جو غزل کی اصل بنیاد ہیں ان میں بھی اکثر تصوف کا پہلو نمایاں ہے۔مولانا آزاد لائبریری میں آپ کے ''دیوان فارسی غزلیات'' کے نام سے بہت مختصر سا ایک نامکمل مخطوطہ موجود ہے،جسکے اوراق کی تعداد صرف سات ہے۔دیوان غزلیات کا کیٹلاگ نمبر ۱۳۴، یونیورسٹی کلکشن (فارسیہ نظم) ہے،نسخہ کرم خوردہ لیکن مایقراء، خط نستعلیق ہے۔نسخہ کو بغور دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسکے پہلے صفحہ پر موجودہ کلام شاید حسرتی کا نہیں ہے۔اسکے بعد انکی غزلیات کا حرف 'ص' کی ردیف سے آغاز ہوتا ہے۔اس مخطوطہ اور حسرتی کے مطبوعہ کلام سے موازنہ کرنے سے اشعار میں کم وبیشی بھی نظر آتی ہے۔ نسخے کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے:

به هم رنگ هرگز مرکب نبوده سیاهی و شنجرف و در هیچ مجمر
همانا دل اهل سود است پر خون بجائی سوید آورد دود عنبر [۱۲]

اس نسخے میں کلام حسرتی کا آغاز ان اشعار کے ذریعہ ہوتا ہے:

اگر عشق است بی باکانه می رقص بشوق کعبه در بتخانه می رقص
برسم مل حریفان را برقص آر برنگ بوئی گل مستانه می رقص [۱۳]

خاتمہ:

چه بلا شوخ مزاحم که شب و وصل عدو
به تجاهل در کاشانهٔ دلدار زنم
حسرتیؔ سوختم از شرم توکان چه می گفت
باده درصحبت رندان هو شگار زنم [۱۴]

نواب مصطفیٰ خاں حسرتیؔ نے کس قدر قیمتی گوہر اپنی یادگار چھوڑے ہیں جن کے ذریعہ سے انیسویں صدی میں فارسی زبان وادب کے خزانے میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔نواب کے زمانے سے لیکر موجودہ وقت تک آپ کی فارسی نگارشات پر تمام اہل علم وذوق نے بھرپور طبع آزمائی کی ہے آپ کی زیادہ تر تخلیقات زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔حکیم

مومن خان مومن کے ان اشعار کے ذریعہ سے نواب صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے مقالے کا یہیں پر اختتام کرتا ہوں:

آن شیفتہ کز خرد گرامی باشد
سرخیل سخنوران نامی باشد.
اکنون کہ جسد نماند الا بعدم
محمود ثنایی و نظامی باشد [۱۵]

حواشی:

۱. کلیات شیفتہ وحسرتی، نظام الدین حسین نظامی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۱۶ء
۲. کلیات شیفتہ وحسرتی، نظام الدین حسین نظامی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۱۶ء، صفحہ ۳۶.
۳. کلیات شیفتہ وحسرتی، نظام الدین حسین نظامی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۱۶ء، صفحہ ۵۸.
۴. مخطوطہ ترغیب السالک، نواب مصطفیٰ خان، یونیورسٹی کلکشن نمبر-۱/۸۷، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ق-۱.
۵. ایضاً، ق-۵.
۶. ایضاً، ق-۵-ب.
۷. ایضاً، ق-۱۲۴-ب.
۸. ایضاً، ق-۱۲۷.
۹. مخطوطہ ترغیب السالک (مسودہ)، نواب مصطفیٰ خان، شیفتہ کلکشن، نمبر-۱۲۷/۹۵، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ق-۱.
۱۰. مخطوطہ نثر حسرتی، نواب مصطفیٰ خان، شیفتہ کلکشن، نمبر-۲/۱۵۳/۱۱۹، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ق-۱.
۱۱. ایضاً، ق-۶.
۱۲. مخطوطہ غزلیات حسرتی، نواب مصطفیٰ خان، یونیورسٹی کلکشن (فارسیہ نظم) نمبر ۱۳۴، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ق-۱.
۱۳. ایضاً، ق-۱-ب.
۱۴. ایضاً، ق-۷-ب.

☆☆☆

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی
صدر شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مولانا اسلم جیراجپوری کی گرانمایہ تصنیف ''حیات حافظ''

مولانا اسلم جیراجپوری جامع الکمالات تھے عربی، فارسی اور اردو میں انھیں ید طولی حاصل تھا وہ بیک وقت محقق ،مورخ، ادیب، شاعر، اور نقاد سبھی کچھ تھے۔ان کی تنقید باسرار خودی، جاوید نامہ، مخزن الاسرار، اور تصانیف حیات جامی و حیات حافظ تحقیقی وتنقیدی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے اسلم جیراجپوری نے جب بھی کوئی موضوع منتخب کیا تو اس پر بہت ہی محققانہ اور نقادانہ نظر ڈالی۔ اور ہر پہلو سے واقفیت حاصل کی۔ان کا یہ تنقیدی ذہن زیادہ تر ذوقِ شعری میں اجاگر ہوا۔ سب سے پہلے مولانا اسلم جیراجپوری نے فارسی دنیا کے مشہور شاعر حافظ شہرازی کو منتخب کیا یعنی حافظ کی پہلی پسند حافظ ہی ٹھہرے اور دونوں کے سینے قرآنی آیات سے منوّر تھے یعنی حیاتِ حافظ اس شخص نے لکھی وصرف حافظ ہی نہیں بلکہ جیّد عالم بھی تھا گویا صحرائے ادب کا بادیہ پیما یکا یک شیراز میں گلگشت مصلیٰ اور سیر گنابادکو نکل پڑتا ہے۔ اور شیراز پہنچنے پر اسکی کیفیات کو ڈاکٹر شعیب اعظمی صاحب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> حافظ شیراز جیسا زندہ دل، پیر مالہ میزبان پا کر وہ پے بہ پے جان لنڈھانا چاہتا ہے۔ دوست و احباب اسکی زبان سے نعرہ لبیک سننے کے منتظر ہیں مگر اب ان کے منھ سے ''بات الصبوح'' کا شور سن کر ملامت پر آمادہ ہیں۔ فارسی شاعری کا یہ شیدائی کلام حافظ پر سر دھننے والا اسکی زندگی کے حالات اور کارناموں پر روشنی ڈالتا ہے اور اسکے اشعار کی خوبیوں، اثرات اور مقبولیت کے اسباب بیان کر سکتی اور اثر آفرینی کے وہ پہلو روشن کرتا ہے جو صدیوں سے ہدف ملامت ہے''۔
>
> (حیات حافظ، اسلام جیراجپوری، مکتبہ جامعہ دہلی، صفحہ ۱۲۴)

حیات حافظ مولانا اسلم صاحب نے ۱۹۰۹ء میں مکمل کی جب وہ علیگڑھ میں ملازم تھے اس کتاب میں انہوں

نے خواجہ حافظ شیرازی کے زندگی کے حالات کے ساتھ انکی شاعری پر بھی مفصل تبصرہ لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے حافظ کے سیکڑوں اشعار درج کئے ہیں جن سے ان کی زندگی کے حالات مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے پھر انھیں اشعار کے سہارے ان کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا ہے مولانا اسلم جیراجپوری نے اس کتاب میں حافظ کے ایسے بہت سے نایاب اشعار درج کئے ہیں جو دیگر کسی مصنّفین کے نسخوں میں نہیں ملتے۔ ۱۹۰۸ء میں مولانا ایک تصنیف "بیت اللہ" نام سے کرنا چاہ رہے تھے لیکن اس تصنیف کے بیابان میں قدم رکھتے ہی صحت خراب ہوگئی اور جب طبیعت ٹھیک ہوئی تو انہوں نے اس بیابان میں قدم رکھنے کے بجائے حافظ شیرازی کی شاعری کا باغ دیکھنا چاہا اور اس دلفریب دلکش اور پر فضا باغ نے انکے جزبۂ ذوق کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کشش کے متعلق وہ خود رقمطراز ہیں:

''اب بجائے اسکے کہ کعبہ کا مسافر عرب کی صحرا نوردی کرتا، شیراز کے گشت مصلیٰ اور آب رکناباد کی تفریح میں مشغول ہوگیا خوش قسمتی سے حافظ جیسا زندہ دل اور پر مایہ میزبان ملا جسکی غزل کی دو آشتہ شراب کے جام پیالے لینے شروع کئے اور مزے لے لے کر کہنے لگا!

بده ساقی مئی باقی که در جنت نه خواهی بافت

کنار آب رکناباد و گل گشت مصلیٰ!

آخر تین دن کے بجائے تین مہینے اس مہربان میزبان کے باغ میں نہایت لطف کے ساتھ گزارے۔ اسی آثناء میں دوستوں کیلئے بھی اس میں سے ایک گلدستہ تیار کیا جسکو اس ناچیز تصنیف کی شکل میں پیش کرتا ہوں۔ (حیات حافظ، صفحہ ۱۳)

حیات حافظ کا سب سے پہلا عنوان ''نام ونسب اور تعلیم'' ہے اس میں مولانا اسلم صاحب نے حافظ کے نام ونسب اور تعلیم کے متعلق بڑی ہی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس پر بڑی ہی مدلل اور مفصل بحث کی کہ حافظ کا تخلص صرف حافظ تھا یا حافظِ قرآن بھی تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خواجہ کا محض تخلص ہی حافظ تھا اور وہ دراصل حافظِ قرآن نہ تھے لیکن مولانا نے ایک طویل بحث اور شعروں کی شہادت کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ خواجہ صرف تخلص کے لئے استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ وہ حافظِ قرآن تھے۔ انہوں نے پہلے قرآن حفظ کیا اور حافظ کہے جانے لگے وہ لفظ ان کو اتنا پسند آیا کہ یہی انہوں نے اپنا تخلص بھی رکھا۔ حافظ شیرازی کے دیوان میں جا بجا ایسے بہت سے اشعار موجود ہیں جن سے ان کے حافظِ

قرآن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

وہ صرف حافظ ہی نہیں تھے بلکہ تمام قرأتوں پر ان کو ناز تھا۔ اور ان سے بخوبی واقف بھی تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں!

عشق رسد بفریاد و زحودبستاں حافظ

قرآن زبر بخوانی بر چاردہ روایت

(حیات حافظ صفحہ ۱۴)

بعد تحقیق کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ حافظِ قرآن تھے اور حافظ ہی ان تخلص تھا۔ خواجہ کا لقب شمس الدین، نام محمد تھا۔ ان کے آباء واجداد مقامِ سرکان کے باشندہ تھے۔ ان کے والد کا نام کمال الدین تھا۔ جو شہر نہاوند کے قریب ہے۔ ان کے دادشیراز میں آئے اور سکونت اختیار کر لی چونکہ ان کے والد کا نام کمال الدین تھا جو علماء اور اہلِ کمال میں شمار کئے جاتے تھے اور اپنی آبائی تجارت کی وجہ سے دولت مند تھے۔ حافظ شیرازی کے زمانہ میں تاتاری خاندان کا آخری بادشاہ ابوسعید خان بغداد کے تخت پر رونق افروز تھا وہ بڑا ہی عادل، پرہیزگار اور علم پرست تھا۔ اس کے زمانے میں شیراز کے مردم خیز خطے میں جہاں ہمیشہ بڑے بڑے علماء فضلاء پیدا ہوتے چلے آئے تھے۔ ایک جماعت ایسے اہلِ کمال کی موجود تھی جس کی نظیر اس دنیا میں مشکل سے ملتی ہے۔ حافظ نے انہیں اہلِ کمال بزرگوں کا فیض حاصل کیا۔ اسی وجہ سے ان کے اندر علم مذاق پیدا ہو گیا۔ اور ان کی استعداد اور لیاقت کا شہرہ ہونے لگا۔ حاجی قوام الدین حسن نے جو شاہ ابو اسحٰق والیٔ شیراز کے وزیر اور بڑے علم دوست تھے۔ حافظ کی استعداد کو دیکھ کے ان کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تاکہ وہ فقہ اور تفسیر کا درس دیں۔ (حیات حافظ صفحہ ۱۵)

مولانا اسلم صاحب خواجہ حافظ کی ولادت تعلیم ابتداء شاعری اور عہد و ماحول پر تحقیق وتبصرہ کے بعد انکی شہری کی جانب قدم بڑھاتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جو حافظ کو سب سے افضل اور یگانہ روزگار بناتی ہے اسکے متعلق لکھتے ہیں۔

''وہ گزشتہ زمانے میں اکثر اہل کمال کی شہرت انکے مرنے کے بعد ہوتی ہے لیکن خواجہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کی شہرت زندگی میں چاروں دانگ عالم میں پھیل گئی۔ نہ صرف

ایران بلکہ عراق و بغداد جنوبی ہندوستان اور بنگال تک ان کی زندگی ہی میں انکا نام مشہور ہو چکا تھا ۔ قافلوں کے ساتھ ان کی غزلیں ملکوں ملکوں جاتی تھیں ۔ بڑے بڑے بادشاہوں اور نوابوں نے ان کو بلانا شروع کیا اور انکے پاس تحفے تحائف اور اشتیاق نامے بھیجتے تھے لیکن خواجہ اپنی سید چشمی اور گوشہ نشینی کیوجہ سے کہیں جانا پسند نہیں کرتے تھے'' (میگزین شبلی کالج ۲۰۰۰ء صفحہ۹۹)

خواجہ اگر چہ بہت بڑے عالم فقیہ صالح اور زاہد تھے اران کا تمام وقت علمی مشغلوں اور عبادت دریافت میں صرف ہوتا تھا مگر باوجود اسکے انکے طبیعت اور فطرت میں بے نظیر شاعرانہ طاقت و دیعت رکھی تھی جوان کی شاعری کا ضمیر تھا اسکے ساتھ ہی اس زمانہ میں شاعرانہ مذاق فارس کی آب وہوا میں رچا ہوا تھا اور شیراز علماء وشعراء کا مرکز بنا ہوا تھا حافظ کی فطری صلاحیت اور شیراز کی شعری زمین نے ہی انہیں اور انکی غزلوں کو ممتاز کیا ہے۔

سلطان غیاث الدین والئ بنگالہ جو علم کا بڑا قدرداں تھا اور نہایت فیاض تھا اور اس نے اپنے ایک خاص خادم یاقوت کے ہاتھ کچھ زرِنقد اور تحفے خواجہ کے پاس بھیجے اور خواہش کی کہ وہ بنگال تشریف لائیں خواجہ سفر سے پہلے توبہ کر چکے تھے معذرت کی اور یہ غزل لکھ کر یاقوت کو دے دی۔

ساقی حدیث سردو گل ولالہ میرور دیں بحث باثلاثہ غسالہ میرور
می وہ کہ نوعروس چمن حد حسن یافت کارایں زمان بہ صنعت دلالہ میرود
آں چشم جاودانۂ عابد فریب بیس کش کارواں سحر زدنبالہ میرور
حافظ نہ شوق مجلس سلطان غیاث الدین خامش مشو کہ کار تواز نالہ میرور

حیات حافظ میں اسلم صاحب نے حافظ کے ذاتی حالات اور حب الوطنی کے جزبہ کو اجاگر کیا ہے انکے ذاتی حالات کے متعلق لکھتے ہیں!

''خواجہ کی زندگی درویشانہ اور فقیرانہ زندگی تھی انکے تمام اوقات علمی مشاغل، عبادت ریاضت میں صرف ہوتے تھے۔ سید چشمی اور فیاضی جو بزرگوں کا خاصہ ہے ان میں بدرجہ کمال موجود تھی اور دنیاوی جاہ ومال کی خواہش سے انکا رتبہ بہت بلند تھا ان کی تمام آمدنی فقیرانہ اور درویشانہ کیلئے وقف تھی اور بیگانہ اور آشنا سب کے لئے انکا دروازہ کھلا رہتا تھا''

(میگزین شبلی کالج، ۲۰۰۰ء صفحہ۱۰۲)

حافظ شیرازی مجذوب صوفی یا آزاد مجرد نہیں تھے۔ انہوں نے شادی کی تھی اور انکے بیٹے بھی تھے ان کی روزی بادشاہوں اور امراء کے دربار سے وابستہ نہیں تھی بلکہ وہ مدرسہ میں تعلیم دیتے تھے اور اسی حلال رزق سے گذر بسر کرتے تھے انکی ایک بہن چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر انتقال کر گئی تھی ان کی پرورش حافظ ہی کے ذمہ تھی۔ حافظ کا ایک بیٹا بھی نوعمری کے زمانے میں انتقال کر گیا تھا انہوں نے اس کے غم میں ایک پر درد غزل کہی تھی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پلیلی خون دلی خورد و گلی حاصل کرد　　باد غیرت بصدش خار پریشا ں دل کرد

طوطی رابخیال شکری دل خوش بود　　ناگہش سیل فنا نقش امل باطل کرد

آہ فریاد کہ ازچشم حسودمہ چرخ　　درلحد ماکمال ابروئی من منزل کرد

خواجہ کی اہلیہ نہایت حسین وجمیل تھیں اور عین شباب ہی کے زمانے میں انتقال کر گئیں۔ خواجہ کو ان کی موت سے ایسا صدمہ ہوا کہ پھر دوسرا نکاح نہیں کیا۔ اہلیہ کی موت پر ایک پر درد غزل لکھی۔

آں یاز کز وخانۂ ما جائی پیری بود　　سرتاقدش چون پیری ازعیب بری بود

ازچنك منش اختر بدمہر و بدر بود　　آری چہ کنم دولت دور قمری بود

حافظ شیرازی کے بیٹے کا نام نعمان تھا وہ ہندوستان آئے تھے۔ برہان پور میں قلعہ اسیر کے قریب انکی قبر ہے''۔ (حیات حافظ صفحہ ۲۴)

وطن کی محبت کا جذبہ اکثر و بیشتر لوگوں میں ہوتا ہے لیکن شعراء کے اندر جن احساس عام لوگوں سے زیادہ تیز اور لطیف ہوتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جذبہ پایا جاتا ہے کہ خواجہ حافظ کے جس طرح تمام شاعرانہ جذبات نہایت بلند تھے اسی طرح حب الوطنی کا جذبہ بھی ان میں بہت بلند تھا۔ خواجہ کا وطن شیراز ویسے ہی بہت خصوصیات کا حامل ہے۔ اور اسکی وصف دوسرے ممالک کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ شیراز صدیوں تک شاہان فارس کا پایا تخت رہا جسکی خاک سے ہزاروں نامور علماء اور فضلاء اور اہل کمال پیدا ہوئے جن کے کارنامے جاوید نامے بنکر آج بھی زندہ اور تابندہ ہیں۔ شیراز کا موسم بھی بہت خوشگوار ہوتا ہے زیادہ تر شعراء نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں۔ شیخ سعدی نے

بھی شیراز اور شیراز کے باشندوں کی تعریف کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیراز کو ہر دلفریز بنانے والے وہی چند اشعار ہیں جو حافظ نے اس کی تعریف میں لکھے ہیں۔ سعدی کہتے ہیں:

دست از دانم نمی دارد خاك شیراز و آب رکنا باد

حافظ شیرازی فرماتے ہیں!

نمی دهند اجازت مرا بسیر و سفر نسیم باد مصلا و آب رکنابا د

خواجہ حافظ شیرازی کے متعلق مولانا اسلم صاحب لکھتے ہیں۔

''تقریباً ۷۶ سال کی عمر میں عشاء کے وقت دوشنبہ کے دن ۷ ذی الحجہ ۷۹۱ھ کو خواجہ نے شیراز ہی میں وفات پائی جنازے پر خلقت خدا کا ہجوم تھا شہر کے تمام امراء ورؤساء حتی کی منصور بن مظفر بادشاہِ وقت بھی شریک تھا۔ خواجہ کو چونکہ خاک مصلیٰ سے اپنی زندگی میں بہت الفت تھی اسی لئے لوگوں کی رائے ہوئی کہ اسی مقام میں انکو دفن کیا جائے۔

''قبر بلبل کی بنے گلزار میں''

چنانچہ ایک شمشاد کے درخت کے نیچے جسکو انہوں نے خود لگایا تھا دفن کئے گئے۔ لطف یہ ہے کہ ایک شاعر جسکا نام معلوم نہ ہوسکا اسکو نظم کر کے اس طرح قطع تاریخ بنا دیا:

چراغ اهل معنی خواجه حافظ

که شمع بودازنور تجلی

چوردر خاك مصلاساخت منزل

بجوتاریخش از خاك مصلی

(حیات حافظ صفحہ ۳۰)

خواجہ کا مزار جس خاکِ مصلّے کے حصے میں ہے وہ انہیں کے نام سے حافظیہ کہلاتا ہے۔ خواجہ کی قبر جیسا کہ خود انہوں نے کہا تھا۔

برسر تربتماچوں گزری همت خواه که زیارت گه رندان جهان خوابله بود''

(حیات حافظ صفحہ ۳۰)

حقیقت میں ان کی قبر ایک مشہور زیارت گاہ ہی بن گئی جہاں دور دور سے فقیر و درویش انکی قبر کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور حلقہ ورد میں ایک جام ان کے نام کا سپرد خاک کرتے ہیں۔ کریم خاں رند نے اپنے عہد حکومت میں باغ مصلی کو جس میں دکنی ہنر جاری ہے درست کرایا اور وہاں درویشوں کے رہنے کے لئے ایک خانقاہ بھی بنوائی۔ تربت پر سنگ مرمر کا ایک خوبصورت تختہ لگوا کر نہایت خوشنما نستعلیق خط میں یہ غزل کندہ کرائی۔

مشـرده وصل تو کو کز مر جان بر خیزم	طـائـر قد سم و ازدام جـهـان بـر خیـزم
یـارب ازا بـر هـدایـت بـرسـان بـارانی	بیشتر زانکه چون گردی زمیان برخیزم
بـولائـی تـوکـه گـر بنده خویشم خوانی	از سر خـواجـگـی کـون مـکان برخیزم
بـرسـر تـربـت مـئـی بـائ مطرب بنیـش	تـا مـه بویت نه لحد رقص کنان برخیزم

حافظ شیرازی کے کلام میں دوسرے شعراء کے کلام خلط ملط ہیں جنہیں اسلم جیراجپوری صاحب نے بعد تحقیق کے حافظ کے بہت سے اشعار کو حافظ کا شعر ماننے سے انکار کیا۔ بہت سے ایسے اشعار جو حافظ کے تھے دوسرے شعراء سے منسوب ہوگئے۔ انہوں نے ایک طویل فہرست پیش کی جس سے یہ واضح ہوا کہ حافظ کے کلام کی اشاعت کب اور کہاں کہاں سے ہوئی۔ ان میں کتنے اشعار تھے اور کس نسخہ سے ہوئی انکی فہرست بھی پیش کی ہے۔ حافظ کی غزلیات کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی تقریبا تمام غزلیں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئیں سترہویں صدی کی ابتداء سے خواجہ کی بعض بعض غزلوں کے ترجمے یورپ کے مختلف زبانوں میں نظم ونثر میں ہوئے اور لوگوں نے بہت پسند کیا اٹھارہویں صدی عیسوی کے ولیم اوسلی اور دان همبر وغیرہ نے جرمن اور انگریزی زبانوں میں دیوان کے جرمن اور انگریزی ترجمے شائع کئے۔ ''ولیم جونس'' نے کئی غزلوں کے مضامین لیکر انگریزی میں گیت بنادیا۔ جن میں سے ''اگر آں ترک شیرازی'' کا گیت بہت ہی مقبول ہوا اور اسی گیت سے یورپ کو حافظ شیرازی کے کلام سے بہت دلچسپی پیدا ہوئی۔ اوران کے پورے دیوان میں پوربی زبان میں شائع ہوئے اور مختصر تبصرہ بھی ان کے دیوان پر ہوئے خواجہ کے کلام کی مقبولیت کے بارے میں اسلم صاحب لکھتے ہیں۔

''خواجہ کی غزلیں جس ذوق وشوق کیساتھ جنوبی ہند میں گائی جاتی ہیں۔ اسی ذوق وشوق کیساتھ

ترکستان کے میدانوں میں انکا راگ گونجتا ہے اور جس طرح دریائے ''ڈینوب'' کی (جگہوں) موجوں سے اسکے راگ ٹکرائے ہیں گو خواجہ کو گزرے ہوئے آج پانچ سو سال سے زیادہ ہو گئے لیکن ان کی غزلیں اب تک ویسی ہی دلکش نور دلفریب ہیں جیسی پہلے تھیں اور اتنی صدیاں گزرنے پر بھی انکی مقبولیت کی نوجوانی پر کسی قسم کا بڑھاپا نہیں چھایا کیونکہ ان کی بنیاد فطرتی جذبات پر ہے یعنی ان جذبات پر جو ہر قوم پر ہر ملک پر اور ہر طبقے کے آدمیوں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ اسلئے اس کی ہر دلفریزی اسوقت تک فرق نہیں آسکتا جب تک کہ انسان کی فطرت نہ بدل جائے''۔ (حیات حافظ صفحہ ۳۸)

حافظ شیرازی کی شاعری اس قدر مقبول عام وخاص ہوئی کہ ان کے ہم عمر اور ان کے بعد کے تمام شعراء نے انکی پیروی کرنے کی کوشش کی جن میں فارس کے شعراء کا گروہ سب سے پیش پیش تھا۔ فارس کے شعراء نے حافظ کے راستہ میں خلوص اور عقیدت مندی کا فرش بچھایا وران پر مدح وثنا کے پھول برسائے اور اعزاز اور احترام کے صدر پر بیٹھایا اور ان کی پرستش شروع کی۔ ان کی روش اختیار کرنے کی کوشش کی اور انہیں کے قدم بہ قدم چلنا شروع کیا۔ بابا فغانی، صائب، نظیری، عربی اور تمام شعراء جوان کے بعد کے ہیں ان کے دواوین کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک نے اپنے پیش نظر حافظ ہی کو رکھا اور اسکی تقلید کی۔ حافظ شیرازی اتنی مقبولیت کے باوجود اس زمانے میں ان پر کوئی معتبر اور مفصل تصنیف نہیں تھی مولانا اسلم جیراجپوری صاحب نے ان کی حیات وشاعری پر محققانہ تنقید کرتے ہوئے اس تشنگی کو دور کو دور کیا۔ اور حیات حافظ کی تحریر کی، جس سے حافظ کی شخصیت بھی عیاں ہوئی اور فارسی ادب میں ایک گراں مایہ اضافہ بھی ہوا۔

☆☆☆

ISSN: 2394-5567 **S. No. 21**

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر
(فردوسی)

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quarterly Literary Research Journal for Persian Literature)

VOLUME: VIII ISSUE: I - IV

JANUARY - DECEMBER 2021

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:

Dabeer Hasan Memorial Library

12, Choudhri Mohalla, Kakori,Lucknow,

U.P.-226101 (INDIA)

Email: dabeerpersian@rediffmail.com

Mob. No. 09410478973

Review Committee

Prof. Azarmi Dukht Safavi, Aligarh

Prof. Shareef Hussain Qasmi, Delhi

Prof. Masood Anwar Alvi Kakorvi, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin Kakorvi, Lucknow

Prof. Tahira Waheed Abbasi, Bhopal

Prof. Mazhar Asif, New Delhi

Editorial Board

Prof. Syed Hasan Abbas, HOD Persian, BHU, Varanasi

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, Director IPR, AMU, Aligarh

Prof. Aleem Ashraf Khan, Department of Persian, DU, Delhi

Prof. Syed Mohammad Asghar, Deptt. Of Persian, AMU

Pro. Shahid Naukhez Azmi, Department of Persian, MANUU, Hyderabad

Dr. Mohammad Aquil, Department of Persian, BHU, Varanasi

Dr. Md. Ehteshamuddin, Institute of Persian Research, AMU, Aligarh

Dr. Iftikhar Ahmad, HOD Persian, Maulana Azad College, Calcutta

Dr. Mohammad Qamar Alam, Aligarh Muslim University, Aligarh

Dr. Anjuman Bano Siddiqui, Deptt. Of Persian, Karamat College, Lucknow

Co-Editor

Dr. Mohammad Tauseef Khan Kaker

Assistant Professor, Department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh

Atifa Jamal

Research Scholar, Department of Persian, Lucknow University, Lucknow

DR.TAFIQUAR RAHMAN

Assistant Professor in Persian

Cotton University, Panbazar

CULTURAL SIGNIFICANCE OF ASSAMESE MUSLIMS AND THEIR ZIKIR AND ZARI: A LITERARY REVIEW

Abstract:- The Aim of this paper is to highlight the Culture of the people of Assam throughout the prestigious genre Zikir and Zari. The language of Zikir and Zari songs are very simple and direct through archaic for modern readers but addressed as it was intelligible to them, making a direct appeal to their hearts as do the Dahas of Kabir or Champions of Tulsidas etc. in Northern India during the middle age. Culture is the social behavior and norms found in human societies. This paper is an attempt to make an outline the significance of culture to any given society. It is important to note that the culture plays a very important role in shaping the exchange system of any social group. There is no universally acceptable meaning of the word of culture.

Key words: Gun-powder, Ethno-Culture, Culture of Assam, Tibet-Barman, Assimilation, Colony

Introduction

India has always been a land of great saints and free thinkers, which has been assimilating in its fold various cultures and thoughts from time to time. The culture of Assam is traditionally a hybrid one, developed due to cultural assimilation of different ethno-cultural groups under various politico-economic systems in different periods of history. The roots of Assamese culture go back almost two thousand years when the first cultural assimilation took place with Austro-Asiatic and Tibeto-Burman peoples as the major components. According to the epic Mahabharata and on the basis of local folk lore, these people probably lived in a strong kingdom in the era before Jesus Christ, which led to an early assimilation on a greater scale.

We learn from Minhajuddin that the Koch and the Mech people in the western part of Kamrupa displayed their admiration for the Muhammadanism as early as 1205-06 A.D., so much so that they rendered their sincerest help to Muhammad-ibn-Bakhtiyar, the first of the Muslim chiefs to enter the country after the Muslim conquest of India. Similarly, the Chutia king, Ratnadhwajapala's(1224-50 A.D) friendly relation with the sultan of Gauda in the middle of the thirteen century, the acceptance of Islam by the Khen King Chakradhwaja, by 1474 A.D, the use of the title 'Khan' by some Assamese Hindus of a high social status and the use of some words of Perso-Arabic origin by Assamese poets including Sankerdeva (1449-1568 A.D)clearly show that the Islamic culture gained its popularity at least in the western region of Kamrupa even before the time of the conquest of Sultan Hussain Shah in 1502 A.D. The annexation of this region of the ancient Kamrupa kingdom to Gauda by Hussain Shah is an epoch-making event in the history of Assam-

Muslim relation, because this not only ensured the success of the repeated endeavors of the Muslim conquerors in the previous centuries to establish Muslim rule in Assam, but also brought the Ahom rulers of Assam into direct contact and clashes for the first time with the Muhammadans.

Generally speaking, in every sphere of life, a good number of Muslims were employed in government services. Though they have been employed in different departments including defense and civil appears to have grown sufficiently large, and this may perhaps mean that all of them were not freshly imported. Many of them were certainly from among the war prisoners and as they displayed their skill in certain types of work they were granted the same status as the indigenous people and were employed in government departments with other imported Muslim Artisans. Even today there is a large number of Assamese Muslims, who like other section of the people of the country, use the surnames, Barua, Hazarika, Saikia, Barbara Bora etc., which signify that their forefathers were holding these high offices in the Ahom Government. Displaying their true love for the land and a genuine spirit of the sacrifice for the cause of the country in the hour of its calamity created by Muhammadan invasions, most of them through their words and deeds proved to be the true patriots of Assam. The employment of Muslim settlers in the government services widened the scope for the increase of Perso-Arabic elements in Assamese culture. We have noted that quite a large number of Muslims were employed in the guilds of weavers, tailors and drapers, masons besides in the royal arsenals. This was undoubtedly a matchless contribution of the Muslims to the Ahom Military strength. The growing contact and conflict of the Ahoms with the Muhammedian necessitated their developing the culture of the Arabic and Persian language not only in the court towards and effective diplomatic relationship with the latter, but also in the Islamic religious centers to impart religious education to their Muslim subjects.

The most outstanding and sustaining contribution of the Assamese Muslims to the popular literature of Assamese are the Zikirs and Zaris. A Zikir is a religious or philosophical poem, centering on a point of faith or of philosophy. In several of the songs of this variety a story, centering on the life of Azan Pir or Shah Miran, to whom these songs are sometimes ascribed, is told. A Zari is an elegiac in character and content and may be called a form of Marshiya, and generally relates itself to the tragic tale of Karbala. Some of the Assamese Zaris may be called independent ballads giving the stories of Haider Ghazi. These compositions, particularly the Zikirs, in their subject matter resemble the Borgits or devotional songs of Sankerdeva and Madhevdeva. But unlike the Borgits in the literary Brajabali idiom, they are couched in colloquial homely Assamese, in their form and the expression they are in the line with Deh-bicharor geet, a variety of philosophical songs of the Assamese village minstrels and some other folk songs. The chief objective of the Zikirs appears to be the reorganization of the society of Assamese Muslims, by regenerating their faith and love for Islam in a such way that there will be no discord in their age-old harmonious relation with Hindu society, in which the great movement of social reform initiated by Sankerdeva seems to have attained its logical culmination.

Being deprived of the fertilizing effect of Muslim life of India for centuries by wars and conflicts, the Islamic faith and culture in Assam grew somewhat stale and therefore, in the seventeenth century, a few Muslim Pirs and Alims devoted themselves to its resuscitation. They seem to have tried to usher in a short of renaissance through songs and lyrics like the Zikirs. It was probably this underlying motivation that some of the Zikirs, while singing the glory of Allah and Islam in a high lyrical vein, often came down in part to the level of social satire. But it is interesting to note that they have been able to score success in

ensuring the harmonious relations between in Islam and Hinduism, particularly with the Vaishnavism preached by Sankerdeva. In fact, they seem to have been impressed by some aspects of the bhakti doctrines preached by this saints-poet. One of the Zikirs even goes so far as to express admiration for this sect of Hinduism, as follows:

Sankerdeur jeori madhavdebor buwari

Rahpur nagarat ghor

(She is the daughter of Sankerdeva and the daughter-in –law of Madhevdeva, and she dwells in the city of Rahpur or land of rasa,)

This song has a bearing on the esoteric Ratikhowa School of vaishnavas, who hold their services at night, similarly, referring to the relations of the Hindus and the Muslims, the zZkirs declare:

Hindu musalman eke allahar forman

Gorasthane kabar sari sari

Hinduk puribo mominok garibo

(Hindus and Muslims are bounded by the same set of the divine rules of Allah…..the act of cremating a Hindu and the entombing of a Mumin only signify one end death for all)

And

Ganga jamuna Allar kalmia namar

Nakare khati

(The Ganga and the Yumana sing only the songs of the glory of Allah)

Santa mahanta awliya sakale eketi namate khate

(The Sants and Mahaantas, that is, the Hindu holy men, and the Awliya also supplicate to one name, the name of God)

With all sincerity and emotion one of the Zikirs declares:

Mur monot aan bhab nai o allah

Mur monot nai aan vab

Hindu musalman ek allar forman

Akherat ek allar naam

(In my mind, oh Allah, I have no different thought, save that the Hindus and the Muslims are under one law, the will of Allah, and the final word of all services is Allah)

The Vaishnavism preached by Snakerdeva is also known as ‘nama-dharma’ because it gives utmost importance to ‘Sravana-kirtana’ or the listening to and reciting of the name

of god with intense love and devotion. An Assamese vaishnava regards it as the superb mode of worship. The Zikir also uphold this mode in the same vein:

Namahe parama dhan sura mur bhai

(Oh my brethren, listen, the name of god is the greatest of all treasures)

These two lines, in fact, echo two songs of Sankerdeva. Again:

Matharo pokalo chuli

Pamaru manaly e bujiba nuwari

Namehe sar katha buli

(My hair has grayed, yet my sinful mind understands not that praise of all the lord is the essence of all matter.)

Similarly, the following remark of Azan Pir, in of the Zikirs, against those who practice love and devotion to God only to win his mercy on the day of last judgment reveals how the path of Niskama Bhakti has been glorified in the Zikirs:

Makkar duwarot banda anek juguti

Jap mari par hole erile piriti

(In the portals of Mecca the devotee makes many a plan, but when he leaps across the last tangle, he set aside the love of God)

The Assamese Zikirs also seem to have brought in a similar conception. It is not possible to ascertain whether their authors were directly inspired by the conception of Ibn Sina, which is believed to have found an echo in the thoughts of Kabir, or whether they received such ideas from the doctrine preached by Sankerdeva. It may however, be presumed that they were inspired by the latter. In order to prove this contention the following illustration would be perhaps helpful. In one of the Borgeets Sankerdeva says:

Narayana lila janaba koi

Jata dekhu kaya suta vita jaya

Mayako sava dhandha

(Who can understand the divine sport of Narayana; all that you see-the body, children, wealth and wife- are vagaries of Maya)

The spirit of complete surrender as a servant to God and the earnest longing for His kindness as reward permeates through the Vaishnava literature of Assam. The Zikirs are also found to be completely imbued with such spirit. To cite only a few illustrations, the following lines from the Borgeets of Madhvdeba and Zikirs: Madhavdeba entreats:

Moke dekhiyo na kene ahe jagannath

Mai bar papera papi

(Why have you not turned to me, oh Jaganath,; I am the worst of all sinners)

The Zikirs appear to have been greatly influenced by such sentiments and expressions. Majnudil Fakir sings:

Dinar dayal swami bahu pape pape ami

Hriday maje karibaha daya

Guruji ai adhame tumar naam dake

(Oh lord thou art kind to the poor; and I am sinner with diverse sins; Withhold not thine love to me; Oh my master, this vile person called out Thy name)

Conclusion

However, the assimilation of culture without rectification of any boundary is a best way to promote a better society. The reference to Allah as '*niranjana*' or the comparison of the effect of the recitation of the name of God to pious ablutions in the Ganges, or to the value of the holy water of the Ganges are illustration of such endeavor on the part of these men of Islam of Assam. It was perhaps for such persistent endeavors on their part that many of the Zikirs look like attempts at a synthesis of Hindu and Islamic thoughts and ideals.

***

Reference Notes

1. Saikia. Dr. Mohini Kumar (1986): *Assam Muslim Relation And Its Cultural Significance*, Luit printers, Golaghat (Assam)
2. Malik, Syed Abdul (1956): *Zikir aru Zari, Introduction*
3. Hussain, Abid, : *National Culture of India*
4. *Sankerdeva and Chitra Bhagavata parichay(1953)*
5. Chand, Tara: *Influence of Islam on Indian Culture*
6. *Encyclopedia of Asian History*, (1988) Volume 1, Charles' Scribner's Sons, New York.
7. Syed Abdul(1958) Asamiya Zikir aru Zari Collection Of verses composed by Azan peer Gauhati University
8. N.N, Acharyya (1966) : *History of Medieval Assam*, Guwahati

DR. ZEENAT KAIFEE

Katihar, Bihar

HAZRAT AMEER KHUSRO DEHLAVI AND HIS CONTRIBUTION TO HINDAVI LITERATURE

Abstract:

Civilizational idea of India is that which enfolds differences and embraces people of diverse, caste, class, faith, ideology and ethnicity and also linguistic and cultural boundaries lying among them. Hazrat Ameer Khusro Dehlavi(1253-1325 AD)- variously spelt Khusro, Khusrou, Khusraw- was India's first Muslim musicologist and has become an iconic figure in the rich unique history of Indian culture and civilization. He is a representative of that melting crucible wherein we can find commingling of all those colors which is called Ganga- Yamuni Tehzeeb or composite culture of India. Ameer Khusro is today known as the mystic poet-musician par excellence. He is also venerated as a saint, with the suffix Hazrat (honorable) attached to his name. His annual 'urs' (death anniversary) is among the most popular of sufi religious celebrations in Indian sub-continent. Khusro was a pioneer of Indo-Persian literature and a great exponent of classical Indian music and through his literature and music devoted his entire life to bridge the gap between two predominant sections of Indian society ,Hindus and Muslims. Khusro is such a heritage of India whose works contribute to a strong cultural ties of Indian subcontinent with Afghanistan, Central Asia and Iran. Even in Europe and American people envice great interest in Indology and pay due attention to the life and works of great poets of India like Kalidas, Ameer Khusro, Ghalib and Tagore etc. Khusro wrote primarily in Persian which was the court language of Delhi Sultanate of medieval India. However, being a genuine liberal person he did not only uphold the value of equality and dignity of labour but also the principle of social justice and equity . So other than Persian, he also wrote extensively in one of the most prevalent popular languages of his time like Hindvi/Hindawi, with the aim to connect with the common masses and to educate and entertain them. Hindavi was the lingua franca of Khusro's time and precursor of the sister languages of Urdu and Hindi in later times.Unfortunately, unlike Khusro's Persian works, his Hindavi works did not receive any royal and religious patronage or promotion , but their propagation was carried out by those it was wtitten for and largely by the means of oral tradition from generation to generation. In Hindavi Ameer Khusro produced various poetic forms some of them not having precedence in the classical literary traditions of India. In my proposed article, I would like to discuss Khusro's Hindavi works and their impact in the life of common masses of India. This proposed article is aimed at throwing light on some of his Hindavi works and their everlasting contributions towards enriching Indian culture and civilization.

Keywords:

Linguist boundaries , Hindavi, composite culture, social justice, common masses, lingua franca, popular languages, oral tradition, classical literary traditions.

Tuti-e-Hind Abul Hasan Yaminu-ud-Deen Ameer Khusrow, popularly known as Ameer Khusro Dehlavi (1253-1325 AD) was an iconic figure in the cultural history of Indian Subcontinent. As Sayyid Ahsan al-Zafar quotes Shibli Nomani, the great Indian critic as follows:"In Indian- subcontinent, a person with so many different perfections as that of Amir Khusrow has not been born since six hundred years till now, and if you want to know the truth , not even in Iran and Rome, in thousands of years, such a multifaceted personality like Ameer Khusrow was born, except only a few".[1]

This versatile genius of Khusro consists of a prolific mystic poet, a seminal musician of classical Indian music, a mystic poet, a historian, a statesman, a warrior, an astrologer, a linguist, a humanist, a grammarian and a pioneer of Hindi and Urdu literature and so on. He was a representative of predominant cultures and traditions of India and enriches greatly their literature, music, poetry with innovations such as qawwali, tarana, khayal and invented much percussions like sitar, table, etc. Being a repository of Indo–Persian tradition, he was the first poet to pay heed to the linguistic richness of India and contributed greatly towards its development.

Khusro's works are primarily written in Persian, which was the court language of his time and Khusro is said to have witnessed at least seven sultans and three princes of Delhi Sultanet. His Persian Works were largely meant to serve the aristocratic class of society and for the propagation of sufistic teachings of his spiritual master Khwaja Nizamuddin Auliya. Consequently, his Persian works travelled to the different parts of the world and recieved royal patronage and protection and preserved in the royal libraries of the world.

Ameer Khusro has also produced vast literary works in Hindvi/Hindavi, one of the various dialects spoken in and around Delhi at the time of Khusro, dialects which long after him combined together to become standard Hindi and Urdu .Khusro considered Hindvi his mother tongue what he himself has described in the preface of his Diwan 'Ghur-rat–ul kamal;

Turk-e-Hindustanim

Man Hindvi guyam chun aab,

Shakr -e-Misri na daram,

Kez Arab guyam sokhan.

Khusro was a multi-lingual, multi-faceted personality. According to Gopi Chand Narang,[2] a great Urdu scholar and critic of India, Ameer Khusro had got proficiency over almost thirteen languages out of fourteen languages enlisted in the Constitution of India at the time its adoption by the people of independent India. Besides Persian , Arabic and Turkish, he also knew Sanskrit, Sindhi, Rekhta, Baraj Bhasha, Maithli, Bhojpuri, Rajasthani, Haryanavi and Panjabi etc. what he also claims in" Nuh Sipahr" or" Nine Skies" and perceived Sanskrit language ''Umm-ul- Alsenah" (mother of all languages) he

---

[1] .AL-Zafar ,Seyyid Ahsan, *" A Critical Study of Ijaz-e-Khusrovi"* Vol. 3, Qand-e-Parsi, Quaterly Journal of Culture, Language and Literature of Persian, Iranian Cultural Consultation, New Delhi. No. 33-34.pp. 108

[2] Narang , Gopi Chand, 2017. *Daudaye Naina Banaye Batiya* :*Khusro ki Karishma –kaari*. Lecture Delivered on Jashn –e- Rekhta, New Delhi.

mentioned therein. Khusro also claims in the preface of his book" Ghurrat-ul-Kamal" that he was the first poet of Hindvi.

Dr. P.C. Tondan says , the seeds of Khadi boli were sown by Amir Khusrow and he was the first popular poet of Khadi boli Hindi. [1]From linguistic and phonetic point of view, Hindavi was a combination of local Biraj Bhasha and Persian language which later evolved into standardized Hindi and Urdu languages. It also bears a close resemblance with Khadi Boli, another dialect of around that period, spoken on a large scale in Northern parts of India. Hindavi was a mixed language born as the result of the intermingling of the Hindus and Muslims. This improvised language became kind of Lingua Franca for the royal court of Delhi and all those he came under its influence.

The socio-cultural aspect of opting Hindavi for mass communication lies in Khusro's liberal-humanistic nature. A true path-finder Khusro resolved to bring closer these two dominant segments of Indian society, the Hindus and the Muslims, and for doing so he thought of a common language which was spoken by both of these communities. It was the time when Hindavi or Khadi boli had not even achieved the status of a dialect but, Khusro with such an exalted reputation and mastery over Persian language which was the preferred language at the royal court of Delhi, did not hesitate to choose the language of common-folk for a great cause which later on brought him the global recognition as the architect of Khadi boli and first poet of Urdu and Hindi, the two great languages of Indian Subcontinent.

As far as subject matters of such mass communication is concerned, his liberal outlook on religious and social matters, did not allow him to consider traditional themes like religion and philosophy, but common things and events of daily existence woven in the culture and rituals of Indian masses. Ameer Khusro invented various literary methods and folklores in Hindvi comparising Paheli, Doha, Mukariya, Sukhney, Nisbat , Qawwali, Bujhawal, folk songs and so on.

Khusro was the true representative of composite Indian culture. He says if you want to know anything about me, see it through Indian perspective. His sensitive mind was engrossed in humanistic traditions which reflect in his words and deeds. He had developed a rare sense of patriotism and never got tired of expressing his fondness to almost everything that belongs to India. In his Mathnavi (a long poem written in rhythmic couplets) "Nuh Siphr'' reflects most perfectly justifying his love for his motherland, the Hind. He apperes completely drowned in the love with the idea of India which for him was not exclusive but inclusive of his Islamic faith and Indian character. We find him saying "if Mecca would hear of India it would perform 'tawaf' (literary circling, is one of the Islamic rituals of pilgrimage. During the Hajj and Umrah, Muslims are to go the Kaaba seven times, the most sacred site in Islam, in a counterclockwise direction) around its garden". [2]

He further justifies his profound love for his country and the praises and precedence his motherland deserves by citing the well-known tradition of prophet Muhammad " the love for motherland is an essential part of true deen." (Hubb-al-watan min-al-iman)

---

[1] Tondan , Dr. PC, 2017,. *Ameer khusro* :*Vyaktitva and Kavya,* CEC Lecture Series, cec.nic.in

[2] Alam Mehmood, *Amir Khusro: Poet ,Musician, Courtier and Historian,* www.efluniversity.ac.in. Assistant Professor of Persian , EFLU,Hderabad

He rejoices the beauty of India and compares it with paradise on earth and glorifies it as above the majesty of Rum (Anatolia), Khurasan(Iran), and Khotan(China). This is an exemplary understanding of Khusrowian India which he idealized and adorened as the much as cherished ideals. As he describes:

Agar ferdaus bar roo-e-zameen ast,

Hameen ast-o hameen ast-o-hameen ast.

English translation of above couplet*:*

If there is paradise on earth,

It is this, it is this, it is this.

After a reading of 'Nuh Sipihr' and comprehending his deep rooted patriotism, one can wonder how just a second- generation migrant who was born to a Turk father and Indian mother, could become such a true son of Indian soil for whom love for the idea of India and her all- encompassing ideals was a matter of conscious choice and not a forced obligation what we witness today with the emerging trend of violent or aggressive nationalism. Furthermore, we find these words of Ameer Khusro corroborating this fact " I have fixed up a place (Hind) for myself; if you don't have your motherland(watan) you may also adopt it." [1]

Going by the topic of my article now I would like to introduce Ameer Khusro's works in Hindvi and their importance and impact in the lives of common masses.

Dohey (Couplets): Khusro has written a great number of Dohas in Hindavi meant to educate and entertain Indian masses. Dohas are self-contained rhyming couplets written in poetic form. It consists of two lines each of 24 instants or matras. The word Dohas is supposed to have derived from Sanskrit '' Dogdhaka'' or Dvipadi and also known as Duheviya in Apabharamsa [2] to which earliest reference is found in "Vikramorwashiyam" of Kalidas. Cultivated by Apabharamsa saints owing to its lyrical qualities, Doha existed in the Hindustani literary traditions before Khusro also particularly in Jain, Buddhist, Brahminical and Sindhi literary traditions. Dohas of Sarhapa, Kabir, Malik Muhammad Jayesi , Dadu Dayal, Mirabai, Raskhan, Rahim, Tulsidas , Surdas and Dohas of Guru Nanak called 'Sakhis' are famous. It is an epic, raas/raaso(poetic biography of a king) or didactic type of literature. The most popular epic written in the form of Doha is Tulsidas's Ramcharitramanas" a popular rendition of Sanskrit epic "Ramayana". Similarly, Chand Bardai's "Prithviraj Raaso" and poetic biography "Bisaldeve Raaso" composed by Narpati Nalh, a Hindi Apabharamsa poet of medieval time are some examples of literary works in the form of Dohas existed before Khusro.

Amir Khusro composed Dohas didactic in nature and intended on entertainment as well as enlightentenment of common people stricken down by grief and miseries of life. His Dohas were quotations of worldly wisdoms which made them outstanding and quite

---

[1] Kibria, Shahwar, Ph.D Scholar , CAA, JNU, New Delhi, (2018) ,*Amir khusro Poet of the Nation: Singing of a Divine Beloved and Homeland.*Published in FirstPost

[2] Apabharamsa' in Sanskrit literary means "corrupt" or "no-grammatical language" that deviates from the norms of Sanskrit Grammar.The word is referred to languages spoken in North India before the rise of modern languages.

popular among masses even today after nearly seven hundred years of their composition. Following are examples of some popular Dohas of Amir Khusro:

Gori soye sej par mukh par daare kes|

Chal khusro ghar aapne rain bhayi chahun des||

Khusro aisi peet kar jaise Hindu joye|

Poot paraye kaarne jal jal koyala hoye||

Apni chhawi banai k main to pee(beloved) k paas gayi|

Jab chhawi dekhi peehu ki so apni bhul gayi||

Khusro baji (baazi) prem ki main khelun pee k sang|

Jeet gayi to piya more haari pee k sang||

Khusro paati prem ki birla baanche koye|

Ved ,kuran , pothi padhe, prem bina kya hoye||

Bada hua to kiya hua jaise ped khajoor|

Panchhi ko chhaya nahin phal laage ati door||

Paheliyan (Riddles): Riddles are known to have been used in India since ancient times, references being made to their use in rituals as early as the Rigvedic Period.[1] Mahabharata contains a number of theological riddles. Use of riddles are found in classical Indian literature for the purpose of popular amusement , art and education of masses .Such riddles are found in the works of classical Sanskrit poet Bana(seventh century AD) and in Kama sutra of Vatsyayana .[2] The literary value of riddle as figures of speech has been discussed in works on poetics, among them "Kavyadarsa" by Dandin, "Sahityadarpana" by

[1] Taylor Archer, The Literary Riddles before 1600, (Berkely and Los ngeles,1948), pp. 13-17.

[2] Vatuk, Ved Prakash,(1969) *Ameer Khusro and Indian Riddle Trditions,* Journal of American Folklore.82:142-54,[144,143].*Doi :10.2307/539075.*

Visvanatha, and "Kavyalamkara" by Bhamaha.[1] However, perhaps the earliest collection of secular riddles in modern Indian language is that of Amir Khusro. [2]

Ameer khusro composed many playful riddles which have been part of popular culture of south Asia and are considered to be an early witness of Hindustani language.[3] His riddles particularly involves fun double entendre and wordplay.[4] His riddles are being passed through oral tradition for the past seven centuries till now with notable increase in recent times with the findings of some hitherto undiscovered manuscripts, particularly by Gopichand Narang, in the Royal Liberary of Germany. These riddles are written in popular colloquial style in Matrika or metre with rhythmic ending which amuses people immensely. There is a collection of 286 riddles attributed to Ameer Khusro. There are also a few controversial riddles which scholars believe were transmitted under his name which did not exist during Khusro's time, such as the' gun' and 'hookah'.[5] Riddles of Ameer Khusro are of two types:

(1) *Boojh Paheliyan or Comprehension (telligible) Riddle, and*

(2) *Bin Boojh Paheliya or Unintelligible Riddles.*

Boojh Paheliyas are those self-explanatory riddles whose meaning is hidden within the words of riddles itself. For example:

Beeson ka sar kaat liya |

Na mara na khoon kya||

In the above riddle answer is hidden in the word 'nakhoon' or nail.

Second example of Boojh paheli,

Farsi boli Aai na,

Turkey boli paai na,

Hindi boli aar si aaye,

Munh dekhe jo use bataye.

Answer- Aina(mirror)

Ek guni ne ye gun kina, hariyal mar pinjre me de dina|

Dekho jadugar ka kamal, daare hara nikle laal||

---

[1] Rahman ,Anisur, *How the Ghazal Travelled from 6th-Centuary Arabia to Persia and India and to the English-Speaking World.* Published in Scroll.in,Jan 11, 2019.

[2] Sharma , Sunil (2005) ,*Amir Khusraw: The Poet of Sufis and Sultans.* Oxford: Oneworld.p.79.ISBN:1851683623.

[3] Sharma , Sunil,(2005), *Amir Khusraw: The Poet of Sufis and Sultans. Oxford:Oneworld.p.79.ISBN:1851683623.*

[4] en.m.wikipedia.org: *Riddles of Amir Khusro.*

[5] Riyaz ,Robiya, *Evolution of Literary Hindavi up to 1740(*Unpublished M.Phil.Dessertation,Aligarh Muslim University,2011)pp. 37-38

Answer: Paan(betel leaves)

Bala tha jab mann ko bhaya

Bada hua kuchh kam na aya

Khusro kah diya uska naaon

Bujho nhi to chhodo gaon.

Answer:Diya(lamp)

Bin Boojh Paheliyans or indirect/ difficult riddles, which are also a sort of brain teaser puzzles and provoke a thinking process to reach its meaning. Its meaning is not hidden in the spelling or sound of the word as in the case of Boojh Paheli. For example;

Ek thaal motiyon se bhara,

Sab k sir pe ondha dhara ,

Chaaro ore who thaal phire

Moti usase ek na gire.

Answer: Aasman(sky)

Another example of bin boojh paheli of Khusro:

Bheetar chilman bahar chilman beech kaleja dhadkay,

Ameer khusro kahe wo do do angul sarke|| Answer: Sewing machine

Khet me upje har koyi khawe ;

Ghar me upje ghar kha jaye.

Answer- phoot(clash)

Chatakh patakh kab se,

Hath pakda jab se,

Aah ooyi kabse,

Adha gaya jab se,

Chup chaap kabse,

Sara gaya jab se.

Answer: chudi(bangles)

Khusro's riddles were not just entertaining but it also checks ingenuity or knowledge and makes education fascinating and engaging. They are also good exercise for brain and are part of rich Indian folklore.

Hindavi or bi-lingual Ghazals of Ameer Khusro: Ghazal is a form of amatory poem or ode. The origin of ghazal can be traced back in 6th century Arabic poetry and later in medieval period Persian poets adopted it into their poetic tradition giving it a definite character, maturity and refinement. However, ghazal reached to the zenith of perfection

and popularity when it arrived India in medieval period with Turkish and Iranian conquerors and nobels. Ghazal in India got further enriched by broadening its thematic and stylistic frontiers and through the interaction of various languages of this land. Ghazal in India is sometimes traced back to the 13th century in the works of Amir Khusro. Although, its Urdu incarnation is rightly identified in the work of Quli Qutub Shah towards the latter half of the 16th century and Wali Deccani in the succeeding century.[1] Ameer khusrou is a pioneer of this experiment which gave ghazal an unprecedented popularity in Indian subcontinent and made it mass appealing by mixing it beautifully with words and expressions of Hindavi and also the themes of ordinary life and experiences. A few years back when Prof. Gopi Chand Narang was delivering a speech on Amir Khusro on the occasion of Jashn-e-Rekhta, we find him mentioning about an Australian orientalist Aloy Sprenger(1813-1893) who once hold the office of government interpreter and secretary to the Asiatic Society of Calcutta. Prof. Narang goes on saying that Mr. Sperenger writes an article in the Journal of Asiatic Society Calcutta, claiming strongly that Khusro was the first poet of Urdu and Hindi and both these languages had their predecessor Hindvi. He also quotes a ghazal which is famous as the first Rekhta Ghazal(Ze haal-e-miskin makun taghaful) which he says was also scattered in various biographical memoir (Tazkerah).

Hazrat Ameer Khusro's Hindvi ghazals are of two types: type one are those having both verses in Hindvi and second type of his ghazals consist of alternate line in Persian and Hindavi/ Rekhta. Khusro is also credited with introducing romanticism into Persian Ghazal which has enhanced its beauty beyond limit.[2] But Khusro being a highly evolved sufi mystic chose theme of such ghazals predominantly simple , direct , ecstatic and having spiritual content .Khusro's other Hindvi ghazals have tuched upon the varied themes of mundane aspects of daily life and its stuffs appeal masses overwhelmingly. A good number of Khusro's ghazal have been adopted in the cinemas of the Indian subcontinents. His ghazal "Ze- hal-e-miskin" is one of the earliest prototype of Urdu/Rekhta ghazal written in Persian and Urdu. This Ghazal of Khusro is also an example of having first verse of the couplet in Persian and another in Hindvi:

Ze hal-e- miskin makun taghaful,

Dauraye naina banaye batiyan,

Ke taab-e-hijraan nadaram ayi jan,

Na lehu kahe lagaye chhatiyan,

Shab-e-hijran daraaz chuun zulf,

Roz-e-waslat chuun umr-e-kotah,

Sakhi piya ko jo main na dekhu to kaise kaatun andheri ratiyan.

Another example of hindvi ghazal having both verses in Hindvi :

---

[1] Rahman , Anisur, *How the Ghazal Travelled from 6th-Century Arabia to Persia, India and English-Speaking World.* Published in Scroll.in, Jan 11, 2019

[2] Kaur, Devinde, *Biography an Cntribution of Amir Khusro to Hindustani Music,* CEC Lecture Series, 2017

Jab yaar dekha nain bhar, dil ki gayi chinta utar,

Aisa nhi koyi ajab raakhe use samjhaye kar,

Jab aankh se ojhal bhaya, tadpan laga mera jiya,

Haqqa ilahi kiya kiya, aansuun chale bhar lai kar.

Contemporary Singers like Nusrat Fateh Ali Khan and Menhdi Hasan contributed greatly towards Indian music by singing the Ghazals of Khusro and keeping them alive for more than seven centuries.

Mukariyan/ kah Mukariyan(reversion or anomalies): Mukariyan of Amir Khusro are comprised of four verses, is also a sort of riddle. In Mukariyan some object or idea is expressed in first three couplets but shyly denied away in the fourth verse. This form of poetic expression is an innovation of Ameer Khusro. It influences, entertain and encourage common people for thinking and amuse them immensely. There are so many quite popular mukariyan prevalent among common folks of Indian subcontinent. Great Hindi poet Bhartendu Harishchandr who represents an entire period of Hindi literature composed many beautiful Mukariyan on the line of Amir Khusrow. Following are some examples of Mukariyan composed by Khusro;

Ek sajan woh gehra pyara|

Jaase ghar mera ujiyara|

Bhor bhai tab veeda kiya|

Aye sakhi saajan? Na sakhi diya||

Waabin mosu chain na aaway|

Wo meri tees aan bujhaway|

Hain wain sab gun bara baani Aye sakhi saajan ? na sakhi paani||

Barsa baras who desh me aaway|

Munh se munh laga ras piyaway|

Wa khatir mein kharche daam|

Aye sakhi sajan ? na sakhi aam(mango)||

Sukhaney / Do sukhaney or two statements: Sokhaney has been derived from Persian word "sokhan'' which means statement or dialogue. So basically sukhaney consists usually two or more question statements each ending with a question mark and both question statements have one common meaning or answer to them. It is a kind of riddle or brain teaser. This expression has rhythmic ending following some meters which appeals the masses greatly and makes its memorization quite easy for them. Do- sukney composed by Khusro were very popular then and even today among common people, This genere was also invented by Ameer Khusro in Hindvi literature. We do not find any traces of shukney before Khusro. Khusro's Doshukhney are of three types. First type of Sukhney are those in which both statements are in Hindi, second type were written only in Persian and in

third and last type of Sukhney one statement is in Hindavi and another in Persian. Following are few examples of Ameer Khusro's sokhaney:

Rahi pyasa kyu? Gadha udasa kyu?

Answer; lota na tha

Sitaar kyu na baja? Aurat kyu na nahaayi?

Ans: Parda na tha

Roti jali kyun? Ghoda (horse) ada kyu? Paan sada kyu?

Ans; Pheda na tha.

Khichdi kyun na pakai? Kabootari kyun na udai?

Ans: Chhadi na thi

Gosht kyun na khaya ? dome kyun na gaya ?

Answer: gala na tha

Dhakosla / Anmeliyan(Hypocracy or deception): Dhakoslas already existed in ancient Indian literature called 'ultawasiyan' or ulatbaansiyan and followed by saint poets like Rajab and Sundar Das. Ameer Khusro composed them in Hindvi for popular entertainment. It is said that since childhood he was keen in connecting odd things together giving it a literary touch and dhakoslas of Khusro are such example of his creative genius of him. In dhakosla disconnected or dissimilar words or expressions are woven in such a creatively beautiful cord that gives the expression a poetic touch. Although, dhakosla appears disconnected and meaningless in cursory reading but it actually stands for deeper meaning.

Example:

Kheer pakai jatan se charkha diyo jalai,

Aaya kutta kha gaya tu baithi dhol baja|

Pipal paki papoliyan, jhad jhad pade hain bair,

Sar me laga khatak se, vaah be-teri mitas|

Bhar bujhawan hum gaye, palle bandhin uun,

Kutta charkha laiy gayo,kaitey phatkungi chuun|

Nisbat: Ameer khusro wrote many nisbat in Hindvi. Ameer Khusro is credited with innovating this literary genere in Hindavi. Nisbat is about finding out one common factor or merit in two or more entirely different things. This was meant for entertaining people and also sort of puzzle and brain teaser. It is a type of riddle expressed in different styles,

Examples:

What is common between men and wheat?

Answer: Baal (hair)

What is common between a king and a rooster?

Answer: Crown

Hindvi Folk Songs: Ameer Khusro was a celebrated singer and court musician well-versed in Persian music and great lover of Hindustani music. He enriched Indian classical music by the process of synthesizing Turko- Persian music with Indian music and introduced many singing styles especially Trana, Khayal, Naqsh , Bahar and various generes and instrument, raag and taal and so on. He composed many popular folk songs in Hindvi dialect. Such folk songs got immense popularity among common men and women of India owing to the fact that they are closely associated with its traditions and value system. We find many close resemblance and shared merit between the poetries of Ameer Khusro and celebrated Hindi poet Vidyapathi for example combining poetry with music. Nearly everything they wrote lent itself to musical strains characterized by melody, rhyme and sweet symphony. Khusru's songs depict various aspect and occasions of ordinary day to day life, events and their emotions and desires. For example, wedding songs, festival folk songs ,spring songs , sawan song, beauty of nature, seasons and particularly giving voice to pain and joy in the life of an ordinary Indian woman. Khusro's folk songs still servive in India particularly in rural heartland and still sung with great fervor in marriages, ceremonies, devotional rituals, customs, farmland even roadside gatherings. Quite many of such folk songs have also been adopted in Hindi cinema making them alive and popular also among urban masses. Khusro's folk songs touched deeply different events and feelings of associated with the life of women of Indian subcontinent. Following are glimpse of wedding and sawan songs still popular among Indian women:

Marriage folk song written by Khusro:

Achhe bannay mehdi lavan de,

Haryalay banne mehdi lavan de,

Achhay bannay…

Haryalay bannay…

Khusro piya k mann bhavan de,

Ye mehdi mori ajab rangeeli,

Khusro mehdi rachavan de,

Achhay bannay…

Haryalay bannay…

Saat suhagnein ubtan laeen,

Khusro itter basavan de,

Achhay bannay…

Haryalay bannay…

Sawan folk song:

Amma mere baba ko bhejo ri- ki sawan aya ,

Beti tera baba to budha ri- ki sawan aya,

Amma mere bhaiya ko bhejo ri- ki sawan aya,

Beti tera bhaiya to bala ri- ki sawan aya'

Amma mere mamu ko bhejo ri- ki sawan aya,

Beti tera mamu to banka ri- ki sawan aya.

These folk songs can be considered some of the best expressions of Indian traditions and social values and shows how deeply rooted was Khusro's understanding of socio-cultural values of India.

Qawwali/ Devotional songs: Khusro is regarded as the father of qawwali. Qawwalis are devotional songs soaked in sufistic feeling of a pure divine love and is a part of traditional Mehfil-e-sema to invoke the glory of creator and remembrance of eternal love.Qawwali s are composed on the line of "Bhajan" [1] set in "kawalita" and named as Qawwali. It is characterized by fast 'taan' and combination of different 'swara'. It is a form of corus singing with a leading singer taking lead and remaining singers repeating the lines with clapping in rhythmic manner.[2] Almost all Qawwalis are based on ragas of Hindustani classical music. They were riginallly performrd at sufi shrines and dragah during 'urs' throughout South Asia and and has recieved mainstream popularity and international audience in recent times. Khusro cultivated this style of singing in Hindvi and Persian to propagate the message of love and universal brotherhood of his spiritual mentor Hazrat Nizamuddin Aulia.Its impact in the life of common masses were unprecedented who were subjected to inhuman treatment in the caste-ridden Indian society for ages. When they turned to the monastery of sufi-saint Hazart Nizamuddin Auliya, they were welcomed and embraced as follow-human being. Khusro sung them song of love and masses enjoyed them with pure devotion. Qawwalis are still hugely popular in Indian subcontinent and sung with great devotion and religious fervor. Below are examples are some popular Qawwalis composed by Hazrat Ameer Khusro:

Chaaap tilak sab chhini re

Mose naina milayi ke

Chhaap tilak sab chhini re

Mose naina milayi ke

Niana milayi ke naina milayi ke

Sab rang rass sab chhini re

Mose naina milayi k

Chhap tilak sab chhini re

Mose naina milayi k

---

[1] Bhajan are Hindu Devotional songs, sung especially to invoke the glory of Lord Krishna.

[2] Kaur, Devinder, *Biography and Contribution of Amir Khusro to Indian Music,CEC Lecture Series, Published on 20th Sep, 2019*

Khusro nijam k bal bal jayihein

Mohe suhaagan kinni re

Mose naina milayi k

Chhap tilak sab chhini re

Mose naina milayi k.

Main Nijam se naina laga ayi re

Ghar naari ganvari chaahe so kahe

Bas main Nijam se naina laga ayi re

Sohni surat mohini moorat

Main to hirday beech sama aayi re

Ghar naari ganvaari….

Khusro Nijaam k bal bal jaiye

Main to anmol cheri bik aayi re

Ghar naari ganvaari….

Famous qawwali bands of contemporary times like Sabri Brothers, Warsi Brothers and Nizami Bandhun etc. and their adaptation in mainstream Hindi and Pakistani cinema has contributed greatly towards the popularization of Khusro' Qawwali across the length and breadth of Indian subcontinent and even beyond its geographical confinement.

Khaliq Bari: Ameer Khusro compiled a versified glossary of Hindavi, Persian, and Arabic words and phrases. In this vocabulary collection words are written in poetic forms and their synonyms in all three languages are given. This glossary book was so popular that its thousands of copies were travelled to several countries and kept in their libraries.

Conclusion:

While concluding we can say Ameer Khusro was a versatile personality of medieval India and reached to great height in all his activities. He is representative of composite culture of India. He was a son of soil and was completely immersed in the love for his motherland. His contribution towards Indian literature and music is immeasurable and unforgettable. He wrote primarily in Persian language which was the court language of Delhi Sultanate, but he also wrote extensively for common people in their own dialect Hindavi which was just at the stage of its inception. He invented several literary methods in Hindavi such as Dhakosla, playful riddles, and Nisbat etc. to entertain and educate the masses. He also enriched Indian music by introducing several raags and taals into it and by introducing Persian and Arabic elements into it with the synthesis of both. Khusro invented a number of singing style especially 'tarana' which is sung and appreciated even today. He also invented several percussions like sitar, tabla etc. His death is not death in the literal sense of the words. As he would always remain alive in the immortal legends of literature and music of India and world.

Bibliography

1. Annemarie Schimmel, *Classical Urdu Literature from the Beginning to Iqbal*, A History of Indian Literature, 8 *(*Harssowitz. Wiesbaden, 1975*),* p. 129.

2. Gopi Chand Narang, *Amir Khusro ka Hindavi Kalam with Berlin Manuscript Collection of Sperenger,* Sang-e-Meel Publications, Lahore.

3. Abedi, Seyyed Noor-al-Hasan, *Biography and Works of Amir Khusro* : *Introduction to the Generalities of Khosrow's Ghazal*, Lahore, 1972,p.57.

4.Nafeesi, Saeed, *Ameer Khusro Dehlavi : Introduction to the Complete Court of Amir Khusro*,Tehran. 1982.

5. Subhani, Taufeeq ,*History of Iranian Literature.*

6. Ameer khusrau Dehlavi, *Jawahar-i- Khusravi*, ed. By Rashid Ahmad Salim *(*Aligarh *:*Majmua-e-Rasail Institute Press,1917*).*

7.Prakash Vatuk, Ved(1969). "*Amir Khusro and Indian Riddle Tradition*". The Journal of American Folklore.82: 142-54*[*144,143*].* Doi:10.2307/539075.

8. Riaz, Robia,[https://core.ac.uk/download pdf/144523338.pdf. *Evolution of Literary Hindavi up to 1740'*(Unpublished *M.*Phil. Dissertation, Aligarh Muslim University, 2011*).*pp.37-38.

9. *Kumar*, V, *Best Folk Songs of Bollywood*, discover.hubpages.com.April 25,2020.

10. *en.m.wikipedia.org,* Riddles of Ameer Khusro.

11. Archer Taylor, *the Literary Riddle Before 1600* (Berkely and Los Angeles,1948*),*13-17.

12. Sharma, Sunil(2005). *Amir Khusro: The Poet of Sufis and Sultans*.Oxford*:* Oneworld.p.79.ISBN 1851683623.

13. Tondan, Dr. PC, Consortium fo Educational Communication(CEC), *New Delhi, Published on 19th May, 2017.*

14. Mehmood , Dr. Aslam, Assistant professor of Persian The EFLU, Hyderabad- *Amir Kusro*: *Poet, Musician, Courtier and Historian*.efluniversity.ac.in.pp.60-64.

15. Seyyid Ahsan Al-Zafar, *A Critical Study of Ijaz-e- Khusrowi*, Vol. 3,Qand –e – Parsi

(Quaterly Journal of Culture , Language and Literature of Persian, Cultural Consultation of Iran, New Delhi) No.33-34.pp.108.

16.Kaur, Dr. Devinder, *Biography and Contribution of Amir Khusro*, CEC02*:* Lecture Series, Published on Sep. 2017.

18. A Dictionary of Classical Hindi and Urdu, Available on Wikipedia.

19.Kibria Shahwar," Ph.D. Scholar , SAA, JNU, *Poet of the Nation* :*Singing of Divine Beloved and Homeland* .2018.

MR. ABDULLAH MOLLA

Guest Lecturer

Dept of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies,

Bhasha-Bhavana, Visva-Bharati University, West Bengal

CONTRIBUTION OF ANWAR SHAH KASHMIRI TO PERCEPTION AND DISSEMINATION OF HADITH LITERATURE

Abstract: *Sayyid Muḥammad Anwar Shāh ibn Mu'azzam Shāh Kashmīrī one of the most distinguished Islamic scholars of the Indo-Pak subcontinent. He was recognized by academics of Muslim world as an authority on the science of prophetic traditions (Hadith). He was a Kashmiri Islamic scholar during the British era. He taught at a number of prominent Islamic institutions, including the Darul Uloom Deoband whose one of the gates is dedicated to his name. He was recognised as an authority on Ilm al-Hadith (the science of Hadith). His works on Hadith won him the title of Shaykh al-Hadith (Master of Hadith) and was also acclaimed as a Muhaddith (scholar of Hadith). He had mastered over all the branches of Islamic knowledge and attained a high spiritual status as well. Although his speciality was primarily in the field of the science of Hadith, he had equally mastery over other relevant Islamic sciences such as al-Fiqh (Islamic Jurisprudence) and Ulum al-Qur'an (Qur'anic Sciences) etc. Throughout his life, he pursued a devout and saintly Muslim life. He led a tedious scholar's life in accordance with his religious duties. He never displayed ill temper towards anyone, even when there many junctures to lose temper. All the good qualities he possessed, behind that the adherence of Hadith was a guidance principle for him and he sacrificed everything for its sake. His discourses, utterances, actions, silent approval and even his passive conduct, all contributed next to the holy Qur'an, the original source of Islam. Although he carried researches, authored books and delivered innumerable lectured on many diverse subjects and topics, he nevertheless made tangible contributions in the field of Hadith. He made it his duty to practically study all the sciences that were somehow related to Hadith. He had a passion for Hadith and he spent all his life teaching the Sihah Sittah (The Six Authentic Collections of Hadith). He always maintained that the Hadith literature is a monumental treasure of wisdom that serves not only as a commentary on the Holy Qur'an, but also compliments the teachings and injunctions of the holy Qur'an. This paper deals with his prominent works in the field of Hadith literature.*

Keywords: *Anwar Shah Kashmiri, The Holy Qur'an, Hadith, Sihah Sittah*

Sayyid Muḥammad Anwar Shāh ibn Mu'azzam Shāh Kashmīrī was a renowned personality of Kashmir, who specialized in Arabic language. He was a Kashmiri Islamic scholar during the British era. He was born in 1292 A.H / 1875 A.D., in a village called

Dudwan close to *Kapwara* in the city of *Baramulla*, in the valley of *Lawlab*, in a respectable and learned family of Sayed (*Masoodi*). *Allama* Kashmiri started his studies at the feet of his father *Maulana Muazam Shah* who was an eminent scholar of Islamic Sciences, apart from being well-versed in Urdu, Persian and Arabic languages. His parents were devout Muslims and he was raised in a religious environment. He completed the study of the holy *Qur'an* and some elementary Persian tracts within a couple of years. Later on, he was taught Arabic language and grammar, jurisprudence, logic and history by some local teachers.

He taught at a number of prominent institutions. However, in 1887 A.D. he went to *Hazarah* (now in North-West Frontier Province in Pakistan), where he studied philosophy, logic and Arabic language and literature. In 1892 A.D. he came to study at *Darul Uloom Deoband* whose one of the gates is dedicated to his name. He was a student of *Darul Uloom Deoband* for a period of four years. He studied *Sahih al-Bukhari, Jami at-Tirmidhi, Sunan Abu Dawood, Sahih Muslim, Muwatta of Imam Malik, Sunan al-Nasai, Sunan Ibn Majah, Tafsir al-Jalalayn, Tafsir al-Baydawi* etc. He also studied the fundamentals of jurisprudence and logic. Thereafter, he shifted to *Gangoh* where he continued his studies in the field of *Hadith.* There, he received spiritual guidance from *Maulana Rashid Ahmad Gangohi*. *Allama* Kashmiri, later on, co-founded Madrasah al-*Aminiah* in Delhi along with *Maulana Amin al-Din* in 1897 A.D. and there he began his teaching career. He also taught at the Madrasah '*Fay'm'* for three years before embarking on his Hajj. He was the head of the Madrasa *al-Aminiah* from 1897 A.D. to 1902 A.D. Thereafter, he went to Kashmir and established Madrasa *Faiz-i-A'am* at *Baramulla* in 1902 A.D. He taught there for three years and he proceeded to perform *Hajj* in l905 A.D. and visited *Tripoli, Basra, Damascus* and *Cairo* as well. The scholars over there gave him certificates in "*Ilmul Hadith*" (the science of *Hadith*). He also availed of the opportunity to study basic commentaries on *Hadith* and *Tafsir* over there. From *Hijaz* he returned to Kashmir in 1908 A.D.

However, owing to certain local conditions and considerations, he returned back to *Darul Uloom Deoband* in 1909 A.D. *Shaikh al-Hind Maulana Mufti Mahmud al-Hasan* insisted that he assume responsibilities of teaching at *Deoband*. Therefore, he just could not do otherwise and dedicated himself to the service of *Darul Uloom Deoband*.

Thereafter, *Allama* Kashmiri became the Rector of *Darul Uloom Deoband* in 1914 A.D. and remained in the same position up to 1926 A.D. teaching *Sahih al-Bukhari* and *Jami al-Tirmidhi*. His works on *Hadith* won him the title of "*Shaykhul Hadith*" (an expert in the field of *Hadith*) and was also acclaimed as a '*Muhaddith'* (scholar of *Hadith*).

However, owing to some administrative conflicts, *Allama* Kashmiri had to resign from Rector ship of *Darul Uloom Deoband* in 1927 A.D. He, subsequently, proceeded to *Dabhel* in *Surat*. *Maulana Muhammad ibn Musa Mia Afriqi* convinced him to teach at Jamia Islamia in *Dabhel*. Thus, he started to teach *Hadith* there. When he arrived in *Dabhel*, he observed that the Muslims there were engaged in practices that were contrary to the Islamic concept of *tawhid*. Thus, he taught the *Sunnah* of *Rasulullah* (PBUH) during his spare time. In *Dabhel*, he taught for five years, but in 1933 A.D. *Allama* became ill and traveled to *Deoband* for medical care, where physicians attended to his medical condition. He continued addressing students there until the day he passed away in *Deoband* in 1352 A.H. / 1933 A.D.

Those who saw him once would be full of Islamic glory and enthusiasm that they cannot remain silent, some words, some sentences of their experience must be told to the world. They must inform others that we have seen a unique and divine sign of Allah, so unique that it's like cannot be found in the past five hundred years of Islamic history. Accordingly, we find praise of *Allama* on the lips of generation after generation of

Muslims, who have recognized what he is and what he did. His profound personality claims that he should be remembered and his teachings, which are nothing more than the explanation of the holy *Qur'an* and *Hadith*. He was a tree from the original garden of Islam, a flower from the initial bouquet of *Deen*.

Maulana Kashmiri had the utmost respect for his teachers and elders and *Darul Uloom Deoband. Allama* says: "We came here, to Hindustan, from Kashmir and saw *Deen* in *Hazrat Gangohi*. After the demise of *Hazrat Gangohi*, we learned *Deen* from *Shaikhul Hind* and *Hazrat Raipuri*. And now, the practice of religion can be seen in the company of *Hazrat Hakeemul Ummat Maulana Ashraf Ali Thanvi*."[1] Many non-Muslims embraced Islam just on having a look on his glaring and glorious face. On the first glance on his face, non-Muslims used to say, if the religious scholar of fourteenth century has such a charming face, how handsome and beautiful would be the Prophet (PBUH) whom he is following.

Maulana Muhammad Anwar of Faisalabad (Loyal Pur) writes in his book "*Kamalat-e-Anwari*" (wonders of *Anwar*). Once *Allama* was waiting for train at railway station Wazirabad just before dawn. Pupils and followers of *Allama* were around him. Meanwhile the Hindu stationmaster passed near them having a large lamp in his hand. On seeing *Allama*, he stopped and started staring at his face. Then he spoke, "of which religion he is the scholar, cannot be a false religion" and embraced Islam on his (*Syed Muhammad Anwar Shah*) hands. A similar incident happened in Punjab where a non-Muslim embraced Islam just on having a look on his bright face.

Allama Kashmiri had mastered all branches of Islamic knowledge and attained a high spiritual status as well. His literary works covered a wide range of subjects that were, for example, related to the holy *Qur'an*, *'Aqa'id* (Fundamental Beliefs), Metaphysics, Islamic Jurisprudence, Zoology, Poetry and Political thought. His famous Arabic book *Faydh al-Bari* (فيض الباري، أربع مجلدات) and the Urdu book *Anwarul Bari* (أنوار الباري), both commentaries of *Sahih al-Bukhari*, are there to shield the sayings of the Most Revered *Rasul* (PBUH). His books on Islamic jurisprudence in the light of Imam *Abu Hanifa's* school of thought are the cause of his permanent place of respect and honor in the hearts of all *Hanafis.* He expressed his loyalty to the Seal of all Prophets by writing *Khatimun Nabi'een* (خاتم النبيين). He proved to all Christians of the world that the real admirers of Jesus the Son of Mary are the Muslims and rebuffed the claims of the false Messiah of *Qadian* by writing *Aqeedatul Islam fi Hayatul Eisa Alayhis Salam* (عقيدة الإسلام في حياة عيسى) and *At-Tasreeh bi ma Tawattar fi Nazool al-Maseeh* (التصريح بما تواتر في نزول المسيح).

Although he carried researches, authored books and delivered innumerable lectured on many diverse subjects and topics, he nevertheless made tangible contributions in the field of *Hadith.* He made it his duty to practically study all the sciences that were somehow related to *Hadith.* He also studied the main compilations of *Hadith*, such as the *Sihah Sittah* (The Six Authentic Collections of *Hadith)* and other works such as *Musnad al-Darmi, Musnad Ahmad Ibn Hanbal, Muntaqa Ibn Jarad, Mustadrak al-Hakim, Sunan al-Dar Qutni, Kanz al-'Ummal, al-Jami al-Saghir* of *Imam al-Suyuti, al-Musannaf Ibn Abi Shaybah* and most of the other compilations of *Hadith* and manuscripts that were then available in India and other parts of the Muslim world. His thirst for the knowledge of *Hadith* also led him to study several hundred commentaries on the *Hadith* compilations. For example, only on *al-Jami al-Sahih* of *Imam al-Bukhari* alone, he read over thirty different commentaries. Some of these commentaries are the voluminous *Fath al-Bari* of *al-Hafiz Ibn Hajar al-'Asqalani* (13 volumes), *'Umdat al-Qari* of *al-Hafiz Badr al-Din al-'Ayni* (11 volumes) and *Irshad al-Sari of Qastalani* (10 volumes).

[1] Akabir-e-Ulama-e-Deoband, p. 101.

Allama always maintained that the *Hadith* literature is a monumental treasure of wisdom that serves not only as a commentary on the holy *Qur'an,* but also compliments the teachings and injunctions of the holy *Qur'an.* Thus, it is not at all surprising that Muslims spent so much time and energy in order to collect and compile volumes in which the sayings and practical examples of the Prophet (PBUH) were preserved. Muslim scholars also took great pains in evolving a system for the critical evaluation of the authenticity and veracity of *Hadith* reporters and reports *('Ilm al-jarh wa al-ta'dil). Allama* first studied the science of *Hadith* from highly accomplished teachers and thereafter imparted it to others. He strongly felt that his calling was not only to preach the Islamic creed, but also to disseminate knowledge about the Prophet's (PBUH) way of life. For this, he relied heavily upon the standard collections of *Hadith* and the commentaries of reputed scholars.

As far as the teaching of *Hadith* is concerned, his aim was to solicit guidance from the discourses of the Prophet (PBUH) and to impart it to the modern educated Muslims. He was concerned to make them aware of how the Prophet (PBUH) practically implemented the teachings of Islam in his day-to-day life. He explained and elucidated the import of the traditions of the Prophet (PBUH) in simple language. He was convinced that the collection and compilation of the traditions did not occur by chance but was in effect decreed by *Allah* (SWT) to become a reality. Thus, he explains that this was fulfilled by the Sahabah (r.a.) who actually began memorizing and writing down the traditions during the very lifetime of the Prophet (PBUH). This legacy was passed on to their successors and thereafter from one generation to another. He also believed that Muslim scholars were divinely inspired to be inclined towards the traditions so that the sayings and practices of the Prophet (PBUH) could be disseminated and preserved forever. Thus, it was that he devoted his entire life to the studying and teaching of *Hadith.*

Throughout his life, *Allama* displayed the character of a devout and saintly Muslim scholar. He was rigorous in the observance of his religious duties. He never displayed ill temper towards anyone, even when there many junctures to lose temper. All the good qualities he possessed, behind that the adherence of *Hadith* was a guidance principle for him and he sacrificed everything for its sake. His discourses, utterances, actions, silent approval and even his passive conduct, all contributed next to the holy *Qur'an,* the original source of Islam.

In the study and teaching of *Hadith* literature, *Allama* made a concerted effort to:

- explain the headings in the *Hadith* compilation of *Imam al-Bukhari* (i.e. *tarjumat al-abwab*)
- analyze each *Hadith* thoroughly so as to unravel its legal Implication.
- identify the *ruwat* for the benefit of his students.
- discuss the import of the *Hadith.*

According to *Maulana Muhammad Binuri, Allama Kashmiri* has divided *Hadith Sahih* into four categories:

Firstly, those traditions of the Prophet (PBUH) which are reported by authorities acknowledged to be judicious, authentic and professionally competent. In addition, the traditions should be supported by authorities of first three centuries. For *Allama* Kashmiri such traditions can be accepted to be of the highest authenticity among Sahih traditions.

Secondly, those traditions which are categorically declared to be *Sahih* by *A'imma-i Hadith* (أئمة الحديث) are the next to above mentioned *Sahih* traditions.

Thirdly, any tradition of the Prophet(s) quoted by a *Muhadith* who has been well-known for his uncompromising zeal regarding sifting of authentic traditions from unauthentic ones. For example, *Ibn Huzaimah, Ibn Habban* and *Abu Unayna* have been well-known for their painstakingly authentic research in their compilations.

Fourthly, any tradition which is safe from the allegation of *Shaz-wa-Munkar* (شاذ ومنكر) and has been reported by authentic scholars and seconded by *Muhadithin* of first centuries can also be deemed to be *Sahih.*[1]

Allama Kashmiri has contributed to the technical terminology of *Ilm al-Hadith* as well. The foundationalists (*Asulin*) of *Ilm al-Hadith* have defined only the chain of narration (*Tawatur Asnad*). However, they have not systematically classified the kinds of '*Tawatur'*. The *Tawatur* has been discussed both by foundationalists (*Asulin*) and scholastics (*Mutakalimeen*). However. *Allama* Kashmiri has for the first-time classified chains of narration into four kinds as follows: *Tawatur al-Asnad* (تواتر الإسناد), *Tawatur al-Tabqat* (تواتر الطبقة), *Tawatur al-Amal* (تواتر الأمل) and *Tawatur al-Qadri al-Mushtarak* (تواتر القدر المشترك).[2]

Firstly, *Tawatur al-Asnad* such traditions which have collectively and continuously been reported by large sections of the people during the first three centuries of Islam and which have always been deemed to be beyond suspicion and doubt are subsumed under the category of *Tawatur al-Asnad*. This is the prime criterion on the basis of which later *Muhaddithin* have been basing their various traditions and tracts. For example, the tradition –

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّار[3]

"Whosoever tells a lie against me intentionally then surely let him occupy his seat in Hell-Fire", has been authentically and consistently reported by thirty companions of the Prophet (PBUH). Similarly, out of one hundred and fifty traditions pertaining to finality of the prophethood, thirty are found in *Sihah Sittah.* These thirty traditions can also be subsumed under the category of *Tawatur al-Asnad.*

Secondly, *Tawatur al-Tabquat* signifies that one group of people receives traditions from another group of people with exactly similar text just as the holy *Qur'an* is available throughout the world and is taught, read, memorized recited as one and same. It is passed on from one generation to another in that very order. The traditions reported in this way, do not necessarily require a well-documented chain of narrations.

Thirdly, *Tawatur al-Amal* signifies continuity in practice. For example, prayer, obligatory duties, practices and rituals which have been handed down to the Muslim community throughout the history of Islam are based on *Tawatur al-Amal*. In such a *Tawatur* any discrepancy or mistake is impossible to arise. In this kind of *Tawatur* again the chain of narrations is not needed.

---

[1] Bukhari, Muhammad Farooq ; Allama Muhammad Anwar Shah Kashmiri, Al-Hamra Publications, Srinagar, 1985, pp. 273-274.

[2] Monthly Ma'arif, September, 1967, Azamgarh (U.P.)

[3] رواه البخاري (1229)

Fourthly, *Tawatur al-Qadri al-Mushtarak*, if we receive traditions by various sources on the basis of a single narration *khabr wahid* (الخبر الواحد), but all authorities have accepted them or agreed upon them, the process is known as Ta*watur al-Qadri al-Mushtarak* and the tradition is acceptable as authentic. For example, the miracles of the Prophet(s) have been reported to us by means of this very *Tawatur*, and re considered authentic.[1]

According to *Allama* Kashmiri *Ilmul Hadith* entails detailed historical, circumstantial and biographical studies. The *Muhaddith* should be a historically informed person. He should have a clear and transparent analysis of the circumstances through which a particular narrator has passed in his personal life. He should also have the biographical details of the narrator at hand, for example, whether the narrator was reliable or untrustworthy, truthful or untruthful, a person of sound memory or of a forgetful type. He should also know whether the narrator was God fearing and honest or self-centric and selfish. Thus, apart from an understanding of the text of the traditions of the Prophet (PBUH), the *Muhadith* should also have a fair grasp of these technical factors as well. This is dealt with under another cognate field known as *Ilm al-Rijal* (علم الرجال) (literally meaning "Knowledge of Men" but more commonly understood as "the Science of Narration"), wherein the personality features and situational factors of a particular narrator are analysed, verified and cross-checked in the light of available historical and biographical data. Thus, *Ilm al-Rijal* is of foundational significance in the validation and verification of the traditions of the Prophet (PBUH). It is crucially important in understanding the nature of the traditions, their *Tawil* (تأويل) and *Tatbiq* (تطبيق) (harmonious construction).

Apart from this, *Allama* Kashmiri has critically evaluated the contributions of distinguished *Muhadithin* such as *Ibn Taimiyya, Ibn Hazm, Allama Jamalud Din, al-Zali, Imam Tahwi, Badurud Din Aini, Hafiz Ibn Hajar Asqalani, Yahya bin Ma'in* etc. *Allama* Kashmiri has evaluated them most judiciously and respectfully. However, he has been critical were it has not been possible for him to agree with a particular interpretation. Sometimes he has been critical even of the excessive methodological rigour displayed by certain scholars of *Hadith*. For example, he considered *Ibn Hazm* to be a profound scholar of Islam. He had almost learnt his *Al-Milal wal-Nahal* and *Al-Muhala wal-Majala* by heart. However, despite his great appreciation of and respect for *Ibn Hazm* he criticises his literalism.[2]

Allama Kashmiri was one of the greatest teachers of *Hadith* in Indian subcontinent. Although *Allama* would take deep interest in jurisprudential controversies, his style of teaching did never indicate that he was subordinating *Hadith* to *Fiqh* or stretching traditions of the Prophet(s) to suit *Hanafi Maslak* (حنفي مسلك). He would clearly and expressly say that *Fiqh* is to be accepted by reference to *Hadith* and not vice-versa. His stand was that *Hanafi Fiqh* was a function or product of traditions of the Prophet(s). *Allama* would maintain that we on our own can understand from every tradition what has been arrived at by Imam *Abu Hanifa*. In support of his contention he would give examples of main controversies between *Hanafi* and *Shafi* schools of jurisprudence and in the light of the principle of harmonious construction of traditions he would indicate how *Hanafi Fiqh* was entirely in accord with traditions of the Prophet(s). He would say that we do not want to prove the superiority of *Hanafi* school of jurisprudence in comparison to other

[1] Bukhari, Muhammad Farooq, Op.cit., pp. 27 5-276.

[2] Bukhari, Muhammad Farooq, Op.cit., pp. 286-294.

schools, rather the textual discourse of *Hadith* clearly accommodates the grounds on which *Fiqh Hanafi* stands constructed.[1] Highly authentic books on *Hadith* would always remain under his view and he would authenticate to any claim about any tradition by reference to other traditions and when a claim regarding any tradition would be supported by other traditions, it would straightly and clearly bring out the aptness of *Hanafi* juristic derivations.[2]

Apart from writing books on *Ilmul Hadith Allama* Kashmiri was an excellent teacher of *Hadith*. The main features of his teaching may be outlined as below:

1. The first and foremost objective of *Allama* Kashmiri's teaching of *Hadith* was to explain traditions of the Prophet(s) in the light of Arabic idioms, usage and syntactical rules. He held that the traditions of the Prophet (PBUH) cannot and should not be subjected to the requirements of academic terminology in vogue. We must bear in mind that traditions of the Prophet (PBUH) are historically prior to technical terms designed later on by practitioners of *Ilmul Hadith*. Such a strategy may also lead to an undermining of the traditions of the Prophet (PBUH). It is therefore methodologically unsound and spiritually unacceptable to try to fix the traditions of the Prophet (PBUH) in our favourite terminological pigeonholes.

2. During his lectures *Allama* Kashmiri would trace the origin of a given tradition in the holy *Qur'an* and thereby render easy certain difficulties faced while understanding the holy *Qur'an* itself.

3. While commenting on *Fiqh* derived from the traditions of the Prophet(s) he would quote from all the four schools of *sunni* jurisprudence and bring out the strongest arguments forwarded by their respective jurists.

4. He would point out the pre-eminence of *Hanafi Maslak* in the light of his *ovm* unflinching loyalty to the same.[3]

Conclusion: He was considered an authority on the holy *Qur'an* and *Hadith* and had profound knowledge of the Arabic language and his contemporaries acknowledged his expertise in the various fields of Islamic sciences. He had a passion for books and he visited most of the libraries in India and in other Arab countries in order to acquaint himself with the latest Islamic literature that were then available in the Muslim world.[4] *Allama* was an avid reader and his reading speed was far above average. He would daily scan through two hundred pages of *Musnad Ahmad Ibn Hanbal*.[5] What is indeed fascinating is that while conducting his lectures in *Hadith*, *Allama* would quote a *Hadith* from *Musnad Ahmad Ibn Hanbal* without having to refer to the written text. He also managed to read the entire *Fath al-Qadir* (a commentary on the *Hidayah*)[6] within a period of twenty days and mastered it.

He resolved to dedicate his entire life in the service of Islam and through his writings, he managed to clarify certain issues which kept on puzzling many a Muslim scholar. *Allama* spent his entire life in teaching and in the service of the *deen* (religion) of Islam. His scholarship brought about far reaching impact on Islamic scholarship and left

[1] Kundu, Abdul Rahman : Al-Anwar, Delhi 1978, p. 256.
[2] Ibid., p. 257.
[3] Kundu, Abdul Rahman, Op.cit., p. 449.
[4] Malfuzat-i-Muhaddith Kashmiri, op. cit., p. 41.
[5] A collection of Hadith by the famous jurist Imam Ahmad Ibn Hanbal.
[6] A legal manual of Hanafi School of Islam Jurisprudence.

an indelible mark upon students and scholars alike. He had intense enthusiasm for acquiring knowledge and a passion to disseminate *Hadith* of the Prophet (PBUH). He left behind an indelible mark on the pages of the history of Muslims in India.

References:

1) *Chishti, Aaliyah (2007). "Maulana Anwar Shah Kashmiri". In Hamid Naseem Rafiabadi.* Challenges to religions and Islam: a study of Muslim movements, personalities, issues and trends*. Sarup & Sons. pp. 922–944.* ISBN 978-81-7625-732-9. Retrieved 2 May 2011.
2) *Noor, Ahmad-Noor A.;* Yoginder Sikand*;* Martin van Bruinessen *(1 January 2008). The Madrasa in Asia: Political Activism and Transnational Linkages. Amsterdam University Press.* ISBN 978-90-5356-710-4*.*

Bibliography:

1) Briggs, John. History of the Rise of the Mohamedan Power in India. New Delhi. Oriental Press. 1981.
2) Desai, Ziyaud-din A. Centres of Islamic Learning in India. Simla. Government Press. 1978.
3) Binuri, Muhammad Yusuf. Nafhat al-Anbar. Deoband, India. Bayt al-Hikmat, n.d.
4) Binuri, Muhammad Yusuf, Maarif al-Sunan. Lahore. Al-Mat baah al-Arabiyyah. 1963. 6 Vols.
5) The New Encyclopedia Britannica. Chicago. Helen Hemingway Benton. 1973. 15th Edition. 30 Vols.
6) Qureshi, Ishtiaq Husain. Ulama in Politics. Karachi. Ma'arif Press, n.d.
7) Nadwi, Abul Hasan Ali. Muslims in India. Lucknow. Islamic Research and Publication. 1976.
8) Mujib, M. The Indian Muslim. Liverpool. George Allen and Unwin Ltd. 1967.
9) Lajpuri, Abdur Rahim. Fatawa Rahimiyyah. Rander. Maktab Rahimiyyah, n.d. 3 Vols.
10) Hasan Qamar. Muslims in India. New Delhi. Northern Book Centre. 1988.

SABISTAN BANO

Research Scholar

Department of History

A.M.U., Aligarh

BABUR, THE FIRST MUGHAL EMPEROR: A CASE STUDY OF EARLY INVASIONS

Abstract

It was the second time when Babur had lost Samarqand, a 111-year-old lady who lived in Dehkat from her Babur learned about Hindustan. She had heard that she was relative toTimur, who had accompanied the Indian campaign of 1398. She told Timur's stories of India to Babur. When Babur was involved in the struggles with Tambal and Shaibani Khan, it was the time when Babur was forced to leave Farghana after the battle of Archian. After occupying Kabul, he was the leader of an army into Hindustan. When he became the ruler of Kabul, he did think of invading Hindustan.

Babur's first expedition took place in January 1519, the second expedition in September 1519, the third expedition in 1520, the fourth expedition took place between November 1523 to October 1524, and fifth and last expedition took place at the end of 1525.

In 1509, Muhammad Shah of Nagaur ceded the authority of the Delhi Sultanate and read the Khutba and struck coins in the name of Sikandar Lodi. Nagaur remained under the Lodi Sultans until the defeat of Ibrahim Lodi at the Battle of Panipat.

In 1518 Babur started to march towards the north-western frontier region of Hindustan. He restrained the secluded fortress of ChaghanSarai on the northeast of Kabul and took part in the personal disputes of the Afghan tribes.

According to Ferishta, there is attempting to restrain the stubborn Afghans, Babur was assaulted Punjab and advanced as far as Sialkot and after that returned. Next year he repeated his venture and advanced as far as Sialkot on the Chenab, but he retraced his steps. The reason which is generally put forward for it is the Arghun's attack on Kabul; but this was not even likely to happen. At this time, Babur was in the valley of Chandwal, there was an intense earthquake lasting for half an hour.

Key words: Babur, Samarqand, Hindustan, Kabul, Khutba, Babur.

1.2.1 First Expedition

On 4th January 1519 Babur started to march to attack the fort of Bajaur. He encamped near the fort and sent a trustworthy Dilzak Afghan to advise Haider Ali or his nephew, the commander of the fort to renunciation it and proposal for submission. "Not accepting this counsel," Babur writes, "that stupid and ill-fated band sent back a wild answer, whereupon the army was ordered to make ready mantelets, ladders and other

appliances for taking a fort."[1] He encamped around there for a day aimed to complete his planning and on 6th January 1519 he writes that he well-ordered the troops to place on their armour to prepare their weapons and to mount in willingness for action.

In 1519 Babur attacked Bajaur which demolish after a vigorous fight, in which Babur's new artillery played a pivotal part.[2]

The *begs* fend off their attacks, chased the enemy up to the gateways of the fort and drove them under fortifications. However, Mulla Turk Ali and a servant of Tingiri Birdi continued their fight with the enemy. Each of them intersected their swords with the opponents, cut off their heads and brought them back. For this heroism both of them were assured reward.[3]

About three thousand Bajauris were massacred in cold blood. The fortress and the country were placed in charge of Khwaja Kalan and there a large number of troops were appointed to strengthen him with new support.[4] After creating an organization and then put it in order, after that Babur returned to his base camp.[5]

In Babur's career, the conquest of Bajaur was a turning point. By this conquest Babur had a base from where he could march towards Hindustan and suppress the rebellions of the Afghan tribes, who blocked his passage.

When Babur settled the matters of Bajaur in the most satisfactory manner he restarted his march. On 8th January 1519 A.D., he stopped nearby the spring of Baba Qara in the valley of Bajaur, where Khwaja Kalan requested, he forgiven the prisoners and gave them leave to go. But the most rebellious chiefs were distributed with ruthlessly and put to death.[6]

Babur demanded submission and loyalty, for this he sent intimidating letters to the leaders of the Yusufzai tribe.[7] From 11th January to 20th January, this was the time when Babur expended his time with the enjoyment of holding wine parties, drinking, hunting, riding and making planning for his advance walk with a military step. On 21st January he started his march on the way to Sawad on an expedition against the Yusufzai tribe.

Babur settled between Panjkura on the intersection among Bajaur and Chandwal waterways. Here he met Mansur Yusufzai, who had come back to illuminate him about the unmanageable frame of mind regarding the Afghans.[8] He walked ahead and ended at Panjkura, close to the valleys of Kahraj and Peshgram. Thusly, when he came to approach Panjkura, he, upon the exhortation of Sultan Wais Sawadi demanded a commitment of

---

[1]Babur, Zahiruddin Muhammad, *Baburnama*, Vol. I- II, Tr. Annette Susannah Beveridge Low Price Publications, New Delhi, First 1921,p. 368.
[2]S.R. Sharma, *Mughal Empire in India(1526-1761)*, Karnatak Printing Press, Bombay,1934, p.29.
[3]*Baburnama*, p.368.
[4]John Briggs, *The History of the Rise of the Muhammedan Power in India*, p. 22.
[5]*Baburnama*, p.370.
[6]ibid., p. 371.
[7]ibid.
[8]Gulbadan Begum,*Humayunnama* , Persian text, Eng. Tr. A. S. Beveridge, Idarah-i-Adabiyat-i-Delhi, reprint, Delhi, 1972, p. 91.

4000 as heaps of rice for his military, from the individuals of Kahraj and sent Sultan wais to gather it.[1]

On 30th January 1519, Shah Mansur's brother Taus Khan Yusufzai alongside his niece Bibi Mubarika arrived at the Mughal camp. At that evening Babur wedded Bibi Mubarika[2] and took her in his harem. After the culmination of this wedding coalition, Babur delayed in the region lying among Bajaur and Panjkura for the following hardly few days. During this period much grain was gathered and arrangements for the further walk into the inside of sawad nation were finished.

Before leaving Bajaur Babur additionally chose to assault Bhira. He composed that "We had turned off from Bajaur with Bhira in our thoughts. Ever since we came into Kabul it had been in my mind to move on Hindustan, but this had not been done for a variety of reasons."[3] Not just his desire was driving him to walk towards Hindustan, yet desperate need was additionally deciding his future course of action.

The prospering towns over the Jhelum vowed to extinguish his thirst and satisfy his desire of having a great domain of his own. However, before he left upon new pursuit his vital disciples prompted him to make full arrangements. This counsel was reasonable as in a piece of his military he had left at Bajaur; others had been sent towards Lamghan and the horses which were there with him were unfit in any event, for a day's administration.[4] Babur dismissed their recommendation and chose to make an advance into Hindustan.

Babur himself in the wake of sending a military towards the river Sindh set out for Sawati to chase rhinoceros. For the day, he enjoyed the game. Also, it was about the sleep time prayers when he came back to the camp that he found the observing party had come back with complete information in regards to the fords. On 17thFebruary 1519, he crossed the ford close Nilab. The individuals of that spot held up upon him and introduced a blessing comprising of a horse in mail and 300 *Shahrukhis*.[5] By mid-day prayer time when everybody had crossed the river, Babur continued his walk.

In the meantime, Babur divided his military into right, left and centre and step by step walked towards Bhira. The quick effect of this tactic was that no sooner did he reach close to the town than Diwa Hindu,[6] the son Siktu, who was the worker of Ali Khan's son of Daulat Khan Yusuf Khail joined by different notables of Bhira, held up upon him. Every one of them introduced a horse and a camel in *peshkash* and offered submission. In the evening he stayed on the banks of the river Jhelum and spent the night there.[7]

Promptly in the first part of the day of 21stFebruary 1519 A.D., Babur conveyed searching gatherings in various ways and around the same day visited Bhira, where Sangur Khan *Janjuha* presented him a horse and offered submission. After two days on

[1]*Baburnama,* p.373; One Kharwar is equal to one hundred maunds.
[2]ibid., p.375.
[3]ibid., pp. 377-378.
[4]ibid., pp. 378-79.
[5]ibid., p. 380.
[6]ibid.,p.382.
[7]Abbas Khan Sarwani, *Tarikh-i-SherShahi*, Tr. Elliot and Dowson, *History of India as told by its own Historians; the Muhammadan period,* IV, Sushil Gupta Publications, Calcutta, 1871, pp. 232-233.

23rdFebruary 1519, the Chaudharis of Bhira consented to pay 400,000 *Shahrukhis* as payment (*mal-i-aman*) for their property.[1]

The submission of the nearby chiefs during the last three or four days further encouraged Babur's fantasy of the invasion of Hindustan. His venturesome and determined *begs* counselled him to send agents to the nations which were once needy upon Amir Timur.[2]

On 4thMarch 1519, Babur got the news of the birth of Hindal and during the following hardly few days, he held uproarious drinking parties about which he writes in the most joyful mind-set.[3] At no other time, we discover him as on 5th, 7th and 12thMarch 1519 A.D. In the midst of the joy of his drinking sessions and *majun* parties he always remembered his obligations.

It was spoken to him by his supporters in the locale that is the *janjuhas* of Bhira the customary foes of the Gakkhars that the leader of the Gakkhar clan, "is the bad man round-about; he robs on the roads; he brings men to ruin; he ought either to be driven out from these parts, or to be severely punished."[4]

To additionally fortify his hold over his Indian possession he presented on Muhammad Ali *JangJung*, the nation among Bhira and Sindh and gave him extraordinary guidelines to be caring to the individuals who offered submission. At this event, the position of Muhammad Ali *JangJung* was raised and he was additionally respected with particular headwear in black velvet, an exceptional corselet *Qilmaq*, and a standard.[5] On 24thMarch he again continued his adventure.

At the point when he arrived at Ali Masjid on 27thMarch 1519 he had the fulfilment of getting ten sheep, two ass-heaps of rice, eight enormous *cheeses* from Maruf, a Yaqub Khail Dilzak. Going through Ali Masjid, JuiShahi, Bagh-i-Wafa, Siah-ab, Surkhab, Kark, Qaratu he arrived at Kabul on 30thMarch 1519. [6]

For Babur, it was practically perturbing to manage the loss of Bhira. In any case, for the occasion, inferable from his disease, he could do nothing to recuperate the lost region.[7]

As a by-product of this respect, the Afghan head of the Yusufzai's clan agreed with him that they would not respect the nation among Sawad or more Abuha as their very own and that the Afghan cultivators of Bajaur and Sawad would pay 6000 ass-heaps of rice as yearly income to his government.[8]

---

[1]John Briggs, *The History of the Rise of the Muhammedan Power in India*, Vol. II, p. 23, cited in: S. R. Sharma, Mughal Empire in India, Lakshmi Narain Agarwal, Agra, 1934, p. 14;Abul Fazl, *Akbarnama*, Tr. H. Beveridge, Vol. I, Low Price Publications, Delhi, 1902-39, p. 238.
[2]Radhey Shyam, *Babur*, op. cit., p.267.
[3]John Briggs, *The History of the Rise of the Muhammedan Power in India*,p. 23; *Akbarnama*,op. cit., p. 238.
[4]*Baburnama*, p. 389.
[5]ibid.,p. 393.
[6]*Akbarnama*, Tr. H. Beveridge, Vol.I, p. 239.
[7]ibid.
[8]*Baburnama*, p. 400.

In 1519 A. D., 8 September, the Emperor Babur came in contact with the tribe and found them ruled by two chiefs. Those who were cousins, and named Tatar and Hati respectively, while the Emperor was in their country, Hati attacked Tatar, killed him, and took the authorities of his history. Babur's force marched against Hati and captured his stronghold. Hati escaped, but later made his submission.[1]

1.2.2 Second Expedition

That year 1519, 8thSeptember, Babur had departed through the Khyber, to appease the Yusufzai and built up Peshawar fort as a base for future activities in Hindustan. Be that as it may, he was brought to mind by upsetting news from Badakhshan, which came into Babur's control in 1520.[2]

The two heads of the Dilzak Afghans, who educated him that an enormous number of meandering clans had collected with huge amounts of corn at Hasht-Nagar. They recommended that it would be in the wellness of things that he should initially assault them and claim either Hasht-Nagar or Peshawar, and make both of the two places, as the base and afterward attempt an expedition against the Yusufzais of Sawad. Babur acknowledged their proposal. He continued his walk and came to JuiShahi, where he was joined by Tingri-birdi, Sultan Muhammad Duldai and Hamza from Qunduz.[3]

On 27thSeptember 1519, Sultan Bayazid arrived to educate him that the Afridis had taken up their quarters at Baras with their products and families and it was a suitable time to shock them. Since Babur was resolved to complete the current business he dismissed Sultan Bayazid's proposal.[4]

On 4th October 1519, he ordered his men to assault the adversary. Countless Khizr Khail Afghans and their children were made hostage, while the others figured out how to run away to mountains to take cover there. The following day Babur took up his situation at Qilaghu.[5] Here he got the Waziri Afghans into submission, which were very unpredictable in taking care of tribute or obligations, presently being frightened by the exemplary punishment, which had been incurred upon the Khizr Khails, gave 300 sheep as a tribute.

The Dilzak Afghans intervened for them. Subsequently, they were absolved and their detainees were discharged. Consequently, they were approached to pay 4000 sheep in tribute. Babur likewise respected their chiefs with *tun* (coats) delegated gatherers to go with them to their nation to understand the tribute in full.[6]

In the wake of having settled records with Khirilchi Afghans and Samu Khail Afghans, Babur walked further and took up his situation at bahar, Michi-gram, and Jagdalik, where he breathed easy in the joyful making.[7] In any case, while offering himself to joy Babur did not omit to stay in contact with the issues of the neighbouring nations. He

[1]Gazetteer of the Hazara District, 1907, compiled and edited by H.D. Watson, Chatto and Windus: MCMVII, 1979, p. 35.
[2]S. R. Sharma, *Mughal Empire in India (1526-1761)*, op. cit., p.30.
[3]*Baburnama*, p. 410.
[4]ibid., p. 411.
[5]ibid., p. 413.
[6]ibid.
[7]ibid., p. 414.

sent Mulla Abdul Malik *Diwana* to Kabul to notify his officers there about his return.[1] By moderate walk he pulled back from Jagdalik drinking and enjoying on the way, arriving at Kabul on 17thNovember 1519.

He specified in his Memoirs that on Friday 16thDecember 1519, "I finished copying the odes and couplets selected according to their measure from Ali Sher Beg's four Diwans." and on Tuesday 20thDecember there was a get-together in the fortification, where "it was ordered that if anyone went out from it drunk, that person should not be invited to party again."[2]

Radhey Shyam wrote that, "He combined business with pleasure, beneath his hunting excursions and seeming carelessness laid the hidden desire and the mighty ambition of conquering Hindustan. For fulfilling this great enterprise he never retreated from collecting adequate resources. He knew how difficult was the task and how limited were his resources, but was keen to measure his sword with Sultan Ibrahim Lodi the ruler of Hindustan."[3]

Radhey Shyam mentioned that "Earlier he had simply harried the country to assess the relative strength of the local tribes and to know the reaction of his incursions on the north-western frontiers of Hindustan on the reigning Sultan of Delhi. During his first and second expedition he found that the tribes inhabiting the north-western frontier regions of Hindustan lacked the support of the ruler of Delhi."[4]

Babur assaulted the nation, put to death countless Afghans, made a significant number of them hostage to the help of the proletariat, whom they had mistreated. He progressed to Sialkot. The individuals of Sialkot submitted. After claiming the town of Sialkot Babur walked towards Sayyidpur, where the occupants of the town offered inflexible protection from the invaders. Babur quickly assaulted it, raged the fortress and put the whole army to the sword.

Babur understood that any achievement in Hindustan was troublesome, if unrealistic, insofar as Qandahar stayed unconquered, and danger at a truly defenceless purpose of his little realm was not removed. He before long constrained Shah Beg *Arghun* to withdraw from the wilderness and to take cover in the fortification of Qandahar. He sought after him and opened its attack. In any case, it demonstrated invulnerably. So understanding the uselessness of delayed tasks, he settled on the arrangement of attacking it yearly, plundering and looting the encompassing domains. Accordingly, he figured, he would have the option to diminish the battalion to submission. So in the wake of blockading the post for a month or two, he came back to Kabul to take care of other significant issues.[5]

1.2.3 Third expedition

[1]ibid., p. 415.
[2]*Baburnama,* p. 419.
[3]RadheyShyam, *Babur*, p. 277.
[4]ibid.
[5]*Baburnama,* pp. 422-25; See also, John Briggs, *The History of the Rise of the Muhammedan Power in India,* p. 23.

For the third time, Babur walked, in 1520, through Bajaur towards Bhira. After two ineffective endeavours, Babur at long last obtained Qandahar, in 1522, through the treachery of its Governor Maulana Abdul Bagi.[1]

In 1520 happened the passing of Mirza Khan, the leader of Badakhshan.[2] His son Sulaiman, being a minor could not be relied upon to hold the reins of the organization, successfully particularly when the court was divided and the peril of Uzbeg assault compromised the occupants of the nation. Under the edgiest conditions, Sulaiman was taken to Kabul by his mother Sultan Nigar Khanam.[3] What's more, no sooner did she leave Badakhshan than the Badakhshani nobles mentioned Babur to make some elective course of action for the organization of the nation during the minority of Sultan. Consequently, Babur chose to assign the territory to his eldest son Humayun,[4] and he sent the last with his mother Maham to Badakhshan.

Along these lines having been diminished of nervousness on the western frontier of his realm Babur again entered the domains of Shah Beg *Arghun.* He laid an attack on the town of Qandahar. The army offered confrontation, yet finally, it was diminished to incredible trouble. Shortage of arrangements and flare-up of disease both inside and outside the fortification diminished the protectors and the invaders to a sorry situation. They became tired of the crusade. Babur raised the attack and came back to Kabul in June 1520.[5]

Late in 1520 Babur and his wife visited Humayun[6] and remained at Badakhshan for a few days.[7] At that point he came back to Qandahar some of the time in 1521 A.D.[8] he entered that area attacking and ravaging it in transit, making incredible pain and hopelessness the individuals. Presently we see an extreme change in his viewpoint. Though he had lamented the ravaging exercises of the Mongols and denied his soldiers from contacting even a messed up needle of the individuals, he turned to similar strategies to pick up his end. He figured out how to arrive at the foot of the fortification opened its siege and squeezed the battalion hard. While the siege was going on, Shah Beg *Arghun* opened negotiations with Shah Ismail Safavi and mentioned him to mediate for his benefit and ask Babur to withdraw.

Shah Beg's present hostility and his conduct in 1507 made Babur chose to add Qandahar. Additionally, he understood that inferable from its vital significance, as long as it stayed in the hands of his foes, his endeavour against Hindustan would not succeed. He, in this way, came back from Sayyidpur and, after rebuffing the Hazara and Tagudari clans and involving Garmsir, blockaded Qandahar early in 1520.[9] As of now, starvation was seething in the nation around the town; the battalion needed supplies and plague had

[1]S. R. Sharma, *Mughal Empire in India (1526-1761)*, p. 30.
[2]John Briggs, *The History of the Rise of the Muhammedan Power in India*, p. 24.
[3]*Humayunnama*,Tr.A. S. Beveridge, op. cit., p.92.
[4]*Baburnama*, pp.432-33
[5]*Humayunnama*, Tr. A. S. Beveridge, p.92.
[6]*Baburnama*, p. 436.
[7]*Humayunnama*, Tr.A. S. Beveridge, pp.92-93.
[8]ibid., pp.92-93.
[9]Mahmudul Hasan Siddiqui, *History of the Arghuns and Tarkhans of Sind*,Tr. Mir Muhammad Masum's*Tarikh-i-Sind*, Karachi, 1972p.209.

broken out. Babur was not able to exploit this since his camp excessively was influenced by these conditions, and he was constrained to resign to Kabul in June.[1]

Radhey Shyam inscribed that, "On 26th July 1522, Shah Beg breathed his last. Finding himself in a precarious situation Maulana Abdul Baqai sent an express messenger to Babur offering to surrender the fort to him. Babur immediately responded to the call. He hastened towards Qandahar, received the keys of the fort, and a little later handed over the prize to his younger son Mirza Kamran, who was a few months junior to Humayun. Shortly, after Babur sent his ambassador to the Persian court to inform the Shah of his success in conquering the fort of Qandahar."[2]

The control of Qandahar denoted the start of another trip to Babur's desire. At this point, he had gotten progressively calm and calculating. His foolishness had been impressively tamed. Furthermore, before embraced a crisp endeavour, he currently gave a full idea to the possibilities of accomplishment.

They were predominant warriors and strategists. Furthermore, even though Shaibani Khan was dead and gone, Farghana had become a bizarre practically unfriendly land for him. He had scarcely any supporters there. He could not overlook the harsh exercise of the on-going past nor might he be able to fix it in any way.

1.2.4 Fourth Expedition

In this way, completely secure at home, Babur for the fourth time attacked India, in 1524. Daulat Khan, Governor of Punjab, was becoming amazing. Sultan Ibrahim had convened him to Delhi. Be that as it may, Daulat Khan insulted him by not showing up face to face. To shield himself from the Sultan's anger, Daulat Khan sent his son Dilawar Khan, to welcome Babur to oust Ibrahim Lodi for his uncle Alam Khan.[3]

Supported by these solicitations and by the disunity in Hindustan, Babur set out from Kabul on his fourth undertaking in January 1524.[4] He was joined by Daulat Khan and his son Dilawar Khan, who had come back from Multan on knowing about Bahadur Khan's beat. From Dipalpur Babur walked towards Sirhind, however before coming there, he chose to come back to Kabul. Babur does not state why he did this,[5] yet apparently, he withdrew, first because of the Uzbek pressure on Balkh; and, second, in light of the fact that Daulat Khan had betrayed him.

Dilawar Khan met Babur in Kabul. Just about this time one of the Afghan chiefs welcomed Prince Alam Khan Lodi son of Bahlol from Gujarat and raised the shade over his head proclaiming him sovereign under the title of Sultan Alauddin. Seeing Sultan

[1]Mahmudul Hasan, *History of the Arghuns and Tarkhans of Sind*, An Annotated Tr. Of the Relevant Parts of Mir Muhammad Masum's*Tarikh-i-Sind*, Karachi, 1972, op. cit., p. 209, cited in: Muhibbul Hasan, *Babur Founder of the Mughal Empire in India*, p. 53.
[2]Radhey Shyam, *Babur*, p. 281.
[3]S. R. Sharma, *Mughal Empire in India(1526-1761)*, p. 30.
[4]*Akbarnama*, Tr.H. Beveridge, Vol. I, p.239.
[5]*Baburnama*, p.442.

Ibrahim Lodi as excessively incredible, Sultan Alauddin as well visited Babur's court[1] to look for his help.[2]

Babur made satisfactory arrangements for this experience. He sent few of his men ahead of time towards Hindustan with directions to overcome and occupy Sialkot and Lahore and its conditions and to send him information about the genuine situation of the Lodi Empire.[3]

Until further notice, Daulat Khan Acquiesced, however, was greatly annoyed at not been appointed Lahore. He felt embarrassed and even intervened in an assault on Babur. He would have done it yet for the genuineness of his own son Dilawar Khan, who notified Babur of his father's accursed aims. Babur instantly captured Daulat Khan Lodi and put him under observation.[4]

When Alam Khan arrived at Kabul he portrayed the wretched state of his officers whom he had posted in Punjab.[5] Rather than taking the field face to face, Babur sent Alam Khan back with a firman requesting that his officers help him in overcoming Delhi. On his arrival in Lahore Alam Khan met the Mughal officers, however, the last would not follow imperial orders for they did not faith in him.[6] As indicated by Babur upon this Alam Khan sent Ghazi Khan's son Sher Khan[7] to consult with his father and Daulat Khan for a hostile and cautious union against the Mughals.

The Afghans invited Alam Khan's choice to betray the Mughals. Dilawar Khan who had figured out how to escape from his father's guardianship three months sooner and who was currently present at Lahore went along with him in his arrangements.[8] The two at that point convinced Mahmud Khan, the son of Khan-i-Jahan to go along with them. From there on, every one of them joined the benchmarks of Ghazi Khan the recent adversary of the Mughals.

To put it plainly, the volte-face of Daulat Khan and Ghazi Khan or the malleability of Alam Khan did not improve the circumstance. It exacerbated it. They could never again have a sense of safety. Then again, Ibrahim Lodi had scored vigorously against them. Dissatisfaction and frustration stirred their sentiments of retribution and they again appealed Babur to act the hero and along these lines spare their assets.

When Babur began his fourth campaign on India in 1524, the territory of the Afghan Empire expanded nominally from Behreh, southeast of Jhelum, to Bihar. But Ibrahim Lodi's power and hold were too modest on the vast expanse of land for the various disaffected Afghan factions that ruled large parts of the country. His reign was full of confusion and rebellions.[9]

---

[1]Nizamuddin Ahmad, *Tabqat-i-Akbari* Tr. Brajendra Nath, Vol. I, Low Price Publications, New Delhi, 1992, p. 2.
[2]John Briggs, *The History of the Rise of the Muhammedan Power in India*, p. 24
[3]Nizamuddin Ahmad, *Tabqat-i-Akbari*, Tr. Brajendra Nath De, Vol. II, op. cit., pp. 1-2.
[4]*Baburnama*, p. 441.
[5]Badauni, *Muntakhab-ut- Tawarikh*, Tr. S.A. Ranking, Vol. I, Academica Asiatica, Patna, 1973, p. 436.
[6]*Baburnama*, p. 455.
[7]ibid.
[8]ibid.
[9]S.H. Askari, *Medieval Bihar, Sultanate and Mughal Period*, Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna, 1990, p. 64.

1.2.5 Fifth Expedition

Babur's fifth and last expedition occurred toward the end of the year 1525. Babur now crossed the border for the last time (November 1525), with the biggest armed force he had ever driven into Hindustan. Humayun was with him, with a contingent from Badakhshan.[1]

Babur set out from Kabul on 17thNovember 1525.[2] He had just given orders to sovereign Humayun, at that point in Badakhshan, requesting that he go along with him with his military at the most punctual. In his eastward Journey which was done at a comfortable pace, his first stop was at DehYaqut.[3] Here he was joined by Humayun and Khwaja Kalan. Continuing his walk he crossed the Indus on 16thDecember 1525. He met no resistance at all, and he pitched his camp on the banks of Nilab. He ordered his *bakhshish* to survey his military and check the number of cavalrymen and infantrymen. It was accounted for that the total strength was 12,000 men.[4]Khusrau Kokaltash, who was holding the stronghold of Sialkot, had cleared it upon the approach of Ghazi Khan.[5] Resolute, Babur proceeded onward, yet barely had he secured some separation when it was reported for that Ghazi Khan and Daulat Khan were walking with 40,000 soldiers to block his section and repulse his intrusion.

On 29th December 1525, he continued his walk and turned towards Sialkot. He vanquished and occupied the stronghold of Sialkot, after which sent NurBeg's brother Shaham towards Lahore to gather information concerning the whereabouts of Ghazi Khan and discover the place, where it is helpful to connect the opponent in the battle.

He presently guided his officers to open the siege of the fortress and press it overwhelmingly. On the following day, Ismail Khan, the son of Ali Khan's son of Daulat Khan left the post to inform Babur that Ghazi Khan was not in the stronghold[6] and that just Daulat Khan and Ali Khan were there. Babur dexterously prevailed upon him to his side and sent him once again into the fort to work for him. Before long Daulat Khan was decreased to narrow channels and he was constrained to open negotiations for harmony. He offered to give up the fortress of Milwat on the guarantee of safe lead. Babur assented and sent Khwaja Mir Miran to accompany him to his camp. Daulat Khan was introduced before Babur in open *darbar*.[7]

Not long after the fortification was occupied on 7th January 1526.[8] Ali Khan and different individuals from the family of Daulat Khan were accompanied to Mir Khalifa's home, where they were stayed.

Milwat and the encompassing territory were put in the charge of Muhammad Ali Jang-Jang, however, he left his younger brother, Arghun Sultan with certain soldiers in his place and he continued to join the sovereign.[9]

---

[1]S. R. Sharma, *Mughal Empire in India (1526-1761),* p. 31.
[2]*Baburnama,* p. 456.
[3]*Tabqat-i-Akbari,* Vol. II, p .2.
[4]*Baburnama,* p. 452.
[5]*Tabqat-i-Akbari,* Vol. II, p. 4.
[6]*Baburnama,* p. 459.
[7]ibid.
[8]*Baburnama,* pp. 459-461.
[9]ibid., p. 461.

Suspecting that Ghazi Khan was still in the stronghold of Milwat, Babur ordered an exhaustive inquiry, however futile, for Ghazi[1] had gotten away.[2] On 10th January Babur moved from Milwat towards Delhi for a preliminary of solidarity with Ibrahim Lodi. Babur's men assaulted the fort of Kutila, situated north-east of the valley and garrisoned by Ghazi's soldiers. They about attacked it, however, night fell and the battalion got away, alongside Ghazi Khan, who had taken reject there.[3]

At the time of Babur's invasion, the social and religious conditions in Punjab were formidable. Many saints and reformers were trying their best to end the evils of that time. They were doing their best to bridge the differences between the Hindus and the Muslims and thus to bring the two communities closer.[4]

[1]Ghazi Khan escaped and joined Ibrahim, but he was killed at the battle of Panipat.
[2]Mirza Haidar Daughlat, *Tarikh- i- Rashidi*, Tr. N. Elias, Rev. & Ed. Denison Ross, I, Academica Asiatica, Patna, l973, p. 203..
[3]Shaikh Zainuddin, *Tabaqat-i-Baburi*, photostate copy of the Rampur MS. in the Khudabakhsh Library, Patna, Tr. HasanAskari as Zain Khan's *Tabaqat-i-Baburi*, Delhi, 1982, pp.83-84.
[4]Punjab District Gazetteers, Patiala, B.R. Sharma, Chandigarh, 1992, p. 44.

ABDUL RAHMAN ANSARI

Ph.D. Scholar, Department of Persian,

Banaras Hindu University

PERSIAN POETS OF EARLY MUGHAL PERIOD

Abstract:

Advent of Mughals in India added a new chapter in history of Persian poetry. To some extent, Mughal dynasty of India was an extension of the Timurid line, who were renowned for their patronization, poetic taste and aesthetic sense. In early Mughal period, only few poets and scholars were associated with Babur's court. Babur invited Yusufi, and welcomed Ghiyasuddin Khwandmir, Mirza Ibrahim Qanuini, Shaikh Abdul Wajid Fareghi, and Shaikh Zain to his court and appointed them on suitable positions. The corpus of his nobles, officers and administrative acumens, who were Turks of central Asia and possessed versatile qualities of wielding a sword and pen with equal confidence. They had a little poetic taste which they expressed in leisure. With the nobles, officers and few immigrants, Babur cultivated Persian poetry in Indian soil and his successors got its fruit. Since persona of most of the poets of this period is marked by anonymity, this article tries to render a brief account of poets and casts light on Babur's patronization and primitive development of Persian poetry during his reign.

Key words: Persian poets, Patronization, Indo-Persian poetry, Early Mughal period.

Introduction:

Indian sub-continent have shared composite lingual, cultural and literary bonds with Persia throughout the history. India enjoyed the advantage of neighboring Persia geographically and having same language root of Indo-European family. The most important change took place in medieval India was adoption of Persian language as the language of ruling class. Turk Sultans and nobles of India would prefer Persian over their own language. Probably because it historically belonged to the Perso-Turkish culture of central Asia. Soon after the invasion of Chingiz Khan on Iran in 1219 A.D. many scholars e.g. Qazi Minhaj Siraj, Mohammed Aufi, took refuge in India. Sultans and nobles welcomed them open handedly and in order to maintain Persian and Turk nobility, offered them suitable positions and important administrative posts.

In Sultanate period, Persian language started rooting in Indian society and influencing other Indian languages. Persian poets, chroniclers, mystics and scholars started heading to India to seek fortune, opportunities or safety from civil or religious wars in their homeland. As a result, a literary environment came into existence and meetings of poets, scholars, jurists started taking place where Persian was used as medium of conversation.

Sultans of Delhi enjoyed the company of poets and would take them to important events e.g. Coronation ceremony, Festivals, wars to get the event be a part of history and subject of poetry. Sultans like Alauddin Khilji and Sikander Lodhi were poets themselves and composed poetry occasionally. Their couplets can be found in different chronicles and Tazkiras.

Advent of Mughals in India added a new chapter in history of Persian poetry. To some extent, Mughal dynasty of India was an extension of the Timurid line, who were renowned for their patronization, poetic taste and aesthetic sense. Under Mughal patronage, Persian poetry flourished to new heights and later a new school of Indo-Persian styled poetry emerged as *Sabk-e-Hindi*.

Babur as a patron of Persian poets in India:

Apart from being a military expediter, Babur was also a man-of-pen. His father Umar Shaikh Mirza and his mother Qutulg Nigar Khanam, had considerable influence in molding his literary taste. Mirza often read Masnavi of Maulana Rumi, Shah Nameh of Ferdausi and quintets of Nezami and Amir Khusraw.[1] Altogether it helped Babur to develop literary taste and unlike his father, Gulistan-e-Sadi, Shah Nameh, quintets of Nezamia and Khusraw, Zafar Nameh of Yazdi etc. were his favorite books.[2] He occasionally composed Persian and Turkish poetries under the pen-name "Babur". For instance, after the conquest of Chanderi fort, he composed off-hand a chronogram, puzzling with the word '*Chand*' and '*Harb*':

بود چندیری مقام چندیری پر ز کفار و دار حربی خرب
فتح کردم به حرب قلعه آن گشت تاریخ «فتح دارالحرب»

For a while the place 'Chanderi' was,

Pagan full and polluted was the seat of the hostile camp,

By fighting I conquered this fort,

The date was found in "Fath-e-Darulharb." [3]

After the conquest of Delhi, Babur was consolidating Mughal forces and expanding his territory in India. Meanwhile he realized the essence of learned and literary persons in his surroundings which his forefather Amir Timur appreciated highly during his time. He started patronizing poets and literary figures by inviting Yusufi, a renowned physician and poet to his court. He welcomed Ghiyasuddin Khwandmir, Mirza Ibrahim Qanuini, Shaikh Abdul Wajid Fareghi, and Shaikh Zain, and appointed them on suitable positions. Most of his nobles, officers and administrative acumens, who were Turks of central Asia and possessed versatile qualities of wielding a sword and pen with equal confidence. They had a little poetic taste which they expressed in leisure. Nizamuddin Ahmed remarks them as *ahle-razm-o-bazm*. Babur appreciated their poetic endeavors. Khwaja Kalan Baig, one of his confidant, would often write him poetic letters and he would reply him back with his own verses.

Poetry emerged in this period, in terms of language, imagination and subject is not much creative. As it has been told earlier that Babur's officers would compose poetries occasionally. They would be on war in a strange land for a long time, a glimpse of beloved and a moment of rest was all they could think of and therefore poetry of this period revolves around wine and beloved. They did not bother much to jewel their couplets with fancy words or proverbs. However, there were some seasoned poets as well i.e. Unsi, Haqiri, Jani Timban, Fareghi, Qasim Kahi, they contributed a lot to the development of Persian poetry during this period.

[1] A history of Persian language & literature at the Mughal court, P: 47
[2] Memoirs of Babur, p: 479
[3] A history of Persian language & literature at the Mughal court, P: 51

Persian poets of Babur's reign (1526-30):

Jani Timban: Maulan Jani, was native of Bukhara where his father's occupation was *Timbani* (Guard of Carvan), therefore he became famous with this title. He met Babur in Kabul and since then became a part of his meetings.[1] Amid this, Shah Mohammed Khan Shapur was appointed as governor of Kabul. He quarreled with Jani, moreover his other activities disappointed Babur. Jani composed a satire and read it before the emperor. Babur appreciated his satire and rewarded him. These are initial line of satire:

شاعر شاه همایونم و خاک درگه — می زند کوکبه شاعریم طعنه به مه
خسرو شعرم و ابیات خوشم خیل و سپه — دیدم از قحبه زنی ظلم نه جرم و نه گنه
پاره کاغذ اگر از هذیان گشته سیه — سوی هجویش اگر اندیشه شود روی به ره
غرض آنست که این خر صفتان ابله — عزت و حرمت این طایفه دارند نگه
وای آنکس که به خیل شعرا بستیزد — هر که با ما بستیزد به بلا بستیزد

Emperor asked him "why you don't say:

هر که با ما بستیزد با خدا بستیزد[2]

Khwaja Kalan Baig: was an old companion and confidant of Babur. They studied together in early childhood and mastered the warfare together. "It is said that it was Khwaja Kalan who proposed the idea of attack on India."[3]

When Khwaja disgusted with his prolonged stay in India and set for Kabul, composed this couplet and sent it to Babur:

اگر بخیر و سلامت گذر ز سند کنم — سیاه روی شوم گر هوای هند کنم

If safe and I cross the Sind,

My face be blackened if I desire for Hind.

Babur replied him with this Turkhis verse:

یوز شکر با یرغه کریم غفار — بیرون فیه هند و سند ملکی بسیار
گر هند نینک ایسغ تورمای سین — ساووغ یوزینی کورای ویسانک غزنی بار[4]

Babur, give a hundred thanks that merciful, the forgiver,

Has given thee Sind and Hind and widespread kingdom,

If thou canst stand their heat,

If thou sayest, "let me see the cold region," there lies Ghazni.

Maulana Mohammed Shah: was an old servant of Babur, and was famous as 'Hafiz Khairak'. Among his poetries, just a couplet and a eulogy which he composed for Humayun, are remaining as of now:

روشن نگشت پیش تو روز سیاه ما — هر چند شعله زد شب غم برق آه ما[5]

Our black days didn't get enlightened before you,

Although my sighs were lit in the nigh of sorrow.

[1] Majma-ul-Fuzala, P: 147
[2] Muntakhabut-tawarikh, Vol: 1, P: 326
[3] Nafaisul Ma'asir, P: 483
[4] Muzakkir-e-Ahbab, P: 198-201
[5] Arafatul Aasheqin, Vol: 4, P: 2097

In the following eulogy he has sketched Humayun:

ی رخِ خوی کرده ای ، تازه چو گل برگ تر خطّ مسلسل برو ، فتنهٔ دور قمر
لعل لبت جان فزا ، سرو قدن دلربا زلفِ تو دام بلا ، نرگسِ تو فتنه گر [1]

Maulan Shehabuddin Mo'ammayi (Haqiri): when Uzbek forces besieged Herat in 934 A.H. Haqiri immigrated to India along with Khwandmir and Mirza Ibrahim Qanuni. He interviewed Emperor Babur and was rewarded with the *Pargana* of Palam.[2] Humayun also gave him title of 'Amir-uz-zorafa'. Haqiri devoted a poetic treatise to Babur, he replied with this quatrain:

نامت ز عجم رفته به ملک عرب است وز نامهٔ تو در دل محزون طرب است
هر کس به در آرد از معمّا نامی نام تو از بر آورده معمّا، عجب است [3]

Your name has travelled from Ajam to Arab,

Your letter relieves the painful heart,

Whoever takes any name out of Mo'amma,

It's strange that your name comes.

Qasim Kahi: Maulana Najmuddin Kahi, was native of Miankal, his eagerness of acquiring knowledge led him to meet Maulana Jami. After accomplishment of his education, came India and interviewed Sultan Bahadur Gujrati, Mirza Askari, Mahmhud Khan, Humayun and Akbar. He was an excellent debater and would overcome on twenty people.[4] When he came to the court of Akbar, was rewarded with one lakh Tanka. Moreover, Akbar ordered to give him one thousand rupees every time he comes to court.[5]

Kahi was a well versed poet and Badauni writes "his poetries are read in meetings and gatherings."[6] He had a diwan, which was surviving in oblivion. Prof. Hadi Hasan discovered it in Prof. Masud Hasan's library and it is published now.

تا چند به این و آن مقیّد باشیم در چشم نکویان جهان بد باشیم
از مردم عالم چو ندیدیم وفا آن که به دگر به عالم خود باشیم

How long will we be bounded to these people?

Will remain bad in the eyes of good people?

Since we did not see loyalty from people,

It's better if we live in our own world.

Shaikh Abul Wajid Fareghi: came India from Herat along with his uncle Shaikh Zain and settled down in Agra. Humayun honored with the title '*Amir-ul-shoara*'.[7] He was a mysticism oriented poet and most of poetries are filled with context of mysticism. However, his *diwan* is clueless and few of his couplets are mentioned in various book:

از بس که آن جفاجو آزار می نماید اندک ترحم او بسیار می نماید

[1] Qanun-i-Humayuni, P: 99
[2] Muzakkir-e-Ahbab, P: 203
[3] Arafatul Aasheqin, Vol: 2, P: 757-758
[4] Majmua Maqalat-i-Hadi Hasan, P: 230-232
[5] Miftahut-Tawarikh, P: 188
[6] Muntakhabut-tawarikh, Vol: 3, P: 121
[7] Qanun-i-Humayuni, P: 59-60

Even though that oppressor oppresses us very much,

A bit mercy of him looks huge.

Shaikh Zain: He came India during Babur' reign and got himself associated with the court. Babur appointed him as *Sadr* (State Secretary). Shaikh was a seasoned scholar, he wrote the Farman announcing Babur's renunciation of wine, and of victory over Rajput army of Rana Sanga. He was the first to translate memoirs of Babur, and named it "Tabqat-i-Baburi".

Babur respected his intelligence and elegance. Shaikh also had expertise in enigma. When he came in court first time, Babur asked him "how old are you?" Shaikh replied: five years ago, I was forty, now I am forty and after two year, another forty years will complete. Babur perceived his intention and rewarded him.[1]

He wrote poetry under the pen name of 'wafai'. One of his quatrains which represent Indian taste in poetic grace are quoted below:

آرمیدی به رقیبان و رمیدی از ما ما چه کردیم و چه دیدی چه شنیدی از ما
بهر دل بردن ما حاجت بیداد نبود می سپردیم اگر می طلبیدی از ما

You did rest with the rivals and fled from us,

What did we do? What did you see and hear from us?

To carry off our heart, cruelty was not needed,

We would have surrendered it to you, if you would have asked. [2]

Unsi Qandhari: Mohammed Shah, pen name Unsi was an old *Waqai Navis* of Babur. He came India with Babur and moved to Lahore in his last days. He died there in 973 A.H. Unsi was mellifluous poet and had a collection of poetries. He composed a masnavi "ghul-e-rangeen" and its manuscripts is preserved in India Office library.

Unsi was present at the coronation ceremony of Humayun in Agra. Where boats were lit with candles and lamps and its light was reflecting on water. It was creating a sophisticating environment. Unsi composed this couplet:

سرشکم رفته رفته بیتو دریا شد، تماشا کن بیا در کشتی چشمم نشین و سیر دریا کن

See, my tear, without you, has gradually turned into a sea

Come, sit in the boat of my eyes and see the sea [3]

Yusufi: Yusuf bin Mohammed bin Yusuf accomplished his education in Transoxiana, and compsed 'Jami-ul-fawaid' which comprises on 289 quatrains depicting remedies. His father Mohammed bin Yusuf was an eminent physician and authored the medical dictionary 'Bahr-ul-jawaher'[4].

He was summoned by Babur from Khorasan.[5] He was an elegant physician and a poet as well. He jotted down remedies into poetries and presented it to Babur and his son

[1] Nafaisul Ma'asir, P: 593
[2] History of Persian language & literature at the Mughal court, P: 106
[3] Majma-ush-shoaraye Jahangiri, P: 51-52
[4] Al Zaria, Vol: 3, P: 33
[5] Akbar Nama, Vol: 1, P: 113

Humayun. 'Badai-ul-insha' 'Dalail-ul-baul' 'Dalail-ul-nabz' 'Riyaz-ul-adviyah' 'Fawaid-ul-akhbar' and 'Sitta-e-zaruriyah' are his famous works.[1]

He composed this eulogy for the coronation ceremony of Humayun:

بابر شهِ داد کیش دادار پرست آن شاهِ همایون که در ظلم به بست
در نهصد و سی و هفت ناگه ز قضا آن شد ز جهان و این بجایش به نشست

Babur, the king of believers of justice, a just king,

Humayun, who closed the door of injustice,

In the year 937 suddenly,

He died and This (Humayun) succeeded him.[2]

Conclusion:

Babur inherited the culture of patronization from his ancestor Amir Timur. In his imitation, Babur raided India five times and after gaining control over Agra and Delhi, he established a literary environment which was initially tough enough to survive. However, he assembled literary figures around him. With few nobles, officers and immigrants poets, literary activity kicked off in Mughal court. Presence of writers, scholars and historians like Shaikh Zain, Shaikh Abul Wajid fareghi, Ghiyasuddin Khwandmir, Ghiyasuddin Khwandmir and Qasim Kahi, inspired other poets and writers. As the Mughal's foundation consolidated, several men-of-pen and fortune seekers from Iran and central Asia set for India. Mughal emperors and their nobles came forward as their patron and welcomed them open handedly. As a result Persian poetry reached to new heights in India and the soil which Babur had cultivated, his successors got its fruit.

References:

1. Abdul Ghani, Mohammed, A history of Persian language & literature at Mughal court, The Indian Press LTD, Allahabad 1929.
2. Abul Fazl, Akbar Nama, edited by Maulawi Abdurrahim, Muzhurul Ajayeb Press 1877.
3. Awhadi, Taqiuddin Husain, Arafatul Ashiqin o Arasatul Arefin, edited by Z. Sahibkari & A.F Ahmed, Tehran 2010.
4. Babur, Zahiruddin Mohammed, Memoirs of Babur, trasn. A.S. Beveridge, London 1922.
5. Badauni, Abdul Qadir, Muntakhab ut Tawarikh, edited by Molvi Ahmed Ali and T.A Subhani, 2001.
6. Baqai, Arif, Majma-ul-Fuzala, Researcher, Mohammed Khushkab, Theran 2015.
7. Golchin Ma'ani, Ahmed, Karwan e Hind, 1990.
8. Hadi, Hasan, Majmua Maqalat e Hadi Hasan, Hyderabad 1956.
9. Husain, Mohammed Anwar, Miftahut Tawarikh Naval Kishor, 1867.

[1] Karwan-e-Hind, Vol: 2, P: 1559

[2] Qanun-i-humayuni, P: 30

10. Kami Qazvini, Alauddawla, Nafaisul Ma'asir, edited by Dr. Saeed Shafiun, Tehran 2016.
11. Khwandamir, Ghiyasuddin, Qanun-i-Humyuni, edited by Hidayat Husain, The Royal Asiatic society, Bengal 1940.
12. Nisari, Khwaja Bahauddin, Muzakkri-e-Ahbab, edited by Syed Mohammed Fazlullah 1969.
13. Nizamuddin, Ahmed, Tabqat-i-Akbari, Transated by B. DE, the Asiatic society 1973.
14. Qate'i, Mulla, Majma-ul-Shoaraye Jahangiri edited by Dr. Mohammed Salim Akhtar, Karachi 1979.
15. Tehrani, Agha Buzorg, Al Zaria ila Tasanif al Shia, Bairut 1983. [1]

TARIQUE JAMEEL ANSARI

Assistant Curator, Sir Syed Academy

Aligarh Muslim University, Aligarh

BRIEF HISTORY OF NAWAB SULTAN JAHAN BEGUM AND ALIGARH

Abstract-*Beghum Sultan Jahan established several key educational institutions in Bhopal, including free and obligatory basic education in 1918, following in the footsteps of her mother and grandmother. During her rule, she placed a strong emphasis on public education, particularly female education. She established numerous technical institutes and schools, as well as increasing the number of qualified teachers. She was the founding Chancellor of Aligarh Muslim University from 1920 till her death. She is the only woman who has served as Chancellor of Aligarh Muslim University as of 1920.*

The Bhopal royal family has long been supportive of the Aligarh Movement. H.H. Begum Shah Jahan was a supporter of the Scientific Society and provided a sum of 10,000 rupees for the construction of the Jama Masjid at M.A.O[1]. College. Sir Syed Ahmad Khan's vision and goal received a lot of support from Begum Sultan Jahan. After Sir Syed's death, she took over the reigns of Bhopal, although she was always generous to M.A.O. College. M.A.O. College and Begum Sultan Jahan had a closer understanding while Nawab Viqarul Mulk was Secretary of College. Hafiz Hamidullah Khan, her son, was enrolled in M.A.O. College Aligarh in 1910. This was a watershed moment for the Bhopal royal family, as Hafiz Hamidullah Khan became the first member of the dynasty to receive a proper university degree. She and other family members contributed Rs. 50000/- to the College Building Fund. Begum Sultan Jahan was a regular contributor to the All India Muslim Educational Conference, which was founded by Sir Syed Ahmad Khan[2]. On February 27, 1914, she paid a visit to Aligarh and lay the foundation stone for the All India Muslim Educational Conference building. "Sultan JahanManzil" is the new name for this structure. When H.H. Agha Khan ceased giving the College his annual financial assistance, H.H. Begum Sultan Jahan encouraged him to continue. H.H. Agha Khan was persuaded, and his annual significant donation to the College Fund was resumed. The notion of a Muslim university was made public during the annual session of the Muslim Educational Conference in 1910, and H.H. Agha Khan and Nawab Viqarul Mulk paid a visit to H.H.

---

[1] *"Sultan Jahan, Begum of Bhopal". royalcollection. Royal Collection Trust. Retrieved 23 September 2015.*

[2] *"HISTORY OF BHOPAL". Bhopal.nic.in. Retrieved 18 February 2016.*

Begum Sultan Jahan in Allahabad[1]. She gave 100,000/- right away (One Lakh Rupees for the cause of Muslim University). She also offered to give funds towards the College's power and electrical appliances. She pledged her entire support for Muslim University and vowed to speak with other princely kingdoms, landlords, and wealthy individuals, including H.H. Nizam of Hyderabad, about their support. Bhopal was one of the Provincial Centers when the fund-raising for Muslim University began, and Begum Sultan Jahan took the lead in raising donations. She gave motivational presentations at several locations, including the Price of Wales Ladies Club. She accepted the MAO College Trustees' Honor Plaque and travelled to Aligarh in 1915 to dedicate the Sultan Jahan Building. She had an open dialogue with the MAO College Trustees and staff. She provided essential advice to students, faculty, and Trustees. She also covered the entire cost of Allama Shibli Nomani's Seeratun-Nabi book. H.H. Begum Sultan Jahan supported Allama Shibli Nomani's designated heir and disciple Maulana Syed Sulaiman Nadvi even after Allama Shibli's death.

H.H. Begum Sultan Jahan was interested in women's education and funded Sheikh Abdullah's Mohammad Girls School in Aligarh (Papa Min)[2]. The administration of the Girls School was seeking for an appropriate curriculum, but funding was a huge hurdle. H.H. Begum Sultan Jahan gave special attention to the development of a proper curriculum for women's education and generously donated to it. She took a personal interest in women's education and designed a curriculum framework, which she delivered in her Presidential address to the annual Muslim Educational Conference's women's education session on December 5, 1911 She advocated that Home science be included in the curricula of women's education to make it more appealing to the general public. She inaugurated the Girls School building and laid the foundation stone for a girl's hostel during her visit to Aligarh in 1915.

The Aligarh Muslim University was established on December 17th. The Governor General of India was to designate the first Chancellor, first Pro-Chancellor, and first Vice-Chancellor, according to Section III of the statute. The act included a list of 124 Foundation members of the First AMU Court in an Annexure. Lord Chelmsford, the Governor General of India, named H.H. Mohammad Ali Mohammad, Raja Mahmudabad, as the university's first Vice-Chancellor[3]. The Aligarh Muslim University's Chancellor and Pro-Chancellor have been nominated, respectively, by Her Highness Sultan Jahan Begum of Bhopal and H.H. Sir Agha Khan. On the 17th of December, 1920, the University held its opening ceremony.

Begum Sultan Jahan used to attend University functions despite her busy schedule. On the 28th of December, 1922, she presided over the First Convocation of the newly created Aligarh Muslim University. Begum Sultan Jahan said in her presidential address: "Today, we gather to commemorate our University's First Convocation, the culmination of fifty years of national effort and vision. The nation owes a profound debt of gratitude

---

[1] *"Sultan Jahan, Begum of Bhopal". Royal collection. Royal Collection Trust. Retrieved 23 September 2015*

[2] "Aligarh Muslim University || Public Relations Officer". *Amu.ac.in*. Retrieved 18 February 2016.

[3] "Aligarh Muslim University || Public Relations Officer". *Amu.ac.in*. Retrieved 18 February 2016.

to the forefathers of this movement, Sir Syed Ahmad Khan, MohsinulMulk, and ViqarulMulk, who recognised the vision of a shared and undivided centre of Muslim culture and dedicated their lives to making it a reality. Their joy would have been immense if their efforts had been rewarded with success. The University will raise the genius of men like Averroes and Avicenna (Ibn Sina), Sheikh Saadi, Al-Ghazali, Ibne Musa, Abu Maashar-i-Falaki, Shah Waliullah, Shah Abdul Azeez, Haali, and Shibli, who will rekindle the spark of Islamic civilization and usher in a brighter and more glorious era in the annals of Islam with Begum Sultan Jahan also spoke during the 1925 annual convocation. She continued to promote Aligarh Muslim University and served as its Chancellor till her death. After her death on May 12, 1930, her son, Nawab Hafiz Hamidullah Khan, the ruler of Bhopal and an M.A.O. College alumnus, was named Chancellor of Aligarh Muslim University.

(Nawab Sultan Jahan Begum)

(Courtesy Sir Syed Academy AMU Aligarh)

(Nawab Hamidullah Khan)

(Present Structure of Sultan Jahan Manzil)

SUNITA KUMARI

Ph.D. Scholar, Department of Persian

University of Delhi.

RESEMBLENCE OF ANECDOTS AND ADMONITIONS IN PANCHATANTRA AND MATHNAVI MANAVI OF MAULANA JALAL UD DIN RUMI

Abstract:

Panchatantra has the first place in proverbs. Based on the various available translations, its composition is determined to be around the 3rd century. Introducing the principles of psychology, practicality and governance, these stories present all the subjects in a very interesting way and at the same time try to give a lesson. In many stories of Panchatantra, apart from human characters, sometimes animals and birds have also been made the characters of the story and many instructive things have been tried to be told from them. The stories of Panchatantra are very lively. In this, public behavior has been explained in a very simple way. Many people consider this book to be a powerful medium to develop leadership abilities. The importance of this book is proved by the fact that it has been translated into almost every language of the world. It is India's most frequently translated literary work.

The first edition is the Pahlavi translation of the original text, which is now available in the form of Syrian and Arabic translations. Among these translations, the translation of the name 'Karatkadamanak' of Pahlavi language is considered to be the oldest translation. According to Winternitz more influence of Panchatantra is seen on German literature. Similarly, the basis of the stories of Aesop in Greek and 'Arabian Nights' of Arabia etc. are based on the Panchatantra. It is believed that the Panchatantra has been translated into about 50 different languages so far and there have been about 200 editions of it. This is an indication of its popularity.

The influence of Panchatantra has also been seen in Maulana Rumi's Masnavi Maanvi. He has copied some stories from Panchatantra, out of which I am mentioning some stories here. For example “The Story of Mongoose and Snake”, “An Elephant and six Blindmen” and as “Naqal me Aqal". These stories are copied exactly, only the titles of the stories are different.

Key Words: Panchtantra, Mathnavi Manavi,

Introduction:

The Panchtantra (Sanskrit: पञ्चतन्त्र "Five Treaties" is an ancient Indian collection of interrelated animal fables in Sanskrit verse and prose arrange within a frame story. The surviving work is dated to roughly 2000 BCE, based on older oral tradition. The text author has been attributed to Vishnu Sharma in some recensions and Vasubhaga in others. It is one of the ancient Indian classical literatures and certainly the most frequently translated literary product of India and the stories are more widely known of ancient world literature.

Panchtantra has been translated nearly every known languages of the world. The earliest known translation into a non-Indian language is in Middle Persian (Pahlavi 550 CE) Burzoe. After that translated in Syriac as "Kalilag and Damnag" and in 750 CE by Abdullah Ibn al Muqaffa as "Kalilah wa Dimnah".

Rudaki has translated it in poetic form in 12th century century as Kalileh o Demneh and this was the basis of Kashifi's 15th century Anwar-i-Shayli (the lights of Canopus).

Similarly Panchtantra was translated in various European languages like Fables of Bidpai or the morall philosophie of Doni in English, Tantri Kamandaka in Indonesian, Nandaka Prakarana in Combodian language and Nang Tantrai in Thai language.

Likewise, "Mathnavi M'anavi" of Maulana Rumi is one of the most influential works of Sufism, commonly called as "the Quran of Persian". Mathnavi is a poetic collection of anecdotes and stories derived from the Quran, Hadith sources and everyday tales. Stories are told to illustrate a point and each morals is discussed in details.

Now going by the resemblance and similarities between Panchatantra and Mathnavi, we find lots of convergences not only of the central idea for the creation of these two masterpieces written against two different socio-cultural and tradition.

Although, there are various aspects of this coherence and confluence but going strictly by the topic of the article similarities of the anecdotes I would like to mention a few of them below

1. There is a famous story in Panchatantra "The Story of Mongoose and Snake" and a prabale with similar moral lesson tilted "Hikayat-e -Mard - e-Bazargaan wa Tutee wa Roghan Rikhtan- e -Tooti dar Dukan (حکات مرد بازارگان وطوطی و روغن ریبختن طوطی در دکان) or "The Story of a Perfumer and a Parrot" in Mathanav M'anavi Maulana Rum. This anecdote of story of Perfumer and Parrot is formed in the first volume of Mathnavi in which a perfumer hits his beautiful and soft and sweet spoken parrot who was really helpful to him and entertaining for his customers. Having seen bellor of perfumes spilled on the floor of the shop, shopkeeper presumes that

parrot had purposely wasted his expensive perfumes (roghan-e-gul). He hits the parrot with a stick and consequently the bird lost her beautiful voice out of trauma and becomes bald.

In the same manner in the "Story of a Mongoose and Snake " in Panchatantra a woman hits her pet mongoose after seeing the mouth of mongoose blood stained and presuming that the mongoose must her killed her child which was alone in the house with that pet mongoose when she was out to fetch water. After realizing that the mongoose had really saved the life of her son by killing a poisonous black snake, she laments the loss of a very faithful friend.

Although, the title and character of these two anecdotes are different but morals of the stories are same. We should not act on our impulses before going into the truth of the matter.

2. The another similar sort of anecdotes we find in these two books are one is the story of "An Elephant and six Blindmen in Panchatantra " and a parable of "An Elephant in a Dark Room"(فیل در اتاقی تاریکی) in Mathnavi M'anavi of Maulana Jalaluddin Rumi.

   As we know also through oral traditions that this is a parable of high mystic discourses which has its origin in Indian -Subcontinent and has also got a place in Buddhist and Jain literature other than Hindu literature.

   According to the story of Panchatantra a group of blindmen were supposed to figure out the shape of an elephant which they had not seen before, they wanted to learn and conceptualize what the elephant looks like by touching. In the same manner the parable in Mathanavi also but with a slight difference of background, the group of men were supposed to figure out the shape of an elephant in a dark room only by touching it. In both the stories the group of probing men end up touching the different parts of the body of the elephant and eventually given the varying description of the shape of the elephant. Author of the epics end up somewhere similar conclusion about the whole event. They conclude that elephant is a metaphor for God and the group of blindmen and group of men making shape of elephant in dark room, represent religion that disagree on something no one has fully experienced.

   Rumi ends his poem stating if each had a candle and they went in together the difference would disappear.

3. The third anecdote which we ends with almost similar conclusion and moral teachings in these to epics. In Panchatantra there is a story titled as “Naqal me Aqal" or “Imitation without Information.”

   The anecdote in Mathanavi with similar moral lesson is titled as "The Story of Mystic And his Ass” (داستان صوفی و خرش) in volume second of the Mathnavi M'anavi of Maulana Rum.

The anecdote of Panchatantra is about a rich but very noble man who falls into poverty and is scared of committing misdeed under the compulsions of searching for livelihood. One night he goes to bed with the same worries and anxiety. A supernatural power comes into his dream gives him instructions to abolish poverty. He follows the divine instructions and becomes rich again. A barber gets to know his somehow the story noble man's fortune. He follows the same steps as that of the noble man but ends up killing innocent saints.

A somewhat similar anecdote as mentioned above we come across in "Mathnsvi M'anavi" as well. In this anecdote a mystic unknowingly gets indulge into the celebration with the caretaker of his ass. The caretaker for the purpose of getting rid of the painful service of looking after the ass, sold it out without the Mystic's knowledge and throws a party with the money he receives from the sale of ass. When the mystic gets to know about the loss of his ass and related celebration he laments badly at his loss. The Sufi was not even in the position of reprimanding the caretaker because he followed the celebration to rejoice the loss the ass.

Moral of the stories are same in both of these anecdotes i.e. we should not act without knowing the purpose of that action.

Conclusion:

Having done an enquiry about the similarities between the anecdotes of "Panchatantra" and "Mathnavi M anavi" we reach to the conclusion that Rumi has drawn a lot from Indian literary tradition and culture of Indian subcontinent. As we know that Panchatantra was written much before the creation of "Mathnavi M'anavi" and we also know that ancient Iran and India had close relations in the field of trade and commingling of literary and cultural traditions from the time of Indus Valley Civilization which is dated back to 5000 BC.

Therefore, there is no surprise about the fact that Panchatantra had profound influence over Mathnavi Manavi of Maulana Jalaluddin Rumi.

Reference books:

1: Masnavi Rumi, the great book of Mawlana Jalaluddin Rumi, includes original Persian with Urdu translation by Qazi Sajjad Hussain, 2011.

2: Panchatantra: Indian Literature, Encyclopaedia Britannica

3: Wood, Ramsay (2008), Kalila and Dimna, Fables of Friendship and Betrayal (Vol. 1: Books 1 & 2), Introduction by Doris Lessing, Postscript by Dr Christine van Ruymbeke, London: Saqi Books

4: Kalilah and Dimnah; or, The fables of Bidpai; being an account of their literary history By Bdp'; Keith-Falconer, Ion Grant Neville, 1856-1887.

5: Hitopadesa: Fables and Proverbs, by Narayan Pandit.

6: Panchatantra,

7: Kathasaritsagara